دہلی کے ممتاز صحافی

(آزادی کے بعد)

سہیل انجم

اردو اکادمی دہلی

دہلی کے ممتاز صحافی

(آزادی کے بعد)

سہیل انجم

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۹۳

Delhi Ke Mumtaz Sahafi

(Azadi ke Baad)

By

Suhail Anjum

Published by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2015

Rs.150/-

ضابطہ

سنِ اشاعت

۲۰۱۴ء

ایک سو پچاس روپے

شوبی آفسیٹ، ۲۸۱۸، گلی گڑھیا، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-197-8

فہرست

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم وفن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیر اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی

سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''دہلی کے ممتاز صحافی'' کی اشاعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے وہ باکمال صحافی جنھوں نے اپنی فکر و دانش سے ملک کے نظام کی سمت و رفتار متعین کی اور ایسے زمانے میں اس فن سے وابستہ رہے جب کہ یہ صرف گھاٹے کا سودا تھا لیکن ان سرکردہ صحافیوں نے اپنے اصولوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔

اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کی ایما پر اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے اس پروجیکٹ کو منظور کیا تھا اور موجودہ وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے اس پروجیکٹ کو اہمیت کے پیشِ نظر کتاب کی اشاعت کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا۔ دراصل اکادمی کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اکابرین کی سوانح اور کارناموں کو منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ ان کے حالاتِ زندگی سے ہماری نوجوان نسل واقف ہوسکے نیز ان کے اصول و ضوابط، ان کی میانہ روی سے سبق حاصل کرسکے۔ ہم جناب سہیل انجم کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اس مشکل ترین کام کو بے حد محنت و جانفشانی سے مکمل کیا اور اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔

ہم اردو اکادمی دہلی چیئرمین کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

انیس اعظمی

سکریٹری

مقدمہ

ہندوستان میں گزشتہ کچھ برسوں میں صحافت کے شعبے میں زبردست انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب الیکٹرانک میڈیا یا برقی صحافت اور پرنٹ میڈیا یا مطبوعہ صحافت دونوں شعبوں میں آیا ہے۔ جب ملک میں الیکٹرانک میڈیا کا آغاز ہوا تو یہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اب پرنٹ میڈیا کا دور ختم ہو جائے گا۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت نے اس اندیشے کو غلط ثابت کر دیا۔ آج الیکٹرانک میڈیا جتنا طاقتور ہے پرنٹ میڈیا اس سے کم طاقتور نہیں ہے۔ انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافت بھی، برقی اور مطبوعہ، مائل بہ فروغ ہے۔ آر این آئی کی تازہ ترین رپورٹ بھی مطبوعہ صحافت کے شعبے میں ترقی کا ثبوت ہے۔ انٹرنیٹ کے انقلاب نے اس کے بازوؤں میں بھی قوت پرواز بھر دی ہے۔ اردو صحافت بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مکمل طور پر استفادہ کر رہی ہے۔ یہ صورت حال اردو کے مستقبل کے لیے خوش آئند ہے۔

ہندوستان میں صحافت کی جائے پیدائش کلکتہ ہے۔ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں کی صحافت کا جنم اسی شہر میں ہوا۔ رفتہ رفتہ دوسرے شہروں میں دوسری زبانوں کی مانند اردو صحافت بھی شروع ہوئی اور اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔ راجدھانی دہلی ہمیشہ اردو کا ایک مرکز رہی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی صحافت کا آغاز ہوا اور وہ بتدریج ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلا اردو پریس کلکتہ میں 1810 میں قائم ہوا تھا۔ پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' کو مانا جاتا ہے جو فارسی اخبار کا ضمیمہ تھا اور جو 1822 میں شروع ہوا۔ متعدد صحافتی کتب کے مصنف عتیق صدیقی نے مختلف حوالوں سے لکھا ہے کہ اردو اخبار نویسی کی ابتدا 1837 سے ہوتی ہے۔ اسی سال دو اخباروں کا اجرا ہوا۔ ایک بنارس سے ''خیر خواہ ہند'' اور دوسرا دہلی سے ''سید الاخبار''۔ قاضی عبدالغفار بھی خیر خواہ

ہند کو اردو کا پہلا اخبار مانتے ہیں۔ سید الاخبار کا ذکر کرتے ہوئے مارگریٹا بارنس نے لکھا ہے کہ سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے سید الاخبار جاری کیا تھا مگر جوانی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اخبار کی ادارت سید احمد خاں نے سنبھالی لیکن ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے یہ اخبار بند ہو گیا۔

صاحب طرز ادیب مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے 1838 میں ''اردو اخبار'' جاری کیا۔ یہ ایک ادبی پرچہ تھا جس میں غزلیں چھپتیں اور ادبی مباحثے ہوتے۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ'' دہلی اخبار سے مراد شاید'' اردو دہلی اخبار'' ہے لیکن اس کا اجرا 1838 میں نہیں بلکہ قاضی عبدالغفار کے بیان کے مطابق 1851 میں ہوا۔ گارساں دتاسی نے بھی 1852 میں اس اخبار کا ذکر کیا ہے۔ اس نے'' قران السعدین'' اور'' فوائد الناظرین'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کو علی الترتیب پنڈت دھرم نرائن اور ماسٹر رام چندر نے جاری کیا تھا۔ دہلی میں اردو کا پہلا مطبع غالباً 1845 میں قائم ہوا۔ اس کے مالک مولوی عنایت حسین تھے اور اس کا نام دار السلام تھا۔ 1851 میں دہلی سے'' دہلی اردو اخبار'' کا اجرا ہوا۔ جبکہ 1852 میں'' وحید الاخبار'' جاری ہوا۔ بعد کو سراج الاخبار، مظہر الحق اور رفیق الاخبار بھی جاری ہوئے۔ 1853 میں دہلی سے متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ جن میں صادق الاخبار (فارسی)، نور مغربی اور نور مشرقی (اردو) قابل ذکر ہیں۔

عتیق صدیقی'' 1857 کے اخبار اور دستاویزیں'' میں لکھتے ہیں:'' ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ کا یہ افسوسناک باب ہے کہ 1857 کے کسی فارسی یا اردو اخبار کی مکمل فائل شاید کہیں بھی محفوظ نہیں ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو اب تک کسی کو اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے...... نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں دہلی کے تین اخبارات سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار اور صادق الاخبار کے جستہ جستہ 1857 کے شمارے منتشر حالت میں محفوظ ہیں۔ سراج الاخبار بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ تھا جو فارسی میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ اس کا ترجمہ صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار میں بھی پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا''۔ صادق الاخبار تند و تیز اور انگریز دشمن اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید جمیل الدین تھے۔ دہلی اردو اخبار مولوی باقر کا تھا۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت تک اس کا انداز'' امن پسندانہ'' تھا۔ بغاوت شروع ہونے کے بعد اس کا رنگ بدل گیا اور اس کے مزاج میں اچانک انقلاب آ گیا۔ یہاں تک کہ مولوی باقر کو شہید کر دیا گیا۔ انھیں اردو کا پہلا شہید صحافت کہا جاتا

ہے۔

دہلی سے 1866 میں "اکمل الاخبار" نامی ایک اخبار کا اجرا ہوا۔ اس کے مالک اور روح رواں حکیم محمود احمد خاں تھے جنھوں نے طبی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک مطبع بھی اکمل المطابع کے نام سے قائم کیا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا ایک مستند اور وقیع اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اسے دہلی کے سر برآوردہ افراد اور طبقے کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ اس اخبار سے مرزا غالب کو بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنے کئی خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ اخبار بلی ماران دہلی سے شائع ہوتا تھا۔

1947 سے کچھ پہلے اور اس کے بعد دہلی سے بے شمار اخبارات کا اجرا ہوا جن میں دہلی گزٹ، ہمدرد، ریاست، وطن، تیج، ملاپ، پرتاپ، الجمعیۃ، دعوت، وحدت، الایمان، مسلمان، سوراجیہ اور انصاری قابل ذکر ہیں۔ ہفت روزہ اخباروں میں تیغ، آئینہ، دین دنیا اور نئی دنیا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ماہناموں میں عصمت بنات، جوہر نسواں، ساقی، شاہ جہاں، اقدام، شمع، نگار خانہ، فلم لائٹ، آریہ ورت، ادیب، کہکشاں، شمع، پاکیزہ، بیسویں صدی، روبی، برہان، مولوی، دین دنیا، آستانہ، منادی، پیشوا، نظام المشائخ، ساقی، اقدام، جمالستان، نیا دور، دور جدید، منشور، الہام، حیدر، قومی گزٹ، بانو، خاتون مشرق، پیام تعلیم، کھلونا، تحریک، عصری ادب، اردوئے معلیٰ، تحریر، اردو ادب، غالب نامہ، شان ہند، شبستاں، صبح، شعور، سطور، سیکولر ڈیموکریسی، رہنمائے تعلیم آف لاہور وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سہ روزہ اخباروں میں آزاد اور دعوت قابل ذکر ہیں۔

بعد کے ادوار میں ہفت روزہ عوام، بنیاد، ہفت روزہ نئی دنیا، اخبار نو، بادبان، اپنا ہفت روزہ، ہمارا اقدم اور پھر راشٹریہ سہارا، انقلاب، صحافت، اخبار مشرق، ہندوستان ایکسپریس، خبردار جدید اور ہمارا سماج اور سائنس، سائنس کی دنیا، اسلام اور عصر جدید، جامعہ، ہما، ہدیٰ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

الجمعیۃ، پرتاپ، ملاپ، قومی آواز اور تیج سے نامی گرامی صحافی وابستہ رہے ہیں۔ الجمعیۃ سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا محمد عثمان فارقلیط کی بھی وابستگی رہی۔ مولانا فارقلیط نے 1947 سے 1973 تک روزنامہ الجمعیۃ کی ادارت سنبھالی تھی۔ یہ اخبار پورے ملک میں پڑھا جاتا تھا اور اپنے دور کا مقبول عام اخبار تھا۔ یہ ہفت روزہ کی شکل میں آج بھی نکل رہا ہے اور اس کے

ایڈیٹر مولانا سالم جامعی ہیں۔

اپریل 1940 میں مولانا امداد صابری نے ''اتحاد'' نامی ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک اور ہفت روزہ ''تیغ'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اپریل 1956 میں جمنا داس اختر نے ہفت روزہ ''سویرا'' جاری کیا جو بعد کو روزنامہ ہوگیا۔ اس کا سنڈے ایڈیشن باتصویر ہوتا تھا۔ یہ اخبار 1989 تک شائع ہوتا رہا۔ نظام المشائخ، رعیت، منادی اور صوفی بھی مقبول رسالے تھے جو خواجہ حسن نظامی نکالتے تھے۔

1924 میں ایک اخبار ''ریاست'' جاری ہوا تھا جو دیوان سنگھ مفتوں نے نکالا تھا۔ وہ بڑا مقبول پرچہ تھا۔ اس میں برطانوی حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، ان کے مظالم، سازشیں، رشوت، حکومت کی چیرہ دستیاں، جیلوں کی زندگی، اخلاقی پستی اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات شائع ہوتے تھے۔

1923 میں روزنامہ ''تیج'' کا اجرا ہوا جس کے مالک سوامی شردھانند اور ایڈیٹر دیش بندھو گپتا تھے۔ یہ اخبار آج بھی نکل رہا ہے اور اس کے ایڈیٹر پی پی مسیح ہیں۔ روزنامہ ''ملاپ'' 1923 میں مہاشہ خوشحال چند خورسند نے لاہور سے شروع کیا تھا جو تقسیم کے بعد دہلی آ گیا اور بعد کو شری رنبیر اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ یہ بھی تا حال نکل رہا ہے۔ اسی کی مانند روزنامہ ''پرتاپ'' بھی لاہور سے نکلتا تھا جسے مہاشہ کرشن نے جاری کیا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ اخبار بھی دہلی آ گیا اور ان کے بیٹے کے نریندر ایک طویل عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ 1951 میں روزنامہ ''نئی دنیا'' مولانا عبدالوحید صدیقی نے شروع کیا تھا جس سے متعدد نامی گرامی صحافی وابستہ رہے ہیں۔ اب یہ اخبار ہفت روزہ کی شکل میں نکل رہا ہے اور اس کے مالک اور ایڈیٹر شاہد صدیقی ہیں۔ 1953 میں مولانا عبدالباقی نے ''پیام مشرق'' جاری کیا تھا۔

روزنامہ ''دعوت'' کا ذکر بھی ضروری ہے جو اب ہفت روزہ کی شکل میں نکل رہا ہے۔ اس اخبار سے محمد مسلم، پروانہ ردولوی اور محفوظ الرحمٰن سمیت کئی بڑے صحافی وابستہ رہے ہیں۔ روزنامہ ''قومی آواز'' 1980 میں دہلی سے شروع ہوا۔ اس سے قبل وہ لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔ اس اخبار نے متعدد اچھے صحافی اردو صحافت کو دیے۔ دہلی ایڈیشن کے پہلے ایڈیٹر عشرت علی صدیقی اور دوسرے اور آخری موہن چراغی تھے۔ ان کے علاوہ روزنامہ ''فیصل جدید''، روزنامہ ''مشرقی آواز''، روزنامہ ''انتباہ'' سمیت متعدد اخبارات و رسائل دہلی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

اس وقت دہلی سے سو سے زائد روز نامہ اخبارات شائع ہو رہے ہیں جن میں کم از کم 60 روز نامہ اخبارات اشتہارات کے سرکاری ادارے ڈی اے وی پی سے منظور شدہ ہیں۔ جن میں راشٹریہ سہارا، انقلاب، صحافت، ہمارا سماج، ہندوستان ایکسپریس، اخبار مشرق، ملاپ، پرتاپ، تیج اور جدید خبر قابل ذکر ہیں۔ ڈی اے وی پی سے منظور شدہ ہفت روزہ جرائد کی تعداد پندرہ ہے۔ جن میں نئی دنیا، اخبار نو، عالمی سہارا، چوتھی دنیا، الجمعیۃ اور صدائے انصاری قابل ذکر ہیں۔ پندرہ روزہ جرائد کی تعداد چھ ہے جن میں خبر دار جدید اور کاروان دہلی ایک عرصے سے نکل رہے ہیں۔ ماہنامہ جریدوں کی تعداد پانچ ہے جن میں افکار ملی اور عالمی وجود قابل ذکر ہیں۔ ایک سہ روزہ اخبار 'دعوت' بھی ہے۔ یہ تمام وہ ہیں جن کو ڈی اے وی پی سے منظوری حاصل ہے۔ غیر منظور شدہ جرائد کی تعداد کافی ہے۔ جن میں ماہنامہ ملی اتحاد، ماہنامہ کتاب نما، ماہنامہ بک ریویو، رہنمائے تعلیم اور سہ ماہی نئی کتاب کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ادبی صحافت کو بھی نمائندگی دی گئی ہے جس کے تحت بیسویں صدی کے ایڈیٹر خوشتر گرامی اور تحریک کے ایڈیٹر گوپال متل پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ فلمی و ادبی صحافت کے ذکر میں رحمٰن نیر اور حاجی انیس دہلوی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رحمٰن نیر کا نام ضیاء الرحمٰن تھا۔ وہ جولائی 1939 میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور نومبر 2009 میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی پوری زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ادارہ شمع سے کیا تھا۔ بعد کو انھوں نے 1966 میں ''روبی'' کے نام سے ایک فلمی رسالہ جاری کیا۔ حالانکہ اس رسالے سے رحمٰن نیر کو زبردست مالی خسارہ ہوا اس کے باوجود انھوں نے برسوں تک اسے نکالا۔ اس میں ادبی مضامین بھی شائع ہوتے۔ اس وقت کے تقریباً تمام مشہور ادبا کی نگارشات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ بالآخر 1970 میں روبی مقبول رسالوں کی فہرست میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے 1970 میں ''پاکیزہ'' نام کا ایک رسالہ شروع کیا۔ جس میں علمی و سیاسی شخصیات کے انٹرویوز بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ہفت روزہ ''عوام'' شروع کیا جس کے ایڈیٹر سلامت علی مہدی تھے۔ اسی درمیان انھوں نے 1975 میں خوشتر گرامی سے ماہنامہ ''بیسویں صدی'' خرید لیا۔ ان کی مصروفیت میں اضافہ ہوا اور انھیں عوام بند کر دینا پڑا۔ بعد کو انھوں نے اس کا ٹائٹل انور دہلوی کو دے دیا۔ انور دہلوی نے اسے شاہد صدیقی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ انھوں نے کم و بیش بارہ جاسوسی ڈائجسٹ

بھی شائع کیے تھے۔ رحمٰن نیر ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اواخر عمر میں وہ مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے زندگی کی تعیشات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تبلیغی جماعت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کا آخری وقت نماز روزے اور عبادت و ریاضت میں گزرا۔

حاجی انیس دہلوی کا نام دہلی کی فلمی صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں کی خاک لپیٹ کر سو گئے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سماجی کارکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان کو ''فلمی ستارے'' سے ملک و بیرون ملک شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے ''رہبر کارز'' نام سے ایک مرکز بھی بنایا تھا جہاں سے عوامی خدمات انجام دی جاتی تھیں۔ انھوں نے فلمی ستارے کے علاوہ ''باجی'' نامی رسالہ بھی جاری کیا۔ انھوں نے کئی ملکوں کے دورے کیے۔ فلمی ستارے کی سرکولیشن خاصی تھی۔ پاکستان میں بھی اس کے قاری بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان کا تعلق اپنے وقت کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے ہوا۔ وہ ان کی نگارشات کو اپنے رسالے میں شائع بھی کرتے تھے۔ ''فلمی ستارے'' فلمی پرچہ تھا تو ''باجی'' خواتین کا پرچہ تھا۔ اس کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی فلمی ستارے کو ہوئی۔

دہلی سے مذہبی رسائل بھی شائع ہوتے ہیں ان کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔ ان میں زندگی نو، جریدہ ترجمان، ترجمان جدید، نوائے اسلام، جام نور، ماہ نور، ترجمان دار العلوم، اللہ کی پکار، رفیق منزل، کنز الایمان، ہدیٰ، ذکریٰ اور التبیان قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری و پرائیویٹ سطح پر ادبی رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ سرکاری ادبی رسالوں میں آجکل، اردو دنیا، ایوان اردو، امنگ، ہماری زبان، اردو ادب، فکر و تحقیق اور غیر ادبی سرکاری جرائد میں یوجنا، سینک سماچار اور سائنس کی دنیا قابل ذکر ہیں۔ غیر سرکاری ادبی رسائل میں ذہن جدید، ادب ساز، جہان غالب اور عالمی اردو ادب کو رکھا جا سکتا ہے۔ طب و صحت، سائنس اور آرائش و زیبائش سے متعلق رسائل بھی یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔

صحافیوں میں جالب دہلوی، ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی، حافظ سید عزیز الحسن بقائی، رازق الخیری، شاہد احمد دہلوی، وصی اشرف، نجم دیوبندی، حافظ محمد یوسف دہلوی، عشرت علی، ناظر علی، فصیح الدین، سید کاظم علی، ابوالبیان آزاد، شوکت علی فہمی، دیوان سنگھ مفتوں، مولانا محمد عثمان فارقلیط، لالہ دیش بندھو گپتا، مہاشہ کرشن، کے نریندر، جمنا داس اختر، مظہر الدین، ہلال احمد زبیری، ناز انصاری، میر خلیل الرحمٰن، ناصر جلالی، بدر جلالی، رئیس امروہوی، نقی امروہوی، عبداللہ شمیم، مستحسن

فاروقی، توفیق فاروقی، خوشتر گرامی، گوپال متل، عشرت علی صدیقی، سرور تونسوی، رحمٰن نیر، انور دہلوی، مہدی نظمی، مولانا وحید الدین خاں، بہار برنی، اختر صدیقی، وجاہت افروز، ماسٹر جگت سنگھ، سردار ہربجن سنگھ تھاپر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواتین کے دو پرچوں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہیں خاتون مشرق اور بانو۔ یہ دونوں پرانے رسالے ہیں۔ خاتون مشرق اب بھی نکل رہا ہے۔ ان دونوں میں خواتین کے ذوق کو سامنے رکھ کر مضامین اور دوسری چیزیں شائع کی جاتی ہیں۔ خاتون مشرق روایتی انداز کا رسالہ ہے البتہ بانو میں نیا پن تھا۔ پاکیزہ آنچل کا بھی ذکر کیا جانا چاہیے جو خواتین میں بے حد مقبول ہے۔

دہلی میں مذہبی صحافت کے علمبرداروں میں کم از کم دو تین کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا سید تقریظ احمد سہوانی یوپی کے قصبہ سہوان ضلع بدایوں میں 1902 میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ستمبر 1971 میں سہوان بدایوں میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سہوان میں ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تعلیم مرادآباد میں حاصل کی۔ وہاں انھوں نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مرادآباد سے دہلی آکر مولانا محمد جوناگڑھی کے مدرسہ محمدیہ اجمیری گیٹ میں داخلہ لیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مدرسوں سے بھی انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج سے کامل الطب و جراحت کی ڈگری لی۔ مولانا محمد جوناگڑھی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اس لیے انھوں نے مکتبہ محمدی اور اخبار محمدی کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ مارچ 1941 میں اچانک مولانا محمد جوناگڑھی کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق "اخبار محمدی" کی ادارت اور مکتبہ محمدی کی ذمہ داری ان کے سر آگئی۔ اخبار محمدی ایک مذہبی رسالہ تھا جس میں مولانا محمد جوناگڑھی کے مضامین کے اقتباسات زیادہ شائع ہوتے تھے۔ 1947 کے پرآشوب دور میں یہ اخبار بند ہوگیا تاہم مکتبہ قائم رہا۔ 1950 میں حافظ حمید اللہ نے سید تقریظ احمد سہوانی کو مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ہفت روزہ اخبار "اہلحدیث" کو زندہ کرنے کا مشورہ دیا اور ان کی فراخ دلی اور کشادہ دستی کے طفیل اخبار اہلحدیث دوبارہ جاری ہوگیا۔ اس کے لیے حافظ حمید اللہ نے خاصی رقم مخصوص کردی تھی۔ اخبار کا دفتر مولانا محمد جوناگڑھی کی کوٹھی میں قائم ہوا جو کہ پہلے اخبار محمدی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہ اخبار اہلحدیث کے تاحیات ایڈیٹر رہے۔ نامساعد حالات کے باوجود یہ اخبار دہلی سے کافی دنوں تک نکلتا رہا۔ اس کے معاون مدیر حکیم عبدالشکور شکراوی تھے۔

حکیم مولانا عبدالشکور شکراوی 1880 میں فیروز پور نمک میوات، ہریانہ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 18 اپریل 1961 کو شکراوہ میوات میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسہ مسجد بنگلہ والی نظام الدین (موجودہ مرکز تبلیغی جماعت) میں تعلیم پائی۔ ان کی فراغت مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری دہلی سے ہوئی۔ انھوں نے طب کی تعلیم خاندان عزیزی کے مشہور طبیب حکیم عبدالرحمٰن خاں لکھنؤ سے حاصل کی۔ دہلی میں قیام کے دوران مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تقریر اور ان کے مناظروں نے ان پر خاصا اثر ڈالا۔ وہ 1857 کے مجاہدین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا وزیر خاں کو نوح میں انگریزوں نے پھانسی دی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی جائیداد بحق سرکار انگلشیہ ضبط کر لی گئی تھی۔ انھوں نے 1951 میں دہلی سے "اخبار اہلحدیث" جاری کروایا جس کے وہ تاحیات مدیر معاون رہے۔ بعد کو دو تین سال تک ان کے بیٹے حکیم اجمل اس کے مدیر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے "مجلّہ اہلحدیث" کے نام سے 1978 میں ایک ماہنامہ شروع کیا جو تادم تحریر میوات، ہریانہ سے نکل رہا ہے۔ یہ ماہنامہ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی کی یادگار کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔

جے پی بھٹناگر ماہنامہ رسالہ "مستانہ جوگی" کے ایڈیٹر تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے اخباروں میں بھی کام کیا تھا جن میں مسلمان اور سندیش قابل ذکر ہیں۔ وہ ٹی وی شو بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ ان کے دو شوز "نگر نا گرک" اور "یہ دل ہے" کافی مقبول ہوئے۔ انھیں 1991 میں صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ان کا انتقال 18 جنوری 2009 کو ہوا۔ جے پی بھٹناگر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز لاہور سے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دہلی آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ رسالہ مستانہ جوگی بھی دہلی منتقل ہو گیا۔ مستانہ جوگی ان کے والد صوفی لچھمن پرشاد نے 1905 میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ ایک مفید اور معلوماتی رسالہ تھا۔ ان کے والد نے ان کو اردو اور فارسی کی تعلیم دلوائی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ آگے چل کر ان کے رسالہ کو زندہ رکھ سکیں۔ مستانہ جوگی میں صحت و تندرستی، روحانیت، صنعت و حرفت، تاریخ، معلومات، دیسی ادویات وغیرہ سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں ادبی مضامین کی بھی اشاعت ہوتی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں قرآن شریف، گیتا، بائبل، گروگرنتھ صاحب سے اخذ کردہ مواد کا اردو میں ترجمہ شائع کیا جاتا تھا۔ اس میں تمام مذاہب کے قارئین کا خیال رکھا جاتا اور ان کے ذوق اور پسند کی چیزیں شائع کی جاتیں۔ یہ رسالہ منافع کے لیے جاری نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا

مقصد قارئین کی خدمت کرنا اور ان کے فائدے کی چیزیں شائع کرنا تھا۔ اخلاق کی تعمیر بھی اس کا ایک نصب العین تھا۔ اسی لیے اس میں مخرب اخلاق اور غیر شائستہ مضامین شائع نہیں ہوتے تھے۔ یہ رسالہ تین پشتوں تک پڑھا جاتا رہا۔ جے پی بھٹناگر اردو کے سچے عاشق تھے۔ وہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے زوال پر بہت رنجیدہ تھے۔ اردو اخبارات کی تعداد میں کمی سے بہت متفکر تھے۔ انھیں اس بات سے بہت دکھ پہنچتا تھا کہ معیاری رسائل نہیں چلتے بلکہ ٹونے ٹوٹکے اور عریاں تصاویر والے اخبارات بک رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اردو کے زوال پر اظہار افسوس کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اردو کشی کا دور ہے۔ اس دور میں اردو کو مٹایا جارہا ہے۔ صرف اردو مخالفین ہی نہیں بلکہ اردو والے بھی اسے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ میرے والد کی خواہش کے باوجود میرے دونوں بیٹے اردو سے نابلد ہیں۔ ان کو یہ فکر ستاتی رہی کہ ان کے انتقال کے بعد ان کا محبوب رسالہ جو کہ ان کے والد نے شروع کیا تھا موت کی گود میں سوجائے گا۔ انھیں اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی جگہ پر ہندی کو ترجیح دینے کا بہت ملال تھا۔ وہ اس پر بھی اظہار افسوس کرتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے بچے بھی اردو پر ہندی کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ متعصب لوگوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان کا فتویٰ دے کر اس کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں، یہ سب کی زبان رہی ہے۔ آج اردو کو فروغ دینے والوں کے ہاتھ باندھ دیے گئے ہیں۔ آج لوگ صرف شہرت طلبی میں اردو سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اردو کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ اردو رسائل و جرائد کو تجارت کا ذریعہ بنانے کی پالیسی سے انھیں اختلاف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ منافع کی خاطر اخبارات و رسائل نکالتے ہیں وہ اردو کے سچے خادم نہیں ہیں۔ ایسے لوگ منافع کی خاطر رسالے کی پالیسی بدل دیتے ہیں اس کی کسی بھی طرح حمایت نہیں کی جاسکتی۔

اوپر جن صحافیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے متعدد بڑے صحافیوں پر مضامین قلمبند کر کے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی غیر مستند بات کسی مضمون میں نہ آنے پائے۔ اس لیے جہاں بہت سے پرانے صحافیوں اور ادیبوں سے گفتگو کی گئی ہے وہیں صحافت سے متعلق مستند اور اہم کتابوں سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر حقائق سے پرے یا خلاف واقعہ کوئی بات اس کتاب میں آگئی ہو تو اسے خاکسار کی لاعلمی پر محمول کیا جائے۔

آزادی کے بعد دہلی میں سرگرم صحافیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔اس میں جن 32 صحافیوں پر مضامین لکھے گئے ہیں وہ سب مرحوم ہو چکے ہیں۔ موجودہ صحافیوں اور اخباروں کا بھی کچھ ذکر ہونا چاہیے تا کہ کتاب کی جامعیت پر حرف نہ آئے۔صحافت کا صحیح اندازہ روزنامہ اخباروں سے ہوسکتا ہے اس لیے ان کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ دہلی کا کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار ''انقلاب'' ہے۔اس کا آغاز عبدالحمید انصاری نے ممبئی سے 1938 میں کیا تھا۔بعد میں ہندی روزنامہ دینک جاگرن نے اسے خرید لیااور 2011 میں دہلی سے اسے جاری کیا گیا۔اس وقت یہ دہلی کا (دیکھا جائے تو پورے ملک کا) سب سے بڑا اخبار ہے۔ سردست چودہ مقامات دہلی، ممبئی، لکھنؤ، وارانسی، علی گڑھ، بریلی، میرٹھ، آگرہ، گورکھپور، پٹنہ، مظفر پور، بھاگلپور، کانپوراورالہ آباد سے اس کے ایڈیشن شائع ہورہے ہیں۔اس وقت دوسرے مقام پر روزنامہ راشٹریہ سہارا ہے۔یہ دس مقامات دہلی، ممبئی، کولکاتہ، حیدرآباد، لکھنؤ، بنگلور، پٹنہ، رانچی، گورکھپوراور کانپور سے شائع ہورہا ہے۔دہلی سے اس کا اجرا اکتوبر 1991 میں ماہنامہ کی شکل میں ہوا تھا۔اس کے بعد یہ ہفت روزہ کی شکل میں نکلا اور پھر جون 1999 میں اسے روزنامہ کی شکل دے دی گئی۔متعدد شہروں سے نکلنے کی وجہ سے ان دونوں اخباروں کی مجموعی سرکولیشن خاصی ہے۔ روزنامہ صحافت اور اخبار مشرق چار چار شہروں سے اور ہمارا سماج دوشہروں سے شائع ہوتا ہے۔ باقی اخبارات بہت کم تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔

یوں تو دہلی سے بڑی تعداد میں اخبارات نکل رہے ہیں لیکن اگر ہم ان کے معیار پر نظر ڈالیں تو مایوسی ہوتی ہے۔دہلی کے بیشتر اخباروں میں ایک بڑی اور خطرناک برائی در آئی ہے جو دوسرے شہروں کے اخباروں میں بھی داخل ہوتی جارہی ہے۔وہ خرابی ہے پاکستانی اخبارات سے مواد کا سرقہ۔چھوٹے اور متوسط اخبارات کے کئی صفحات کا پیٹ پاکستانی اخبارات کی غذا سے بھرا جارہا ہے۔اس کے علاوہ بعض ایسی ایجنسیاں وجود میں آگئی ہیں جو مسلم دشمن یا اردو دشمن عناصر کی زرخرید ہیں اوران کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے اور اردو حلقوں میں خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر پیوست کرنے کے مقصد سے خبریں اور مضامین ترسیل کرتی ہیں۔چھوٹے اور متوسط اخبارات ان کے مواد کو بغیر ایڈٹ کیے چھاپ دیتے ہیں اور یہ دیکھنے کی ذرا بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ ان مضامین یا خبروں میں کیا کچھ ہے۔دہلی میں یہ بدعت تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔

اردو صحافت کا جائزہ لینے سے ایک اور تکلیف دہ حقیقت سامنے آتی ہے۔وہ یہ کہ آج بیشتر

اردو اخبارات اردوداں طبقے کے اخبار نہ ہوکر ''مسلم اخبار'' بن گئے ہیں۔ یہ بات اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے لیے بہت نقصاندہ ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والوں کی باتوں میں کافی وزن پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے صحافیوں کو چاہیے کہ ان اخباروں کو اردو کا ہی اخبار سمجھیں مسلم یا اسلامی اخبار نہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ بہت سے اخبارات صرف مسلمانوں کے مسائل اٹھاتے ہیں اور ہر خبر اور ہر واقعہ کو مسلم آئینے میں دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ ایک صحافی کو صرف صحافی ہونا چاہیے، مسلمان یا ہندو صحافی نہیں۔ ایک صحافی کا قلم انسانیت کی امانت ہوتا ہے وہ کسی خاص فرقہ، مذہب یا ذات برادری کا نمائندہ نہیں ہوتا۔

اس وقت اگر چہ یہاں کے متعدد اردو اخباروں کا معیار پست ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھی اخباروں میں شائع خبروں کا اثر بھی ہوتا ہے۔ زبان کے معاملے میں عدم معیار کے باوجود اردو کے ایسے متعدد رپورٹر اور صحافی ہیں جو ایکسکلوسیو خبریں لاتے ہیں اور مختلف سطحوں پر بدعنوانیوں اور دہشت گردی کے نام پر ہونے والی زیادتیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی کے اعتبار سے ان اخباروں کا معیار اچھا ہے اور کئی روزنامہ اور ماہنامہ اخبار و رسائل تو ایسے ہیں جن کو انگریزی اور ہندی اخباروں کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اچھی روایت شروع ہوئی ہے۔

اس وقت دہلی کے اردو صحافیوں میں سب سے بزرگ صحافی جی ڈی چندن ہیں۔ اردو کی روایتی صحافت پر بالخصوص اعداد و شمار کے حوالے سے، ان کو ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہ تقسیم ملک کے وقت پاکستان سے ہندوستان آئے تھے اور بعد میں ان کا تقرر پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں اردو آفیسر کے عہدے پر ہوا۔ اردو صحافت کی تاریخ کا علم اس وقت جتنا ان کو ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا۔ صحافت پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ سردست وہ دہلی کے قریب گڑگاؤں میں اپنے بیٹے کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔

م۔ افضل سینئر اردو صحافی ہیں۔ انھوں نے محنت اور جاں فشانی سے صحافت میں اپنا ایک اعلیٰ مقام بنایا ہے اور سیاست میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے ایک ہفت روزہ ''اخبارنو'' کے نام سے نکالا جو اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ ان میں صحافیانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ صحافت کے راستے وہ سیاست میں پہنچے اور راجیہ سبھا کے رکن بنے۔ انھوں نے اپنی رکنیت کے

دوران اردو زبان سے متعلق جتنے سوالات پارلیمنٹ میں کیے تھے اتنے سوال کوئی اور رکن کسی بھی زبان کی صحافت کے بارے میں نہیں کر سکا ہے۔ وہ ایک عرصے تک ''آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس'' کے صدر بھی رہے۔ راجیہ سبھا کی رکنیت ختم ہونے کے بعد ان کو دو بار سفیر بنایا گیا۔ انھوں نے انگولہ، کانگو، گیبن اور آخر میں ترکمانستان میں سفارتی خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین بھی رہے۔

شاہد صدیقی مولانا عبد الوحید صدیقی کے بیٹے اور اردو کے سر کردہ صحافی ہیں۔ وہ اس وقت دو اخباروں ہفت روزہ ''نئی دنیا'' اور روزنامہ ''عوام'' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ انھوں نے بھی محنت شاقہ سے صحافت میں ایک اہم مقام بنایا ہے۔ وہ ایک حقیقی صحافی ہیں۔ نئی دنیا کسی زمانے میں ملک کا سب سے بڑا ہفت روزہ اخبار تھا اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کافی اہم سمجھے جاتے تھے۔ آج اگرچہ ہفت روزہ صحافت پر کافی زوال آیا ہوا ہے پھر بھی نئی دنیا ملک کا سب سے بڑا ہفت روزہ اخبار ہے۔ شاہد صدیقی اس سے قبل بہت اچھا ہندی ہفت روزہ ''نئی زمین'' کے نام سے بھی نکال چکے ہیں۔ وہ راجیہ سبھا کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

پرواز رحمانی سینئر صحافی ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک ''سہ روزہ دعوت'' کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ قومی و بین الاقوامی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی تحریروں میں ملی فکر نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ سنجیدگی ان کی تحریروں کی اہم خصوصیت ہے اور سادہ اور عام فہم زبان میں تجزیہ و تبصرہ کرنے کا ملکہ انھیں حاصل ہے۔ وہ صحافتی قدروں کی پاسداری کرتے ہیں اور اپنے قلم اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا ان کو پسند نہیں ہے۔

رضوان اللہ اور سعید سہروردی دہلی کے بزرگ صحافیوں میں شامل ہیں۔ اول الذکر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ کی صحافت میں گزارا۔ اس کے بعد وہ دہلی میں امریکی سفارت خانہ میں شعبۂ اردو کے ایک عرصے تک انچارج رہے۔ وہ اردو کی مانند انگریزی کے بھی صحافی ہیں۔ ضعیف العمری کے سبب سرگرم صحافت سے کنارہ کش ہیں لیکن ان کے مضامین اب بھی اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ جبکہ سعید سہروردی بھی ضعیف العمری کی وجہ سے سرگرم صحافت سے کنارہ کش ہیں۔ البتہ کئی اخباروں میں ان کے کالم آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔

معصوم مرادآبادی ان صحافیوں میں شامل ہیں جو اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر

آگے بڑھے ہیں۔ وہ کئی برسوں سے ''خبردار جدید'' کے نام سے پندرہ روزہ اخبار نکال رہے ہیں۔ چند سال قبل انھوں نے ''جدید خبر'' کے نام سے روزنامہ بھی شروع کیا جو پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے اور متوسط اخباروں میں ایک معیاری اخبار سمجھا جاتا ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کے رکن بھی ہیں۔

ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس ماہنامہ ''افکار ملی'' کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ گزشتہ 29 برسوں سے یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جذباتی صحافت نہیں کرتا اور معاملات کو انصاف پسند نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے مضامین معیاری ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر الیاس اب صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی داخل ہو گئے ہیں۔

پی پی مسیح ایک سینئر اردو صحافی ہیں۔ وہ اس وقت روزنامہ تیج کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے متعدد بڑے صحافیوں کے ساتھ کام کیا ہے جن میں ناز انصاری قابل ذکر ہیں۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مزاج کے انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بھی مسائل کے تعلق سے ایک سلجھا ہوا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ وہ موجودہ اردو صحافت سے بہت مطمئن نہیں ہیں۔ لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بہر حال جیسے بھی اخبارات نکل رہے ہیں غنیمت ہیں۔ پی پی مسیح ایک ایسے سیکولر صحافی ہیں جن کی مثال اس وقت دہلی کی صحافت میں بہت کم ملے گی۔ وہ خاموشی کے ساتھ کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ انھیں خود کو نمایاں کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اتنے اچھے اور جینوین صحافی کے بارے میں لوگ زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

شکیل شمسی روزنامہ ''انقلاب'' کے ایڈیٹر نارتھ ہیں۔ وہ اس سے قبل روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی صحافت کا آغاز دوردرشن سے ہوا تھا۔ راشٹریہ سہارا سے ان کو ایک شناخت ملی اور اب وہ ملک کے معروف صحافیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی صحافت پر ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے انقلاب کو قارئین کے لیے ایک بہت بڑا پلیٹ فارم بنا دیا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر کوئی بحث اخبار میں چھیڑتے ہیں جس پر قارئین کی آرا شائع کی جاتی ہیں۔ وہ روزانہ کسی اہم موضوع پر ''موضوع گفتگو'' کے عنوان سے شذرہ بھی لکھتے ہیں۔

وسیم الحق روزنامہ ''اخبار مشرق'' کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ اخبار پہلے کلکتہ سے نکلا تھا۔ وہاں سے اب بھی نکل رہا ہے۔ کئی سال سے وہ دہلی سے بھی نکال رہے ہیں۔ مواد کے اعتبار سے اس میں

تنوع ہے۔ظفر آغا بنیادی طور پر انگریزی کے صحافی ہیں مگر وہ کئی برسوں تک روزنامہ ''جدید میل'' کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔اردو اخباروں میں کالم نویسی کے توسط سے انھوں نے اردو صحافت میں قدم رکھا اور اب ایک اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت ہے۔

شاہد پرویز بھی اپنے وقت کے ایک باخبر صحافی تھے۔انھوں نے روزنامہ قومی آواز میں ایک عرصے تک نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔انھوں نے اپنے کیریئر میں متعدد سیاست دانوں کے انٹرویوز کیے تھے جن کا مجموعہ ''آف دی ریکارڈ'' نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔وہ کئی برسوں سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے دہلی مرکز کے ڈائرکٹر ہیں۔اس کے علاوہ روزنامہ ''اردو نیوز'' جدہ کے لیے رپورٹنگ بھی کرتے ہیں۔

سید منصور آغا ایک سینئر اور بزرگ صحافی ہیں۔وہ روزنامہ قومی آواز سے چیف سب ایڈیٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔اس وقت ان کے کالم ملک و بیرون ملک کے مختلف اخباروں میں شائع ہو رہے ہیں۔وہ انگریزی میں بھی کالم نگاری کرتے ہیں اور انسانی حقوق کی ایک تنظیم بھی چلاتے ہیں۔

نصرت ظہیر ایک صحافی کے ساتھ ساتھ ایک ادیب بھی ہیں۔وہ طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔انھوں نے پہلے روزنامہ ''تیج'' میں کام کیا اور پھر روزنامہ ''قومی آواز'' میں۔وہ قومی آواز کے بند ہونے تک اس میں خدمات انجام دیتے رہے۔قومی آواز نے ان کو ایک شناخت عطا کی۔انھوں نے اسی دوران ایک مؤقر ادبی جریدہ ''ادب ساز'' شروع کیا۔اس وقت وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والے رسائل ''اردو دنیا''، ''فکر و تحقیق'' اور ''بچوں کی دنیا'' کے اعزازی مدیر ہیں۔ملک و بیرون ملک کے طنز و مزاح نگاروں میں انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

چندر بھان خیال نے ''سویرا'' اور ''تیج'' جیسے اخباروں میں خدمات انجام دینے کے بعد روزنامہ ''قومی آواز'' جوائن کیا۔2006 میں قومی آواز سے سبکدوش ہونے کے بعد انھیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین مقرر کیا گیا جہاں انھوں نے تقریباً ساڑھے تین سال تک خدمات انجام دیں۔اس وقت وہ ہندی ہفت روزہ ''بھویہ بھارت ٹائمس'' کے چیف ایڈیٹر، ساہتیہ اکیڈمی میں اردو ایڈوائزری بورڈ کے کنوینر اور ایگزیکیٹو کمیٹی کے رکن اور نیشنل بک ٹرسٹ کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن ہیں۔وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ان کی منظوم سیرت

''لولاک'' کو کافی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے۔

سید فیصل علی روزنامہ راشٹریہ سہارا میں گروپ ایڈیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ جدہ سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ ''عرب نیوز'' سے وابستہ تھے۔ وہ اخبار میں لکھنے کے علاوہ نیوز چینل عالمی سہارا کے لیے ہر ہفتے مختلف شعبوں کے ماہرین کے انٹرویوز کرتے ہیں۔ اسد رضا روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ سوویت انفارمیشن سینٹر کے جریدہ ''سوویت جائزہ'' میں کام کر چکے ہیں۔ وہ ایک شاعر اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مودود صدیقی کئی دہائیوں سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ وہ متعدد بڑے صحافیوں اور ادیبوں کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ انھوں نے اردو صحافت کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی ہے جس کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے اور جو اس موضوع پر پہلی اور واحد کتاب ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ پر مودود صدیقی کی گہری نظر ہے۔ وہ میدان صحافت کے تکنیکی پہلوؤں کی بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں جو ان کی ایک اضافی خوبی ہے۔ وہ سر دست ہفت روزہ اخبار نو کے منیجنگ ایڈیٹر ہیں۔

عزیز برنی بھی ایک صحافی کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک عرصے تک ''راشٹریہ سہارا'' کے گروپ ایڈیٹر رہے ہیں۔ سر دست وہ ''عزیز الہند'' نام سے اپنا روزنامہ اخبار نکال رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

محمد عتیق صدیقی ایک سینئر صحافی تھے۔ وہ روزنامہ ''الیوم'' اور پندرہ روزہ ''وحدت'' کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے ایک عرصے تک دہلی حج کمیٹی کے سکریٹری کے بھی فرائض انجام دیے تھے۔ گزشتہ دنوں ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

شیخ منظور احمد ایک خبر ساں ایجنسی ''عالمی اردو سروس'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ خبر رساں ایجنسی یو این آئی میں انگریزی صحافی کے طور پر کام کر رہے تھے۔ بعد میں ان کو اردو یو این آئی کا ایڈیٹر بنایا گیا اور اسی حیثیت سے وہ وہاں سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

قاری محمد میاں مظہری ''سیکولر قیادت'' کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے یہ اخبار ہفت روزہ تھا اب روزنامہ نکل رہا ہے۔ ایس ایم آصف روزنامہ ''ان دنوں'' کے مالک اور ایڈیٹر ہیں۔

انجم نعیم بھی ایک سینئر صحافی ہیں۔ وہ آل انڈیا ملی کونسل کے ہفت روزہ اخبار ''ملی قیادت'' کے سابق ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کئی برسوں تک امریکی سفارت خانہ کے اردو رسالے ''اسپین''

کی بھی ادارت کی ہے۔ سنجیدہ ذہن صحافی ہیں اور حالات حاضرہ پر ان کے مضامین میں گہرائی وگیرائی ہوتی ہے۔ وہ ایک پختہ کار طنز ومزاح نگار بھی ہیں۔

اے یو آصف بنیادی طور پر انگریزی کے صحافی ہیں لیکن اردو میں بھی مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ہفت روزہ چوتھی دنیا کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ نیوز پورٹل ''فاناواچ ڈاٹ کام'' کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے جماعت اسلامی ہند کے انگریزی اخبار ''ریڈینس'' میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔

سید اجمل حسین روزنامہ قومی آواز میں چیف سب ایڈیٹر رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایک معروف ویب سائٹ ''اردو تہذیب ڈاٹ نیٹ'' میں اردو سائٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ اسی طرح نایاب رحمٰن بھی قومی آواز میں چیف سب ایڈیٹر رہے ہیں۔ وہ اس وقت خبر رساں ایجنسی ''عالمی اردو سروس'' کے ایڈیٹر انچارج ہیں۔

عبدالحیٔ عرف خرم قیومی بھی ایک سینئر صحافی ہیں۔ وہ روزنامہ قومی آواز میں ڈپٹی نیوز ایڈیٹر تھے۔ جب دہلی سے روزنامہ انقلاب شروع ہوا تو انھوں نے اسے جوائن کیا۔ وہ اب انقلاب سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ برسوں تک آل انڈیا ریڈیو پر بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

دہلی کے اردو صحافیوں میں قاسم سید (ایڈیٹر روزنامہ خبریں)، خالد انور (ایڈیٹر روزنامہ ہمارا سماج)، حسن شجاع (ایڈیٹر روزنامہ صحافت)، محمد شفیق (ایڈیٹر سہ روزہ دعوت)، انصاری اطہر حسین (ایڈیٹر صدائے انصاری)، ماجد رمن، سلیم شیرازی، ضیاء الرحمٰن غوثی، ظفر انور شکر پوری، جلال الدین اسلم، عبدالباری مسعود، خورشید عالم، جاوید قمر، نریش ندیم، ایم ودود ساجد، صالح عبد اللہ، شاہنواز صدیقی، عتیق مظفر پوری، سراج نقوی، مولانا عقیدت اللہ قاسمی، یامین انصاری، ندیم احمد، بسمل عارفی، غطریف شہباز ندوی، شاہد الاسلام وغیرہ بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں صحافیوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔

سہیل انجم

(مولانا) امداد صابری

مولانا امداد صابری 16 اکتوبر 1914 کو دہلی میں مولانا شرف الحق صابری کے یہاں پیدا ہوئے اور 14 اکتوبر 1988 کو دہلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ مولانا شرف الحق صابری کو حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے ایک تعلق خاص تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کے نام میں ان دونوں بڑی شخصیات کے ناموں کو جوڑ دیا اور اس طرح انھوں نے ان کا نام رکھا امدادالرشید صابری۔

مولانا امداد صابری کو اردو صحافت کا ایک بے مثل محقق کہا جاسکتا ہے۔ پانچ ضخیم جلدوں میں اردو صحافت کی تاریخ مرتب کر کے انھوں نے صحافت کی جو لاثانی خدمت انجام دی ہے، ہندو پاک کی اردو صحافت کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دراصل وہ کسی ایک شخص کا کام نہیں تھا لیکن انھوں نے تن تنہا یہ کام کر ڈالا۔

انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ابتدائے عمر ہی میں کر دیا تھا۔ وہ آٹھ سال ہی کے تھے کہ مضامین لکھنے لگے تھے۔ چودہ سال کے ہوئے تو ان کا ایک مضمون ''کالا پہاڑ'' دہلی کے رسالے ''تیغ'' میں شائع ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی کتاب تصنیف کر دی۔ جس کا نام ''داستان پُرغم'' ہے۔ یہ ایک ناول ہے۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیوں پر ایک کتاب چھاپ کر کے ہنگامہ برپا کر دیا۔

ان کے والد مولانا شرف الحق اپنے دور کے ایک جید عالم دین تھے۔ ان کا ایک زبردست کتب خانہ بھی تھا جس میں ہزاروں کتابیں تھیں جن میں سینکڑوں نایاب تھیں۔ اس لائبریری نے مولانا امداد صابری کے ذوق کو جلا بخشی اور مطالعۂ کتب نے ان کے اندر مضمون نویسی کا شوق پیدا

کر دیا۔ پھر جو انھوں نے لکھنا شروع کیا تو نصف صدی تک ان کا قلم خاموش نہیں ہوا۔

اپریل 1940 میں وہ صحافت کے میدان میں آئے اور اپنا ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جس کا نام ''اتحاد'' تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''تیغ'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ وہ انقلابی طبیعت کے انسان تھے۔ کردار میں بھی انقلاب کی جھلک تھی اور قلم میں بھی۔ وہ برطانوی حکومت کے خلاف کھل کر لکھتے تھے۔ ان کی انقلابی تحریریں انگریزی حکومت کو پسند نہیں آتیں۔ وہ اس انقلابی کو کب تک برداشت کرتی۔ لہٰذا انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور اتحاد کی اشاعت کو بند کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ جب اگست 1942 میں ''انگریز و بھارت چھوڑو'' کی تحریک شروع ہوئی تو انھیں لال قلعہ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ 20 نومبر 1943 کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ البتہ حکومت نے انھیں خطرناک شخص قرار دے کر ان کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ مولانا امداد صابری سولہ سال کی عمر میں ہی سیاست میں داخل ہو گئے تھے۔ ایک بار انھوں نے دیکھا کہ ایک انگریز پولیس سارجنٹ ایک جوان لڑکی کو اپنی لاٹھیوں سے زدوکوب کر رہا ہے، وہ اس سارجنٹ سے ٹکرا گئے۔ انھیں 1938 میں دہلی کانگریس کمیٹی کا جنرل سکریٹری مقرر کر دیا گیا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد کانگریس کے لیڈروں سے بعض اختلافات کے سبب انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد وہ 1939 میں سبھاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک میں شامل ہو گئے۔ انھیں صوبہ دہلی کا صدر اور پھر آل انڈیا فارورڈ بلاک کا سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔

بہر حال پابندی لگنے کے بعد بھی وہ اپنی سرگرمیوں سے دست بردار نہیں ہوئے اور ہفت روزہ اخباروں ''چنگاری'' اور ''قومی حکومت'' سے قلمی تعلق برقرار رکھا۔ پھر ان کی انقلابی تحریریں انگریزی حکومت کو گراں گزرنے لگیں۔ ایک بار پھر انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ قید و بند کا یہ سلسلہ ملک کی آزادی تک چلتا رہا۔ بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ جب ملک آزاد ہوا تو انھوں نے اپنے پرانے اخبار ''قومی حکومت'' کی اشاعت کی تجدید کی۔ اس کے بعد الگ الگ اوقات میں انھوں نے ''جماعت''، ''صدیقی گزٹ'' اور ''متحدہ محاذ'' کے نام سے اخبارات نکالے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دو ہفت روزہ اخباروں ''مشاہدہ'' اور ''مستقیم'' کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دیتے رہے۔

اگر مولانا امداد صابری اخبارات کے اجرا تک خود کو محدود رکھتے تو انھیں وہ انفرادی شناخت

حاصل نہیں ہوتی جو" تاریخ صحافت اردو" لکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس عظیم الشان کارنامے کا آغاز 1953 میں کیا۔ ان کے والد مولانا شرف الحق صدیقی کے کتب خانے میں اخبارات کا ایک زبردست ذخیرہ موجود تھا۔ ان اخباروں کی تعداد کئی سو تھی۔ اس ذخیرے نے ان کے اس کارنامے میں بہت مدد کی۔ اس کے علاوہ مولانا خود تلاش وجستجو کے شائق تھے۔ جہاں جاتے کتابوں اور لائبریریوں میں گم ہو جاتے۔ انھوں نے خود ذاتی کاوش کی بدولت اخبارات کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

مولانا امداد صابری کو اردو صحافت کی تاریخ قلمبند کرنے کا مشورہ مولانا ابوالکلام آزاد نے دیا تھا۔ انھوں نے ان کے صحافتی ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اگر اردو صحافت کی تاریخ قلمبند کر دیں تو ایک بڑا کام ہوگا۔ انھوں نے مولانا آزاد کے مشورے پر عمل کیا اور آج اردو صحافت کی تاریخ جو کہ پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ اس مشورے کا ذکر انھوں نے چوتھی جلد میں کیا ہے اور کہا ہے کہ مولانا آزاد نے 1946 میں انھیں یہ مشورہ دیا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ پانچ جلدوں میں چھپی ہے۔ چھٹی جلد بھی وہ مرتب کر رہے تھے جس میں 1930 سے 1970 تک کے اخبارات کی تاریخ تھی۔ ان کا ارادہ ساتویں جلد تیار کرنے کا بھی تھا۔ جس میں اس وقت تک کے اخبارات کی تاریخ قلمبند کی جاتی۔ لیکن وقت نے انھیں پانچویں جلد تک کی مہلت دی تھی۔ چھٹی جلد ان کی آخری عمر میں تکمیل کے قریب تھی۔ مگر اس کا کیا بنا کچھ نہیں معلوم۔ اگر وہ ساتویں جلد چھاپنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو یقیناً ان کا یہ کارنامہ مزید بھاری بھرکم ہو جاتا۔

پہلی جلد یکم جنوری 1953 کو شائع ہوئی تھی جس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم واضافے کے ساتھ 1967 میں شائع ہوا۔ پہلی جلد میں ابتدا سے لے کر 1857 تک کے اردو اخبارات کی تاریخ ہے۔ دوسری جلد 1960 میں شائع ہوئی جس میں 1858 سے 1875 تک کے اخبارات کا تعارف ہے۔ تیسری جلد کی اشاعت 1964 میں ہوئی اور اس میں 1876 سے لے کر 1900 تک اردو صحافت کی تاریخ ہے۔ چوتھی جلد کی اشاعت 1974 میں ہوئی جس میں 1910 تک کی صحافت کے حالات درج ہیں۔ پانچویں جلد 1984 میں شائع ہوئی اور اس میں 1910 سے 1930 تک کی صحافت کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ ان تمام جلدوں میں اخبارات ورسائل کے نام، تاریخ اجرا، میعاد اشاعت، ایڈیٹر کا نام، دیگر ذمہ داروں کے نام، ایڈیٹر کے حالات زندگی اور خبروں اور مضامین

کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ مولانا امداد صابری ہر جلد کو کسی ایک بڑے صحافی یا ادیب کے نام معنون کرتے اور پھر ابتدا ہی میں اس کے حالات زندگی اور خدمات پر تفصیل کے ساتھ ایک مضمون لکھتے۔ اس کے علاوہ ''تالیف کی دقتیں'' کے عنوان سے بھی ایک مفصل مضمون قلمبند کرتے جس میں اس کا بیان ہوتا کہ انھیں اس کتاب کے لکھنے میں کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور کن دقت طلب مراحل سے گزرنا پڑا۔ آخر میں ''حرف آخر'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھتے۔ مثال کے طور پر پانچویں جلد کی تالیف اور اشاعت کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر وہ اس انداز میں کرتے ہیں: ''میں نے جب بھی اپنی کسی کتاب کی طباعت کا خیال کیا تو اس وقت پیسے کے اعتبار سے اپنی جیب کو خالی پایا۔ جن مشکلات میں میری کتابیں چھپی ہیں وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میری کتابوں کی طباعت میں خداوندرب العزت کی مہربانیاں اور عنایتیں داخل ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی کتاب طبع ہوتی ہے تو خداوندرب العزت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس جلد کے آخر میں ''حرف آخر'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''تحقیقی میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں تلاش وجستجو اور کھوج کرنے سے معلومات تو حاصل ہوجاتی ہیں لیکن مکمل تکمیل نہیں ہوتیں، جو ناممکنات میں سے ہے۔ اور خاص طور پر تاریخ صحافت اردو کا میدان بہت کٹھن ہے۔ تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد 1953 میں طبع ہوئی تھی۔ دوسری جلد 1963 میں شائع کرنے کے بعد میں نے تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد کی نظر ثانی کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لیکن تاریخ صحافت اردو کی تیسری جلد بھی صدیقی برادری کی شخصیتیں، رسول خدا ﷺ کی غریبوں سے محبت، آثار رحمت اور روح صحافت کی تیاری میں مصروف ہوگیا اور اس کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ خدا بھلا کرے جناب محمد یوسف صاحب مالک شاہراہ بک ڈپو دہلی کا وہ مجھ کو تاریخ صحافت اردو جلد اول کی نظر ثانی کرنے کے لیے برابر ٹوکتے رہے، تقاضا کرتے رہے اور اس کی ضرورت کا احساس دلاتے رہے۔ غرض ان کا اصرار اور تقاضے کام آئے اور میں نے اس کام کی طرف توجہ کی...... تاریخ صحافت اردو جلد اول کے پہلے ایڈیشن میں اچھی خاصی تبدیلی ہوگئی ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں ترمیم وتنسیخ کے ساتھ غیر مصدقہ باتوں کو حذف کرکے مصدقہ باتوں کا اندراج ہوا ہے۔ لیکن معلومات کے پورے ذرائع حاصل نہ ہوسکے۔ مجھے امید ہے کہ اس عنوان پر آئندہ لکھنے والے اس کمی کو پورا کریں گے۔'' اس مضمون پر 6 جنوری 1967 کی تاریخ درج ہے۔

مولانا امداد صابری سے قبل اردو صحافت کی تاریخ کتابی صورت میں 1888 میں اختر شاہنشہی کے نام سے شائع ہوئی تھی جسے اس میدان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔اس کے بعد مولانا امداد صابری نے یہ کام کیا اور بہت خوب کیا۔اس تاریخ میں قدیم اخباروں کا مطالعہ کرنے، ان میں شائع مضامین اور خبروں کا تجزیہ کرنے، ان کی روشنی میں تحقیق کرنے اور اردو صحافت کی تاریخ ازسرنو مرتب کرنے کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے بہت کچھ مواد موجود ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو ان کے بعد جو لوگ بھی اردو صحافت کی تاریخ مرتب کریں گے ان کے لیے اس پہاڑ تک رسائی ضروری ہوگی۔ جو اس پہاڑ کی زیارت نہیں کر پائے گا اس کا کام نامکمل رہے گا۔ یہ کام مولانا امداد صابری کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کا نام اس وقت تک زندہ رکھے گا جب تک کہ اردو صحافت زندہ رہے گی۔

پانچ جلدوں پر مشتمل اردو صحافت کی تاریخ تقریباً چار ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جبکہ صحافت پر ان کی مزید 9 کتابیں ہیں اور اس طرح کل ضخامت سات ہزار صفحات تک جا پہنچتی ہے۔

انھوں نے اپنی تصنیف ''اردو کے اخبار نویس جلد اول'' میں بہت سے صحافیوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس حوالے سے انھوں نے اردو کے پہلے اخبار ''جام جہاں نما'' کے مالک ہری ہر دت اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال کے بارے میں بھی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ ہری ہر دت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''دت کا خاندان بنگال کا ایک دولتمند خاندان تھا۔ اس خاندان کا تعلق صحافت سے رہا ہے۔ دت کے دادا پندی دت تھے جو پچاس سال تک کسٹم ہاؤس کے دیوان رہے۔ وہ اپنے انتقال کے وقت کافی دولت چھوڑ کر گئے۔ ہری ہر دت کے والد تارا چند تھے۔ سر چارلس ڈائل کے ماتحت یہ بھی کسٹم ہاؤس کے دیوان مقرر ہوئے۔ تارا چند نے کافی روپیہ کمایا۔ انھوں نے بھوانی چرن کے ساتھ مل کر 1879 میں ایک بنگالی زبان کا پرچہ ''کمودی'' جاری کیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے ستی کے خلاف جو تحریک چلائی تھی اس میں ہری ہر دت نے بھی حصہ لیا تھا۔ کمودی کے زمانے میں یہ چاہتے تھے کہ ستی کی رسم کے خلاف اس پرچے میں مضامین لکھے جائیں لیکن بھوانی چرن متفق نہیں ہوئے اس بنا پر ان کو مجبوراً کمودی سے علاحدہ ہونا پڑا۔ 26 مارچ 1831 کو ستی کی رسم روکنے کے لیے گورنر جنرل کی خدمت میں جو درخواست پیش کی گئی تھی اس کو انگریزی میں ہری

ہردت نے پڑھ کر سنایا اور بنگلہ میں منشی کالی ناتھ چودھری نے سنایا۔ ہری ہردت انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے پہلے ماسٹروں کے دفتر میں ملازمت کی۔ بعد میں دیوان مقرر ہوئے۔ یہ بنگال اسٹیم کمپنی کے بھی رکن رہ چکے تھے۔ 27 مارچ 1822 کو کلکتہ سے جاری ہونے والا ہفت روزہ ''جام جہاں نما'' فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ آٹھ صفحے فارسی میں اور چار صفحے اردو میں۔ اس اخبار کے درخواست دہندہ یعنی مالک ہری ہردت، منشی سدا سکھ لال ایڈیٹر اور ولیم ہوپ کنگ پرنٹر تھے۔ ابتدا میں یہ اخبار کچھ عرصہ تک انگریزی تجارتی کوٹھی کے زیر اثر رہا۔ اس کے سرورق کی ابتدا میں دونوں طرف تاج برطانیہ کی تصویر چھپتی تھی اور انگریزوں کی پالیسی کے مطابق اخبار چلتا تھا۔ لیکن بعد میں راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون لکھنے پر ایسٹ انڈیا کمپنی اس اخبار سے ناراض ہوگئی۔ یہ قابل اعتراض مضمون ہری ہردت کے زمانہ ایڈیٹری میں لکھا گیا تھا جبکہ منشی سدا سکھ لال اس اخبار کی ایڈیٹری سے علاحدہ ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں اس اخبار کی پالیسی آزاد ہوگئی تھی۔ کئی معاملوں میں دت نے انگریزوں کی مخالفت کی اور تاج برطانیہ کی تصویر بھی سرورق پر چھاپنی بند کر دی تھی ...... خبروں کے ساتھ ساتھ رائے زنی بھی کی جاتی۔ زیادہ تر جنگ کی خبریں چھپتی تھیں۔ فارسی کا پرچہ بھاری بھرکم ہوتا تھا لیکن اردو کا پرچہ معلوم ہوتا ہے کہ بددلی سے نکالا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مذکورہ درباروں کے حالات زیادہ اور غیر ملکی خبریں خال خال نظر آتی تھیں۔ یہ خبریں زیادہ تر انگریزی اخباروں اور فارسی پرچوں سے اخذ کی جاتی تھیں اور ان کے ترجمے اور اقتباسات جام جہاں نما کی زینت بنتے تھے۔ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں اس اخبار کے نمائندے تھے جو خطوط کے ذریعے خبریں بھیجتے تھے۔ درباروں اور انگریزی ایجنٹوں کے دفتروں سے بھی اس اخبار کا تعلق تھا۔ سرکار اودھ اور دوسری ریاستوں کے طرز حکومت پر بھی سنجیدگی کے ساتھ رائے زنی کرتا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری طبقے میں یہ پرچہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی رائے کو مستند مانا جاتا تھا اور تقریباً ہندوستان کے ہر رئیس و حاکم و ادیب اور شاعر کے مطالعے میں یہ پرچہ رہتا تھا۔ چنانچہ مرزا غالب چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں لکھتے ہیں کہ 'میں نے کلکتہ میں مہتمم مطبع جام جہاں نما کو لکھ بھیجا ہے اور ترک سعی کیا ہے۔ آپ بھی فکر کیجیے کہ اگر کہیں سے آپ کے پاس آ جائے تو مجھ کو بھیج دیجیے'۔ جام جہاں نما میں خبروں کے حاصل کرنے کے لیے ایسے عمدہ ذرائع تھے کہ اس میں حکومت کی خبریں پہلے چھپتی تھیں بعد میں حکومت کے گزٹ اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوتی تھیں''۔

اردو صحافت کی تاریخ مرتب کرنے کے علاوہ بھی مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انتقال سے تقریباً تین ماہ قبل اپنی ایک کتاب ''تذکرہ راحت مولائی'' کی رسم اجرا کی تقریب میں بولتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: ''میری سیاسی اور ادبی خدمات میری سب سے بڑی دولت ہیں۔ دنیاوی نظر انھیں جس طرح چاہے تولے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اپنی زندگی میں نقصان میں نہیں رہا۔ بلکہ ان خدمات کی بدولت محشر میں سرخرو ہوں گا۔ مجھے اس امر پر بہت فخر ہے کہ میں نے آزادی کی جدو جہد میں حصہ لیا اور اس دوران قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ ایسی شرکت میرے خاندان کی روایت رہی ہے۔ میرے والد مرحوم برسہابرس برطانوی مشنریوں کے مذہبی یلغاروں کا مقابلہ کرتے رہے اور میرے دادا مرحوم 1857 کی عظیم بغاوت میں بہادر شاہ ظفر کے غازیوں کو اسلحہ فراہم کرتے رہے۔ دولت صرف سونے چاندی اور سکوں ہی سے نہیں بنتی۔ ایمان اور کردار سے بھی بنتی ہے۔ میرے پاس وہی دولت ہے۔ میں اسی دولت کو زندگی کی اصل طاقت سمجھتا ہوں''۔

مولانا ایک سیاسی شخصیت بھی تھے۔ سیاست میں ان کے دوست بھی رہے ہیں اور دشمن بھی۔ لیکن علمی دنیا میں مولانا ''نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیر'' پر عمل پیرا رہے۔ چنانچہ انھوں نے قدیم اخباروں کے مطالعہ کے وقت اپنے ذہن کے تمام دریچے کھلے رکھے اور اپنے سیاسی مسلک کو اپنے علمی مطالعہ سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ حق گوئی و بے باکی مولانا کے خمیر میں تھی۔ وہ وطن کی محبت میں سرشار تھے۔ جہاں بھی برطانوی حکومت کے خلاف اور ہندوستان کے حق میں آواز بلند ہوتی مولانا یا تو وہاں موجود ہوتے یا اس کی حمایت کرتے۔ زبان سے بھی اور قلم سے بھی۔ مولانا نے مجاہدین آزادی پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس تعلق سے بھی وہ حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اگر کسی شخصیت پر کوئی مضمون لکھ رہے ہیں تو اس کی خوبیوں کا جہاں اعتراف کرتے وہیں خامیوں پر گرفت بھی کرتے۔ جہاں اور جس کی جو بات اچھی لگتی وہ اس کی تائید کرتے اور جو بات بری لگتی اس کی مخالفت کرتے۔

مولانا امداد صابری سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ خدمت خلق کو انھوں نے اپنے لیے فرض تصور کر لیا تھا۔ سیاسی زندگی میں وہ اگرچہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے لیکن عوامی خدمت کو انھوں نے اپنے لیے کامیابی و کامرانی کا درجہ دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مطابق مولانا سادہ مزاج اور اپنی طبیعت کے ستھرے پن کے اعتبار سے بہت ہی پاک صاف انسان تھے۔ ہمیشہ کھدر

کا سفید لباس پہنتے تھے جس میں کوئی داغ دھبہ برداشت نہیں کرتے۔ اونچی باڑھ کی سفید کھدر کی ٹوپی ان کی خاص شناخت تھی۔ سر پر بال کم تھے مگر مولانا کی زندگی میں فارغ البالی شاید ہی کبھی آئی ہو۔ پاؤں میں ایک سادہ سی چپل پہنتے تھے۔ آہستہ چلتے کہ ان کی ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ بھی تھا۔ ویسے غیر معمولی طور پر متحرک انسان تھے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے اور سوچتے رہتے تھے جو دوسروں کی بھلائی کے لیے ہوتا۔ گفتگو کے وقت ان کا لہجہ دھیما رہتا۔ جس میں کھرے پن کا ایک احساس ملتا تھا۔ اسٹیج پر مولانا بہت چیختے تھے اور اپنی بات دور تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کی سیاسی زندگی میں کئی موڑ آئے مگر وہ جوڑ توڑ کے قائل نہیں تھے۔ وہ سیاست میں مجاہدانہ جذبے کے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے سیاست کو کبھی بھی کاروبار نہیں بنایا۔ ان کی زندگی میں ڈر، خوف اور دہشت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انھوں نے کتابوں کی تجارت کی تھی مگر خسارہ اٹھانے کے بعد بند کر دی تھی۔ ان کی رہائش گاہ چوک چوڑی والان سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اونچی سی ڈیوڑھی اس کے سامنے ایک زینہ اور برابر میں گھر کا دروازہ۔ اسی کی بغل میں مولانا کی بیٹھک ہوتی تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے اس کا راستہ باہر سے تھا۔ مولانا لکھتے تو بہت تھے لیکن اس کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے۔ ایک دو پنسل، معمولی سے فاؤنٹن پین یا قلم دوات سے کام چلاتے۔ انھی سے وہ اخباروں یا کتابوں سے اقتباس نقل کرتے رہتے تھے۔ باریک قلم استعمال کرتے اسی لیے کاغذ کے چھوٹے پرزے پر بھی بہت کچھ لکھ لیتے۔ وہ تمام پرزوں کو جمع کرتے جاتے اور پھر یہی پرزے کتاب یا مضمون لکھتے وقت نسخۂ کیمیا کا کام دیتے۔ جو کچھ ان پرزوں پر ہوتا اس سے کہیں زیادہ ان کے دماغ میں ہوتا اور اس طرح دونوں کی مدد سے ان کا کام مکمل ہو جاتا۔

گرمی کے موسم میں مولانا اپنا کرتا یا قمیص بھی اتار ڈالتے اور ایک لنگی باندھے اپنی بیٹھک میں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی حالت میں ان سے چھوٹے بڑے، اپنے اور بیگانے ملنے آتے۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی اہل علم کی صحبت ان کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی زیادہ تر انھیں وہی لوگ گھیرے رہتے جنھیں ان سے کوئی کام ہوتا تھا۔ ان کا دسترخوان درویشوں کی مانند بہت مختصر ہوتا۔

مولانا امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو کے علاوہ گلدستۂ صحافت بھی مرتب کی تھی۔ یہ ایک نئے انداز کا کام تھا اور مولانا کے کاموں میں ایک ادبی کارنامہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی کتابیں ''تاریخ جرم و سزا'' اور ''فرنگیوں کا جال'' کافی مقبول ہوئیں۔ انھوں نے دہلی کی تاریخی شخصیات پر بھی کتاب مرتب کی اور سیاسی رہنماؤں کی بیویوں اور ماؤں کا احوال بھی قلم بند کیا۔ جن

میں اس پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ انھوں نے اپنے شوہروں اور بیٹوں کے ساتھ کس طرح کا انسانی سلوک بلکہ حسن سلوک کیا۔

ان کی معروف تصانیف میں تاریخ صحافت اردو، روح صحافت، تاریخ جرم وسزا، فرنگیوں کا جال، گلدستۂ صحافت، اردو کے اخبار نویس، شہید فرنگ یعنی سردار شہیداں، تاریخ حضرت حافظ محمد ضامن، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس (التمش کے دور سے بہادر شاہ ظفر تک)، داستان شرف (مولانا شرف الحق صدیقی صابری کے حالات زندگی)، کچھ گلدستوں کے حالات اور غزل کے منتخب اشعار، رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک، صوفی انبا پرشاد مرادآبادی اور شہیدان وطن ضلع مرادآباد، حجاز مقدس کے اردو شاعر المعروف بہ تذکرۃ الشعراء حجاز، جنوبی افریقہ کے اردو شاعر، تاریخ آزاد ہند فوج، داستان پرغم اور تذکرۂ راحت مولائی قابل ذکر ہیں۔

◆◆◆

پروانہ ردولوی

پروانہ ردولوی اتر پردیش کے قصبہ ردولی میں 11 نومبر 1933 کو پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 12 اپریل 2008 کو دہلی میں ہوا۔ ان کا گھرانہ مذہبی تھا لہٰذا انھیں بھی مذہب سے گہرا شغف رہا۔ ان کی طبیعت میں تلون مزاجی کے ساتھ ساتھ ہمہ رنگی بھی تھی۔ وہ ایک صحافی، شاعر، افسانہ نویس، خاکہ نگار اور ادیب سب کچھ تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا 1950 میں اس وقت کی تھی جب انھیں یو پی اسمبلی میں رپورٹر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے 1951 میں مولانا عبد الوحید صدیقی کے اخبار روزنامہ ''نئی دنیا'' جوائن کیا جو کہ دہلی سے نکلتا تھا۔ لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے ان کو اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب انھوں نے 1955 میں کانپور سے اپنا روزنامہ ''سیاست نو'' شروع کیا۔ یہ اخبار 1957 تک نکل کر بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ممبئی چلے گئے اور وہاں روزنامہ ''ہندوستان'' میں کام کرنے لگے۔ لیکن 1959 میں وہ پھر دہلی آگئے اور ایک بار پھر نئی دنیا جوائن کر لیا۔ اس بار وہ اس کے ایگزیکٹو ایڈیٹر بنائے گئے۔ انھوں نے 1960 میں جماعت اسلامی ہند کے اخبار روزنامہ ''دعوت'' کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انھوں نے 1963 میں ایک اور روزنامہ اخبار ''ملک وملت'' میں کام کیا۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے اور 1968 میں ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی کے اخبار روزنامہ ''قائد'' میں ریزیڈنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔

اس وقت تک پروانہ ردولوی ایک بے باک اور جری صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ اسی دوران وہ پھر دہلی آگئے اور 1969 میں کے۔ نریندر کے اخبار روزنامہ ''پرتاپ'' سے وابستہ ہو گئے اور 22 سال تک یعنی 1990 تک اس میں کام کرتے رہے۔ وہ پرتاپ کے میگزین سیکشن کے انچارج بھی رہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ بالکل ہی برعکس نظریات

کے اخبار سے اتنے دنوں تک کیسے منسلک رہے۔ یقیناً اس میں ان کی ان خوبیوں کا دخل رہا ہو گا جو انھیں برعکس حالات میں بھی کام کرنے کا حوصلہ بخشتی رہی ہیں۔ پرتاپ اخبار میں ان کی تحریریں لوگ بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتے رہے ہیں۔ اس درمیان مولانا عبدالوحید صدیقی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شاہد صدیقی نے نئی دنیا سنبھالا اور پروانہ ردولوی نئی دنیا میں بھی لکھتے رہے۔ کہاں پرتاپ اور کہاں نئی دنیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مخالف نظریات کے اخبار لیکن پروانہ ردولوی دونوں اخباروں کے ساتھ بہ حسن وخوبی نبھاتے رہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے نظریات وخیالات سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ پرتاپ سے سبکدوش ہونے سے کچھ دنوں قبل انھوں نے وہاں سے رضا کارانہ ریٹائرمنٹ لے لی اور پوری طرح نئی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔ 1990 میں روزنامہ ''عوام'' اور 1997 میں روزنامہ ''سب کا اخبار'' سے بھی ان کی وابستگی رہی۔

پروانہ ردولوی نے اپنے ایک مضمون میں ممبئی کے اخبار روزنامہ ''ہندوستان'' میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ حقائق دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی لہٰذا انھیں یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ نصف صدی پرانی بات ہے۔ غالباً فروری 1958 کی۔ اب صحیح دن اور تاریخ تو یاد نہیں ہے اور اس جگہ کا نام بھی نہیں یاد ہے جہاں غلام احمد خان آرزو مرحوم (مالک ومدیر ہندوستان) سے پہلی ملاقات ہوئی تھی بس اتنا یاد ہے کہ انجمن اسلام اسکول سے ممبئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب ایک گلی مڑتی تھی اور اس میں تھوڑی دور جانے کے بعد ایک وسیع سائبان کے نیچے ایک لیتھو پرنٹنگ پریس تھا وہیں روزنامہ ہندوستان چھپ رہا تھا اور آرزو صاحب طباعت کی نگرانی کر رہے تھے۔ میرا اخبار روزنامہ سیاست نو (کانپور) بند ہو چکا تھا اور میں کانپور کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن ردولی جا چکا تھا۔ نا تجربہ کاری اور کم عمری کی وجہ سے ایک بڑے اخبار کی ذمہ داریوں کو نہیں سنبھال پا رہا تھا۔ قسمت سے راتوں رات ایک اخبار کا مالک بن گیا تھا اور اس اخبار نے پورے اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور بہار میں زبردست مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میں رقیبوں کی سازشوں کا مقابلہ نہ کر سکا، ایجنٹوں نے بلوں کی ادائیگی بند کر دی اور سیاست نو بند ہو گیا۔ ردولی میں 27 جنوری 1958 کو میں ایک بیٹی کا باپ بن گیا اور ایک بیٹی کی ولادت کی شکل میں ذمہ داریوں کا جو کوہ گراں سر پر آن پڑا تھا اس کو اٹھاتے ہوئے میں اپنا انگلش کا پرانا ٹائپ رائٹر اور چند جوڑے

کپڑے لے کر ممبئی کے لیے چل پڑا۔ ممبئی میں میرے جڑواں بھائی سید محمد کمیل صادق ردولوی (مرحوم) پہلے سے موجود تھے اور بی ای ایس ٹی میں شاپ ریکارڈر ہو چکے تھے۔ انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا تھا آج سے پچاس سال پہلے کے انٹرمیڈیٹ پاس شخص کی لیاقت آج کے پوسٹ گریجویٹ درجہ کی تو ہوتی ہی تھی۔ انگریزی، اردو، فارسی، ہندی پر مکمل دسترس بھی ہوتی تھی۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ بی ای ایس ٹی کی ملازمت کرنے سے پہلے وہ ہندوستان کے دفتر میں بھی ایک دو مہینے کام کر چکے تھے۔ اس لیے جب میں ممبئی آیا اور چونا بھٹی سانتا کروز ویسٹ کی ایک چال میں ان کے ساتھ ٹھہر گیا تو انھوں نے مجھے پہلا مشورہ یہی دیا کہ میں ہندوستان میں سب ایڈیٹر کا عہدہ قبول کرلوں۔ انھوں نے رپّن روڈ پر واقع ہندوستان کے دفتر کا پتہ مجھے بتا دیا۔ میں بائیکلہ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر پیدل ہندوستان کے دفتر پہنچا۔ دفتر میں میری ملاقات علامہ درپن سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آرزو صاحب پریس میں ہیں۔ ازراہ شفقت انھوں نے پریس کا پتہ بھی بڑی تفصیل سے بتا دیا اور میں ہندوستان پریس میں پہنچ گیا۔ آرزو صاحب کو دریافت کیا تو ایک قد آور شخص کی جانب اشارہ کر دیا گیا۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گیا۔ قدوقامت دیکھ کر میں نے سمجھا تھا کہ بڑی گرجدار آواز ہوگی مگر میرے سلام کے جواب میں جو آواز سنائی دی وہ بہت نرم اور ملائم تھی۔ اس میں ہمدردی کی بھی آمیزش تھی۔ مجھے ملاقات کے لیے آنے کا سبب بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ میری آمد کا مقصد خود بخود سمجھ گئے...... اس طرح میں روزنامہ ہندوستان میں ملازم ہو گیا۔ ان کے سپرد اداریہ تحریر کرنے کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں بھی کی گئیں''۔

اس زمانہ میں ٹیلی پرنٹر سروس ہندوستان میں نہیں تھی۔ اجمل اور خلافت کا بھی یہی حال تھا مگر انقلاب میں ٹیلی پرنٹر سروس بھی تھی اور اچھا صحافتی اور انتظامی عملہ بھی تھا۔ تنخواہیں بھی قدرے زیادہ تھیں اور وقت پر ملا کرتی تھیں۔ آفسیٹ پریس نہیں آیا تھا اس لیے اخبارات لیتھو پریس پر ہی چھپا کرتے تھے۔ اردو اخبارات میں خواتین کے کالم اور بچوں کے کالم باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے۔ فکاہیہ کالم، طنزیہ قطعات اور مزاحیہ غزل کی اشاعت کا بھی عام رواج تھا۔ پروانہ ردولوی نے ہندوستان میں روزانہ ایک قطعہ لکھنے کی ذمہ داری بھی لے رکھی تھی یہ قطعہ ''شاعر ہندوستان'' کے نام سے چھپا کرتا تھا۔

ہندوستان میں انھوں نے کچھ ہی دن کام کیا تھا۔ جلد ہی مولانا عبدالوحید صدیقی مدیر نئی دنیا

کے کہنے پر وہ دہلی آ گئے۔ 1964 میں نئی دنیا بند ہو گیا اور وہ جماعت اسلامی کے اخبار ''دعوت'' میں چلے گئے۔ دعوت سے چھلانگ لگائی تو ''پرتاپ'' میں پہنچ گئے۔ وہاں انھیں اقتصادی استحکام حاصل ہوا اور صحافتی حلقوں میں پہچان میں بھی اضافہ ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروانہ ردولوی ایک منجھے ہوئے صحافی تھے۔ ان کی علمی استعداد ڈگریوں کی مرہون منت نہیں تھی۔ ان کے اندر انگریزی، اردو، فارسی اور ہندی کی زبردست صلاحیت تھی۔ انگریزی سے اتنا عمدہ اور تیز ترجمہ کرتے تھے کہ آزادی کے بعد ایسا عمدہ ترجمہ کرنے والے چند گنے چنے لوگوں میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی موضوع ان کی گرفت سے باہر نہیں تھا۔ عالمی سیاست ہو یا ملکی، معاشیات کا مسئلہ ہو یا مذہبیات کا، تاریخ کا معاملہ ہو یا فلسفے کا، وہ ہر میدان میں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں انگریزی سے اردو میں بہت زیادہ ترجمے کا کام کیا تھا۔

وہ ایک نفیس طبع انسان تھے۔ شرافت و شائستگی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ وہ اردو کے منافقوں کے زبردست دشمن تھے اور ایسے لوگوں کو موقع ملتے ہی اپنے قلم کی دھار پر رکھ لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کے پاس رحم اور ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ ایک زبردست مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ ''اردو صحافت کا استغاثہ' ان کی ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ پروانہ ردولوی ایک وقت میں ریڈیو کشمیر کے نئی دہلی کیمپ اسٹیشن کے نیوز کمپائیلر اور نیوز ریڈر بھی رہے ہیں۔ انھوں نے کئی سرکاری ثقافتی تقریبات کی کمینٹری بھی ریڈیو کے لیے کی ہے۔

ان کی قابل ذکر کتابوں کے نام یوں ہیں: نجات کا راستہ، کربلا سے کوفہ تک، قاتلان حسینؓ کا عبرت ناک انجام، اسپین سے بوسنیا تک، حونک، آزمائش، ویرانی نہیں جاتی، شاہنامہ کربلا، ہو بہو، نوسٹراڈیمس کی سچی اور حیرت انگیز پیش گوئیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد کتب کے ترجمے بھی کیے۔ ان کی خدمات کے عوض مختلف اداروں نے انھیں اعزازات سے نوازا جن میں دہلی اردو اکادمی کا ایوارڈ برائے صحافت، آل انڈیا میر اکادمی کا میر قلم ایوارڈ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ برائے ادبی خدمات اور دیگر متعدد ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

پروانہ ردولوی کے بیٹے، معروف صحافی، شاعر اور نیوز ریڈر تحسین منور کا یہ جملہ ان کی شخصیت کے اسی بانکپن کی جانب اشارہ کر رہا ہے ''ہم رُدولی میں اپنے گھر کے دالان میں بیٹھ کر یہ

مضمون لکھتے ہوئے ایک عجیب سے جذبے سے گھرے ہوئے ہیں۔ کبھی یہاں پر اسی مقام پر پروانہ رُدولوی اس وقت ہلکی سی نیند لے رہے ہوتے تھے اور ہم لوگ ذرا سا بھی شور کرتے تو ان کی ہلکی سی 'ہوں' سے گھبرا جاتے تھے''۔ وہ پروانہ صاحب کی خودداری کی مثال دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یوپی اسمبلی میں انیس برس کی عمر سے رپورٹنگ کرنے والے پروانہ رُدولوی نے کبھی سیاست دانوں سے اپنی نزدیکیوں کا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ان کی کتاب 'ہو بہ ہو' میں ہیم وتی نندن بہوگنا کے خاکہ سے ان کی قُربتوں کا پتہ چلتا ہے مگر کمال تو یہ کہ کبھی انھوں نے نہ تو اس کا اعلان کیا اور نہ کبھی اس کا فائدہ اٹھایا۔

وہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک بار کی بات ہے۔ نوئیڈا میں ضلع انتظامیہ کے ایک مشاعرہ کے بعد ہم دیر رات ڈھائی بجے گھر پہنچے۔ ہم نے اس ڈر سے کہ کسی کی نیند نہ ٹوٹ جائے دھیرے سے دروازہ پر دستک دی کہ اگر کوئی جاگ رہا ہو تو دروازہ کھول دے۔ مگر تین بار اسلامی طریقے سے دستک دینے کے بعد ہم چھت پر چڑھے اور چھجلی پر اتر کر دھم سے نیچے کود گئے۔ ہمارا کودنا تھا کہ وہ جاگ گئے۔ پوچھا 'کون؟'۔ ہم نے کہا 'ہم ہیں'۔ کہنے لگے کہاں سے 'آ رہے ہو؟' ہم نے کہا 'مشاعرہ سے۔۔!' کہنے لگے 'نہیں، آ کہاں سے رہے ہو؟'۔ ان کے بار بار اصرار پر سمجھ میں آیا کہ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم بغیر دروازہ کھلے گھر میں کہاں سے آئے ہیں۔ جب ہم نے ان کو بتایا کہ چھت سے آئے ہیں تو ان کا اصولی مزاج اُکھڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ واپس چھت پر جاؤ جیسے آئے ہو اور دروازے سے آؤ۔ کیا بتائیں کہ کس طرح ہم کو انھوں نے مدد کر کے واپس چھت پر چڑھایا۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ تقریباً صبح ہو گئی تھی اس کامیاب کوشش میں۔ ہم واپس دروازے پر جب پہنچے تو کہا 'دستک دو'۔ جب دستک دی تو دروازہ کھولا اور کہا کہ ہمیشہ گھر میں دروازے سے آیا کرو۔ شام کو جب دفتر سے آئے تو کہا کہ تمھارے اشعار کی مخمور سعیدی بہت تعریف کر رہے تھے اور جیسے کہ رات میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ تھا ان کی تربیت کا سلیقہ اور طریقہ۔

پروانہ ردولوی کے ایک شاگرد دایم وودو ساجد جنھوں نے نئی دنیا میں ان کے ساتھ کام کیا تھا ان کی تربیت کے انداز کے بارے میں بتاتے ہیں کہ 1990 کے اواخر میں ہفت روزہ نئی دنیا میں مجھے ملازمت مل گئی۔ پروانہ صاحب ان دنوں روزنامہ پرتاپ میں کسی اہم انتظامی عہدہ پر تھے مگر نئی دنیا سے پرانی وابستگی کے سبب کچھ وقت کے لیے وہاں بھی آتے تھے۔ جلد ہی انھوں نے

غالباً شاہد صدیقی کے اصرار پر روزنامہ پرتاپ سے رضا کارانہ سبکدوشی اختیار کر لی اور نئی دنیا میں باضابطہ بیٹھنے لگے۔ میرے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ پروانہ صاحب نے بھی میرے مضامین کو فراخی قلم کے ساتھ ایڈٹ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جب یہ کام کرتے تو بڑی بے رحمی مگر پوری دلجمعی کے ساتھ اپنا لال قلم چلاتے۔ حساس لوگ یہ سمجھتے کہ پروانہ صاحب ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں لیکن فی الواقع وہ اپنی تنی ہوئی ابروؤں اور گھورتی ہوئی آنکھوں سے ہم جیسوں پر احسان کرتے تھے۔ وہ بے کار مضمون کو بھی کارآمد بنا دیتے۔ وہ بسا اوقات اپنے مزاج کی سیمابی کیفیت اور بعض ذاتی مسائل کے سبب دفتر کے ساتھیوں پر زور آزماتے تھے لہٰذا ان کی پدرانہ شفقت اس وصف کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی تھی۔ پروانہ ردولوی کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ لکھتے وقت کبھی اپنے مراسم نہیں نبھاتے تھے۔ جو حق سمجھتے اسے برملا لکھتے تھے۔ ان کی تیکھی تحریروں سے لوگ ناراض ہوتے مگر انھیں ایسا کوئی جھول نہیں ملتا تھا کہ جس پر وہ پروانہ صاحب کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے۔ پروانہ صاحب کا ایک بڑا اور حیرت انگیز وصف یہ بھی تھا کہ وہ اپنے ایڈیٹر سے نوٹ اور نکات لینے میں کوئی تکلف نہ کرتے تھے۔ لیکن جب انھیں کسی پالیسی اور موضوع پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کھلی بحث بھی کرتے تھے۔ ایسا کرتے وقت وہ بعض اوقات بگڑ بھی جاتے تھے۔

انھیں اپنی انسانی کمیوں کا بھی احساس تھا۔ وہ بعض اوقات خود ہی اپنی 'تاریخی خامیوں' پر روشنی ڈالتے تھے۔ نئی دنیا سے وہ اسی وقت سے وابستگی رکھتے تھے جب مرحوم مولانا عبدالوحید صدیقی نئی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ ایک بار وہ مولانا سے کچھ 'کہہ سن' کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ چند ماہ بعد نئی دنیا میں جگہ نکلی اور اخبار میں اس کا اعلان دیا گیا۔ پروانہ صاحب نے ردولی سے خط لکھا: مولانا آپ کو بھی ضرورت ہے اور میں بھی خالی ہوں حکم ہو تو آجاؤں۔ مولانا عبدالوحید صدیقی نے ان کو جواب لکھا: ہاں میاں آجاؤ، مجھے ویسے بھی آستین میں سانپ پالنے کا شوق ہے۔ یہ واقعہ خود پروانہ صاحب سنایا کرتے تھے۔

وہ کسی سے مسلکی امتیاز نہ برتتے تھے، لہٰذا انھیں غصہ آتا تو سب سے زیادہ اپنے ہم مسلک ساتھیوں پر ہی طبع آزمائی کرتے۔ انھیں غیر ضروری باتیں پسند نہیں تھیں۔ پروانہ صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے ابن صفی کو خود ابن صفی سے زیادہ پڑھ ڈالا ہوگا۔ لیکن جب 1992 میں انھیں حج کی سعادت نصیب ہوئی تو انھوں نے مطالعہ کا رخ یکسر بدل دیا۔ قرآن

وحدیث اور علوم اسلامی سے متعلق کتابیں ان کے مطالعہ میں رہنے لگیں۔ پروانہ صاحب نے بڑی سادہ اور قناعت سے پر زندگی گزاری۔

ان کے ایک اور شاگرد احمد جاوید ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ پروانہ ردولوی زندگی سے بھرپور ایک شخصیت کا نام تھا۔ وہ مرتے دم تک فعال تھے۔ آسانی سے شکست ماننے والے نہ تھے۔ خون کے دباؤ اور دل کے دورے کو شکست دیتے آئے تھے۔ موت سے پہلے مرنے کو تو وہ کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔ پروانہ صاحب ایک سیماب پا، خامہ بگوش، سراپا عمل، ہر دم متحرک، ہر لمحہ فعال صحافی تھے۔ ان کے قلم میں جتنی روانی تھی مشاہدہ اتنا ہی تیز اور گہرا تھا، نتیجے تک پہنچنے میں انھیں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ ان کی باریک بیں نگاہیں سات پردوں میں دیکھ لیتی تھیں، کھرا اور کھوٹا الگ کر دیتی تھیں۔ ان کا قلم ایک دو دھاری تلوار تھا جو ملت کے دشمنوں اور خود ہماری صفوں میں موجود کالی بھیڑوں دونوں کی بے دریغ خبر لیتا تھا اور ایسی کہ اس کی تاب کوئی موٹی سے موٹی کھال بھی نہیں لا سکتی تھی۔ ان کی تحریروں نے کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔ اختصار، ایجاز اور جامعیت ان کی تحریر کی خاصیت تھی۔ کم سے کم جگہ میں جامع مضمون لکھنے کا ہنر ان کے پاس تھا۔ وہ خود جس معیار کے پابند تھے، دوسروں سے بھی اسی کی توقع کرتے تھے اور اکثر اس معاملے میں جذباتی ہو جاتے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے جیسی رپورٹیں، تجزیے اور تبصرے لکھنے کی کوشش کرتے کرتے نامور صحافی بن گئے۔

بہر حال پروانہ ردولوی دہلی کی اردو صحافت کی عمارت کے ایک اہم ستون تھے۔ انھوں نے صحافت کو بہت کچھ دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی قلمی خدمات کو یکجا کیا جائے تا کہ صحافت کا ایک گراں قدر اثاثہ برباد ہونے سے بچ جائے۔

◆◆◆

جمنا داس اختر

جمنا داس اختر 2 نومبر 1916 کوراولپنڈی میں پیدا ہوئے اوران کا انتقال 27 اگست 2009 کو ہوا۔ انھوں نے متعدد اخباروں میں مختلف عہدوں پر رہ کر خدمات انجام دی تھیں۔ انھوں نے اپنے اخبارات بھی نکالے تھے۔ انھیں صحافتی حلقوں میں پیدائشی صحافی کہا جاتا تھا۔ وہ صحافی کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ صحافت میں داخل ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے راولپنڈی کے اخبار ''بندے ماترم'' میں ایک نمائندہ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اس کے بعد وہ امرتسر کے اخباروں ''سناتن دھرم'' اور ''ارجن'' میں کام کرنے لگے۔ ان اخباروں میں انھوں نے معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد پھر بندے ماترم میں چلے گئے اور اس اخبار میں انھوں نے جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ انھیں اپنا اخبار نکالنا چاہیے۔ اس دوران مختلف اخباروں میں کام کرنے سے ان کو اخبار نویسی کا خاصا تجربہ حاصل ہو گیا۔ لہٰذا انھوں نے 1935 میں اپنا ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جس کا نام ''پیشوا'' تھا۔ لیکن وہ اپنے اخبار سے مطمئن نہیں تھے اس لیے 1935 میں انھوں نے لاہور کے ''ویر بھارت'' کو جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے جوائن کر لیا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی اخباروں میں کام کرتے رہے۔ بالآخر 1945 میں وہ دہلی آ گئے۔

یہاں انھوں نے روزنامہ ''تیج'' جوائن کیا اور اس کے ساتھ ہی فری پریس جرنل بمبئی کے نامہ نگار بھی بن گئے۔ وہ جولائی 1947 سے اکتوبر 1955 تک تیج اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ اپریل 1956 میں انھوں نے پھر اپنا ایک اخبار نکالا جس کا نام ''سویرا'' تھا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا جسے انھوں نے بعد میں روزنامہ کر دیا۔ سویرا کا دفتر دریا گنج کے پٹودی ہاؤس میں آریہ اناتھالیہ کے

احاطے میں تھا۔ اس کا سنڈے ایڈیشن باتصویر ہوتا تھا۔ یہ اخبار 1989 تک شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے 1975 سے 1983 تک لاہور کے روزنامہ ''نوائے وقت'' کے لیے کالم نگاری کی۔ اس کے بعد انھوں نے کراچی کے روزنامہ ''جنگ'' اور اخبار ڈیلی نیوز کے لیے بھی کام کیا۔ اس دوران وہ انگلینڈ چلے گئے جہاں سے ایک سال تک لکھنؤ کے اخبار پائنیر کے لیے نمائندگی کی۔ وہ چونکہ انگریزی پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے انگریزی اخباروں کے لیے بھی کام کرتے رہے۔

جمنا داس اختر مختلف صحافتی انجمنوں میں متعدد عہدوں پر بھی رہے۔ وہ ٹریڈ یونین لیڈر بھی رہے اور ایک عرصے تک اس کے عہدیدار رہے۔ ان کا تعلق آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس سے بھی تھا۔ تقسیم وطن سے ان کے دل و ذہن پر بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن قابل ذکر اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان کے دل میں ذرا بھی متعصبانہ جذبات نہیں تھے اور وہ تقسیم کے ماروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہے۔ اس دور میں دونوں ملکوں کی بہت سی خواتین کا اغوا کیا گیا تھا، ہندو اور مسلم دونوں مذاہب کی خواتین کا۔ وہ ایسی خواتین کی باز آبادکاری میں مصروف ہو گئے اور بہت سی عورتوں کو عزت کے ساتھ بسایا۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلم عورتوں کو پاکستان سے دہلی آنے والے بہت سے ہندوؤں کے قبضے سے چھڑایا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے قحبہ خانوں سے بھی عورتوں کو آزاد کروایا اور ایک اطلاع کے مطابق دہلی میں واقع بازار حسن جی بی روڈ سے دو ہزار سے زائد خواتین کو عصمت فروشی کے دلدل سے باہر نکالا۔ اس بارے میں ان کو اپنی جان بھی خطرے میں ڈالنی پڑتی تھی اور قانونی چکروں میں بھی الجھنا پڑتا تھا لیکن انھوں نے ایسی ستم رسیدہ خواتین کو آزاد کرانے سے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔

جمنا داس اختر نے بزرگ صحافی جی ڈی چندن کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا ہے کہ'' پیدائش کے لحاظ سے میں دت ہوں۔ ہمارے بزرگوں نے کربلا کی جنگ میں حصہ لیا تھا اس لیے ہمیں حسینی برہمن کہا جاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں محرم کے دنوں میں مرد سیاہ لباس پہن کر امام باڑے میں جاتے ہیں۔ تعزیہ داری میں حصہ لیتے ہیں۔ یوم عاشورہ کو آج بھی ہمارے خاندان میں برت رکھا جاتا ہے''۔

ان کے مطابق ۱۷ سال کی عمر میں وہ ویدانت سے متاثر ہوئے اور یکسوئی کی حالت میں انھیں مسرت آمیز تجربہ ہوا تھا۔ انھوں نے لاہور جا کر اس کا ذکر علامہ اقبال سے کیا تو انھوں نے کہا کہ بیٹے تم غلطی کر رہے ہو۔ ایسی باتوں کا ذکر کسی سے نہیں کرنا چاہیے۔

تقسیم ملک سے قبل ان کا زیادہ تر قیام لاہور میں رہا۔ امرتسر میں ''سناتن دھرم پر چارک'' اور ''ارجن'' کے مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد انھوں نے راولپنڈی سے ہفت روزہ ''پیشوا'' نکالا تھا۔ مگر اس کا پرنٹر پبلشر حکومت کا پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بضد تھا اس لیے انھوں نے اس سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اخبار ''برہم رشی'' سے اس لیے علاحدگی اختیار کی کہ وہ انتہائی قدامت پرست اخبار تھا۔ اس کے بعد انھوں نے تقسیم ملک سے قبل بندے ماترم، بھارت ماتا، ویر بھارت، ملاپ اور جے ہند میں جوائنٹ ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ لاہور میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکھرجی کے اخبار نیشنلسٹ میں بھی کام کیا تھا۔ انھوں نے مجلس احرار کی تحریک کشمیر اور کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔

قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا غلام احمد قادیانی کو چیلنج کرنے والے مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ ان کے مطابق مولانا امرتسری سے متاثر ہو کر انھوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اخبار ''اہلحدیث'' کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ وہ ثنائی برقی پریس کے مالک بھی تھے۔ وہ تقریباً روزانہ سناتن دھرم پر چارک کے پریس میں جاتے تھے۔ وہیں اختر صاحب سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ مولانا ثناء اللہ کے بزرگ منتوذات کے کشمیری برہمن تھے۔ یہ خاندان کسی وقت نہرو اور سپرو خاندان کے بہت قریب ہوا کرتا تھا۔ مولانا کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔

بندے ماترم کے چیف ایڈیٹر لالہ فیروز چند تھے۔ وہ جمنا داس اختر پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور ان کے کہنے پر وہ ایڈیٹوریل بھی لکھا کرتے تھے۔ بعد میں انھیں اس اخبار کا نیوز ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ بعد میں چل کر ان کا پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں اردو صحافت کی ٹریننگ دینے کے لیے بطور لیکچرر تقرر ہو گیا۔ وہ گیارہ سال تک یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔

جمنا داس اختر ایک اصول پسند صحافی تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوددار اور غیرت مند انسان بھی تھے۔ ان کے اندر انسانیت نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک واقعہ بتایا ہے کہ 1946 میں کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ بلند کیا۔ میں ان دنوں ایک مشہور روزنامہ کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا۔ اس کا چیف ایڈیٹر سی آئی ڈی کا مخبر تھا۔ اس نے ہندی ملاپ کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کو گرفتار کرا دیا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر ہندی کے مشہور شاعر کھیم چند سمن تھے۔ ان کے یہاں کانگریس تحریک کے لیڈر شری نند مشرا دہرہ دون سے آکر ٹھہرے تھے۔ وہ

پنجاب اور سرحد میں باغیانہ سرگرمیوں کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے انھیں بھی گرفتار کروا دیا۔ امرتسر کے میونسپل کمشنر مسٹر چوپڑا اور انقلابی صحافی بلدیو متر بجلی کو بھی گرفتار کروا دیا گیا۔ مجھے اس قدر صدمہ پہنچا کہ رات کو آخری کاپی بھیج کر میں نے چار سطر کا ایک خط مالک کے نام لکھ کر استعفیٰ دے دیا اور لکھ دیا کہ کل سے کام پر نہیں آؤں گا۔ مالکان جاننا چاہتے تھے کہ استعفیٰ کا سبب کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وجہ بتاؤں اور گرفتار ہو جاؤں۔ کئی دنوں کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے وجہ بتائی تو میرے مالک نے کہا ''تم نے آج یہ بات بتائی مگر مجھے تو پندرہ سال سے معلوم ہے کہ میرا ایڈیٹر سی آئی ڈی کا مخبر ہے۔ تاہم میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا دفتر آریہ سماج یا کانگریس کا دفتر نہیں ہے''۔ میں سکتے میں آ گیا۔ میرا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ ایک ماہ کی تنخواہ اور پراویڈنٹ فنڈ ضبط کر لیا گیا۔ دنیا میرے لیے تاریک ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد مجھے ایک اور اخبار میں 90 روپے ماہانہ پر ملازمت ملی۔ جبکہ جس اخبار سے استعفیٰ دیا تھا وہاں ساڑھے چار سو روپے ملتے تھے۔ اس دوران مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی گئی۔ میرے مکان پر چھاپہ مارا گیا۔ میری ڈاک سنسر کی گئی اور میری ٹائپ مشین اٹھا لے جائی گئی۔ جس اخبار سے میں نے استعفیٰ دیا تھا اس کا مالک دہلی میں پہلے کسی ملک کے ایک سفارت خانہ سے اور بعد میں اس کے مخالف سفارت خانہ سے رقوم وصول کرتا تھا۔

ایک اخبار نویس کو کام کے دوران مختلف قسم کے تجربات ہوتے ہیں۔ جمنا داس اختر ایک بڑے صحافی تھے لہٰذا انھیں بھی خوب تجربات ہوئے۔ وہ ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملک کی تقسیم سے قبل میں نے احراری رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف سر سکندر حیات کی حکومت کی طرف سے ہائی کورٹ میں دائر کیے گئے اس تاریخی مقدمہ کی لفظ بہ لفظ رپورٹنگ کی تھی جس کا مقصد شاہ صاحب کو موت کی سزا دلانا تھا۔ یہ رپورٹ روزنامہ ملاپ میں بارہ تیرہ صفحات پر شائع ہوتی تھی۔ انھی دنوں پنڈت ملکھی رام لاہور میں چوٹی کے رپورٹر مانے جاتے تھے۔ ایک رات جب ملاپ کی آخری کاپی پریس جا رہی تھی پنڈت جی دفتر میں تشریف لائے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں انھیں ایک سو روپے دے دوں تو وہ ایسی سنسنی خیز خبر دیں گے جو ملاپ کے سوا کسی اور اخبار میں شائع نہیں ہوگی۔ کافی پس و پیش کے بعد میں رضامند ہو گیا۔ کچھ دیر قبل ہی پلازہ سنیما کے پاس رائے بہادر بیلی رام کا قتل ہوا تھا۔ یہ خبر واقعی ملاپ کے سوا کسی اور اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ اخبار کی آخری کاپی پریس بھیج کر میں نے پنڈت جی کو اپنی

سائیکل پر بٹھایا۔رات میں ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔موری گیٹ سے کرشنا نگر جا کر اپنے مکان کا دروازہ کھلوایا اور بیوی سے ایک سو روپے لے کر پنڈت جی کو دیے۔انھیں پھر سائیکل پر بٹھا کر شہر میں ان کے مکان پر پہنچا کر رات میں تقریباً ڈھائی بجے واپس آیا۔

اردو صحافت کے بارے میں جمنا داس اختر کے خیالات قابل قدر ہیں۔ان کے نزدیک اردو صحافت نے جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔اس حوالے سے انھوں نے ایک تفصیلی مضمون بھی قلم بند کیا ہے جسے مختلف اخباروں اور رسالوں نے شائع کیا ہے۔ان کے خیال میں آزادی کے حصول کے بعد ملک کے اروو اخباروں کو متعدد قسم کے مسائل کا سامنا ہے۔اردو اخبارات آج بھی جمہوریت اور سیکولرزم کے حامی ہیں۔لیکن ان دو الفاظ کو رٹتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔کرپشن،فرقہ پرستی اور سرمایہ پرستی کے خلاف آواز بلند کرنا بھی ضروری ہے۔اس کے بغیر جمہوریت مضبوط نہیں ہو سکتی۔سیکولرزم کا نعرہ الاپنے کے بجائے فرقہ وارانہ ذہنیت کا انسداد کرنا ضروری ہے۔مجموعی طور پر اردو اخبارات کی حالت اچھی نہیں ہے۔اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اردو داں طبقے کی آبادی کم ہو رہی ہے اب کم لوگ اردو پڑھتے ہیں۔

اختر صاحب صحافی تو تھے ہی ایک شاعر اور افسانہ نگار و ناول نگار بھی تھے۔انھوں نے تقریباً تین درجن ناول لکھے تھے اور ایک افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ان کے ناولوں اور افسانوں میں انسانی درد و کرب کی عکاسی ہوتی اور انسانیت کے زوال پر وہ ماتم کناں ہوتے۔اس کے ساتھ ہی سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔وہ ایک ایسے سماج کے قیام کے متمنی تھے جہاں اونچ نیچ بھید بھاؤ اور ایک دوسرے کے ساتھ امتیازی سلوک کا گزر نہ ہو۔

وشو بندھو گپتا ایڈیٹر روزنامہ تیج لکھتے ہیں کہ دہلی آنے سے قبل وہ لاہور میں تیج کے نمائندہ خصوصی تھے۔انھوں نے کشمیر سے لاہور آمد پر تیج کے لیے قائداعظم محمد علی جناح سے ایک خصوصی انٹرویو کیا تھا۔تیج نے مسٹر جناح کے ان الفاظ کو نمایاں انداز میں شائع کیا تھا کہ "مجھے اور گاندھی جی کو دنیا کی کوئی طاقت خرید نہیں سکتی"۔جمنا داس اختر نے ممبئی میں گاندھی جی اور جناح صاحب کے مابین مذاکرات کی تفصیلات خاص ذرائع سے حاصل کر لی تھیں اور یہ رپورٹ دوسرے تمام اخباروں سے دو روز قبل ہی تیج نے شائع کر دی تھی۔انھوں نے شملہ میں کیبنٹ مشن کی کارروائی کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔اس کے علاوہ انھوں نے مسٹر جناح کی تاریخی پریس کانفرنس کی بھی رپورٹنگ کی تھی۔دہلی میں مسٹر جناح اور ماسٹر تارا سنگھ کے مابین ہونے والی بات چیت کی

تفصیلات انھوں نے ماسٹر جی سے حاصل کیں اور تیج اور لاہور کے روزنامہ جے ہند میں شائع کر دیں۔

انھوں نے سوپور کشمیر میں ہونے والی نیشنل کانفرنس کے اس تاریخی اجلاس کی بھی رپورٹنگ کی تھی جس میں نیا کشمیر کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ انھوں نے مولانا آزاد، پنڈت نہرو، خان عبد الغفار خان اور شیخ عبداللہ سے بھی خاص بیانات حاصل کیے تھے۔ انھوں نے تیج کی ادارت کے دوران یہ خبر شائع کر کے سنسنی پھیلادی تھی کہ پاکستان کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو ایک ہفتے کے اندر برطرف کر دیا جائے گا۔ اس خبر کی اشاعت کے تیسرے دن ہی خواجہ صاحب برطرف کر دیے گئے۔

وشوناتھ طاؤس نے اپنے ایک مضمون میں روزنامہ ''جے ہند'' کے آغاز اور اس میں جمنا داس اختر کی شمولیت کا بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے۔ ان کے مطابق 1945 میں پنڈت جواہر لعل نہرو اپنے انتخابی دورے کے سلسلے میں دہلی پہنچے۔ روزنامہ پرتاپ کے مالک اور مدیر مہاشہ کرشن کے بڑے بیٹے اور نریندر کے بڑے بھائی ویریندر سے جو کہ کانگریس کے ایک سرگرم لیڈر تھے، بولے کہ تمھارا اخبار پرتاپ ان کے خلاف بہت لکھتا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پرتاپ میرا اخبار نہیں میرے والد کا اخبار ہے وہی اس کی پالیسی طے کرتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا کہ تم کیوں نہیں ایک اخبار نکال لیتے۔ پنجاب میں اس وقت کانگریس کا کوئی ترجمان اخبار بھی نہیں ہے۔ تم ایک اخبار نکالو تم اس میں ضرور کامیاب ہو گے۔ ویریندر نے اپنے والد مہاشہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ تمھارے اور میرے اخبار کی پالیسی الگ الگ ہوگی اور اس طرح دونوں اخباروں کا ٹکراؤ ہوتا رہے گا جو صحافتی نقطۂ نظر سے ٹھیک نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس وقت حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ چند دنوں کے بعد باپ بیٹے میں پھر یہ معاملہ زیر بحث آیا اور اس بار مہاشہ جی نے اخبار نکالنے کی اجازت دے دی اور اس کے لیے چالیس ہزار روپے بھی دیے لیکن یہ بھی کہا کہ اب آگے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔

ویریندر نے نیتا جی سبھاش چندر بوس کے نعرے کو اختیار کرتے ہوئے اپنے اخبار کا نام ''جے ہند'' رکھا۔ وہ جے ہند کے ناشر اور مدیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے ادارتی عملہ کی سربراہی کے لیے جمنا داس اختر کا انتخاب کیا جو نظریاتی اعتبار سے کانگریسی اور ایک سیکولر آدمی تھے۔ وہ لالہ لاجپت رائے کے اخبار بندے ماترم اور راجہ نریندر ناتھ کے اخبار امر بھارت سے بھی وابستہ

تھے۔ بہر حال انھوں نے جے ہند کو جوائن کرلیا اور جو ادارتی ٹیم بنائی اس میں جگن ناتھ آزاد، انعام اللہ خاں ناصر اور رام لال شامل تھے۔

جمنا داس اختر جب تیج میں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کا انداز کار نرالا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے چند منٹ کے اندر اداریہ لکھ دیتے تھے۔ اس کے بعد ''آج کی تازہ خبر'' کی طرف دھیان دیتے تھے۔ وہ چونکہ ایک تجربہ کار صحافی تھے اس لیے تقریباً روزانہ ہی لیڈ خبر کے انتخاب کی ذمہ داری انہی کی ہوتی تھی۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہت زود نویس تھے اور بیک وقت تین تین کاتبوں کو خبریں دیا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ سب ایڈیٹروں کی غلطیوں کی نہ صرف اصلاح کرتے بلکہ ان کو درگزر بھی کر دیتے۔ تیج کے مدیر معاون ایس ایل سیٹھی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب راج گوپالا چاری نے اپنی ایک الگ سیاسی پارٹی کی تشکیل کی تو انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ہم کانگریس کو Responsible co-operation دیں گے۔ ٹیلی پرنٹر پر یہی الفاظ تھے اور میں نے اس کا ترجمہ ''ذمہ دارانہ تعاون'' کیا تھا جو بظاہر غلط نہیں تھا۔ دوسرے روز شری ہری چند چڈھا اختر صاحب سے ملنے آئے تو انھوں نے خبر پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ خبر نمایاں طور پر شائع تو کی گئی ہے لیکن ''ذمہ دارانہ تعاون'' صحیح نہیں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ''جوابی تعاون'' ہونا چاہیے تھا۔ ٹیلی پرنٹر پر بھی خبر غلط پرنٹ ہوسکتی ہے لیکن سب ایڈیٹر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے خبر کو موقع ومحل کے مطابق صحیح رنگ میں پیش کرے۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

انھیں متعدد نامور شخصیات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ جن میں مولانا ظفر علی، مہاشہ کرشن، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، میلا رام وفا، خوشحال چند خورسند، نانک چند ناز، پریتم ضیائی، رنبیر، گوری شنکر ساگر، مالک رام، رام گوپال متل، ہنس راج رہبر اور رامانند ساگر قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ جمنا داس اختر صحافی کے علاوہ ایک شاعر، ادیب اور ناول نگار بھی تھے۔ ان کے تین درجن ناول شائع ہوئے ہیں جن میں کانٹے، آنسو، آگ، بردہ فروش، کشمیر کی بیٹی، پنجاب کی بیٹی، بنگلہ دیش کی بیٹی، بارہ مولا، رادھا الزبتھ، سونا گاچھی، پاپی، تن کے اجلے من کے میلے، نیل کنٹھ، فرض کا دیوتا، جلن، پائل، بگولے، کالے سائے، کالی گوری، بھوانی جنکشن، بلیک میلر، نیل گگن، کچے دھاگے، عجیب لڑکی، کرپشن، پھانسی کی کوٹھری سے اور قاتل قابل

ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد افسانے لکھے۔ فسادات کی ڈائری لکھی جس کا نام تھا'' اور خدا مر گیا''۔ ان میں سے متعدد ناولوں کے تین تین اور چار چار زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں۔

◆◆◆

جاوید حبیب

جاوید حبیب 1948 میں راجستھان کے مردم خیز شہر ٹونک میں پیدا ہوئے اور 11 اکتوبر 2012 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد حبیب الدین مرحوم ٹونک کے ایک ممتاز قانون داں اور شہر کے ایک باوقار شخص تھے۔ جاوید حبیب نے ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں پائی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں 1968 میں داخلہ لیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے ایک ممتاز طالب علم کے طور پر اسی وقت سے معروف ہو چکے تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی تنظیم کی ایک اہم کڑی ثابت ہوئے اور بعد میں اسٹوڈنٹ یونین کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ الیکشن تو انھوں نے ایک بار ہی جیتا لیکن نو دس سال کے عرصے میں جن لوگوں سے یونین پہچانی جاتی رہی، ان میں ان کا نام بہت نمایاں تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لیے بھی ان کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔

انھوں نے علی گڑھ سے دہلی آکر سب سے پہلے مسلم یوتھ کنونشن کی داغ بیل ڈالی۔ وہ ملت کے نوجوانوں کو یکجا کر کے انھیں ایک ایسی لڑی میں پرونا چاہتے تھے جس کے ذریعے ان سے ملک وملت کی فلاح کا کام لیا جا سکے۔ انھوں نے دہلی کے مسلم علاقہ جامعہ نگر کے ذاکر نگر سے 80 کے عشرے میں ایک بہت معیاری ہفت روزہ اخبار ''ہجوم'' کے نام سے نکالا تھا جس نے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ وآہنگ دیا۔ اس کے بیشتر قلمکار علیگیرین تھے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ وہ اخبار زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ جہاں وہ خود منفرد سوچ کے حامل تھے وہیں انھوں نے ملک وملت کے تعلق سے انفرادی مگر مثبت فکر رکھنے والوں کی ایک ایسی ٹیم تیار کی تھی، جس کا شعار حق گوئی تھا اور ظلم کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں ڈٹ جانا جس کا شیوہ تھا۔ وہ حق گو انسان تھے اور ظلم و نا

انصافی کے آگے جھکنے کو اپنے لیے موت تصور کرتے تھے۔ وہ ایک بے باک، بے خوف اور صاف گو صحافی تو تھے ہی، ایک نڈر اور بے باک مقرر بھی تھے۔ ان کے اندر ملک سے محبت کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کا درد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ملک وملت میں پائی جانے والی برائیوں کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ ان کی ذہنی تربیت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مولانا محمد تقی امینی، مولانا افتخار فریدی جیسے بزرگوں اور مولانا محمد مسلم اور جمیل مہدی جیسے صحافیوں نے کی تھی۔ وہ سب سے زیادہ انہی اکابرین سے متاثر تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار میں بلا کی کشش تھی۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری ان کا شعار تھا۔

جاوید حبیب ہفتہ وار اخبار ہجوم کے ایڈیٹر بھی رہے اور ایک سماجی کارکن کے طور پر بھی اپنا تشخص رکھتے تھے۔ بابری مسجد کا معاملہ جب ایک سنگین شکل اختیار کر رہا تھا تب انھوں نے شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاری، صلاح الدین اویسی اور سید شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ایک زوردار تحریک چلائی۔ وہ قوم وملت کے تئیں بہت حساس تھے نیز مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور اس کے حصول کے لیے پوری قوت وتندہی سے کوشاں رہتے تھے۔ ان کے اخبار کو اس زمانے میں خاصی مقبولیت بھی ملی۔ وہ ملت کے ایشوز پر مسلسل لکھتے اور بولتے رہے اور حکمراں طبقے کو جھنجھوڑنے کا کام کرتے رہے۔

جاوید حبیب قلم کے دھنی تھے۔ ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ طالب علمی کے دور اول میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی جس کا نام تھا ''لیکن کتاب اچھی ہے''۔ یہ کتاب ٹونک کی ثقافت اور خاص طور پر جاوید حبیب کے ہم عمروں اور ہم عصروں کے ذکرو اشغال سے عبارت تھی۔ وہ یونین کے ترجمان ''علیگیرین'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی وفات کے بعد انھوں نے اردو میں ایک کتاب ''ڈاکٹر فریدی: ساحل سے طوفان تک'' لکھی۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ قائد ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی پر پہلی کتاب تھی۔

جاوید حبیب ایک طوفان بردوش اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ بہت زیادہ عمر نہیں پائی لیکن جتنی بھی پائی اس کو اگر یہ کہا جائے کہ بھرپور انداز میں استعمال کیا تو غلط نہیں ہوگا۔ اگر ہم دنیاوی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ اپنی زندگی میں ناکام رہے لیکن معنوی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کامیاب رہے۔ ہاں انھوں نے کوئی دولت نہیں کمائی، کوئی

جائیداد نہیں بنائی، کوئی جاگیر نہیں کھڑی کی، کوئی بینک بیلنس نہیں بنایا، کوئی گاڑی نہیں خریدی اور شان و شوکت اور کروفر نہیں اپنایا۔ لیکن انھوں نے اپنے ضمیر سے سودا نہیں کیا، اپنے اصولوں کو مفادات کی قربان گاہ پر قربان نہیں کیا، ملت کی عزت و ناموس کو سکوں کے عوض فروخت نہیں کیا۔ اگر چہ ان پر بابری مسجد انہدام کے تعلق سے کچھ الزامات لگے لیکن یہ الزامات ان لوگوں نے عائد کیے جو یا تو ان کی ایثار پسندی اور ملت نوازی سے کماحقہٗ واقف نہیں تھے یا پھر جو ان سے بغض اور کینہ رکھتے تھے۔ اگر بابری مسجد کا سودا ہی کرنا ہوتا تو وہ یوں زندگی نہیں گزارتے۔ وہ بھی شان و شوکت سے رہتے اور دنیاوی عیش و عشرت کو گلے لگا کر دنیاوی اعتبار سے سماج اور معاشرے میں سرخرو ہوتے۔

وہ دنیا پرست آدمی نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو ملک کے تین تین وزرائے اعظم سے دوستانہ مراسم کے باوجود اپنی اہلیہ کے مکان میں نہیں رہتے۔ وہ ذاکر نگر کی تنگ و تاریک گلیوں میں زندگی نہیں گزارتے۔ وہ آٹو اور ٹیکسی پر نہیں چلتے۔ ان کے پاس بھی اپنی گاڑی ہوتی، اپنی کوٹھی ہوتی اور کسی پوش کالونی میں ان کی رہائش ہوتی۔ انھوں نے جب مسلم یوتھ کونشن بنایا یا جب وہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ترجمان رہے یا جب انھوں نے بھارتی مجلس بنائی، کبھی بھی اپنے فرض سے غداری نہیں کی، کبھی بھی ملت کو دھوکہ نہیں دیا اور کبھی بھی اپنی خودداری و غیرت مندی سے سودا نہیں کیا۔

انھوں نے صرف صحافت ہی نہیں کی بلکہ سیاست بھی کی۔ لیکن منفرد انداز کی سیاست۔ ایسی سیاست جس میں جھوٹ اور مکر و فریب کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاست ایک مقدس اور پاکیزہ پیشہ بنے نہ کہ غنڈہ گردی اور بدمعاشی کا اڈہ۔ وہ ٹاڈا قیدیوں کے لیے بھی بہت فکر مند رہا کرتے تھے۔ ان کے لیے تحریک چلاتے رہے اور ان کی رہائی کی کوششیں کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے راقم الحروف کے ذمہ بھی ایک کام سونپا تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کسی سے مفت کام نہیں لیتے۔ وہ اس حدیث کے قائل تھے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی اس کو مزدوری ادا کر دی جائے۔ اس حدیث پر ان کا عمل اتنا پختہ تھا کہ وہ مزدوری کے دوران ہی مزدوری ادا کر دیا کرتے تھے۔ یعنی اگر کسی سے کوئی کام لیتے تو اگر ان کے پاس پیسہ ہے تو کام کے پہلے ہی پیشگی معاوضہ ادا کر دیتے ورنہ کام کے دوران ہی انتظام کر کے دے دیتے۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتے کہ جب کام ہو جائے گا تب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ انھوں نے ذاکر نگر کی طوبیٰ

کالونی کے لیے بھی تحریک چلائی تھی اور وہاں آباد غریب مسلمانوں کو اجڑنے سے بچایا تھا۔

انھیں تقریر اور خطابت کا ملکہ حاصل تھا۔ جب وہ بولتے تو دل چاہتا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم ان کو سنتے رہیں۔ راقم الحروف اکثر و بیشتر ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرتا اور ہر ملاقات میں ان کے بارے میں ایک نیا تاثر لے کر اٹھتا۔ وہ اپنی گفتگو میں ملت کی زبوں حالی پر اشک فشانی تو کرتے لیکن ملت کے نام نہاد مسیحاؤں اور ٹھیکیداروں کو آڑے ہاتھوں بھی لیتے۔ ان کے انتقال سے غالباً پندرہ روز قبل جب ان سے ملاقات ہوئی تھی جو آخری ثابت ہوئی تو اس ملاقات میں بھی انھوں نے ملت کے لیے دعائیں کیں اور ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ بھی اللہ سے یہ دعا کریں کہ وہ ملت کے ٹھیکیداروں کو عقل سلیم عطا کرے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے۔ لیکن ایسے مواقع پر ان کا اندرونی کرب لاکھ چھپانے کے باوجود ظاہر ہو جاتا۔ وہ دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے میں نہیں بلکہ اپنے عیوب دیکھنے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے اندر خود احتسابی کی مشکل عادت موجود تھی۔ وہ گفتگو کے دوران یہ بات ضرور کہتے کہ ہمیں اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے اور ملت کے مسائل کو حل کرنے کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔

وہ ایک خوددار انسان تھے۔ سابق وزرائے اعظم وی پی سنگھ رہے ہوں یا نرسمہا راؤ یا پھر اٹل بہاری واجپئی، انھوں نے کسی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ان تینوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ ملت اسلامیہ مصائب میں گرفتار ہے میں دنیاوی عیش و عشرت میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ اگر وہ چاہتے تو مذکورہ شخصیات سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے اور پر تعیش زندگی گزارتے۔ لیکن ان کی خودداری اور غیرت مندی نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی۔

◆◆◆

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی 27 دسمبر 1878 کو بستی حضرت نظام الدین میں پیدا ہوئے اور 31 جولائی 1955 کو بستی حضرت نظام الدین میں ان کا انتقال ہوا اور درگاہ حضرت نظام الدین میں دفن کیے گئے۔ ان کا پیدائشی نام قاسم علی تھا۔ ان کے ماموں بہادر علی شاہ بچپن میں انھیں علی حسن کہہ کر پکارتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہی نام زبانوں پر چڑھ گیا۔ وہ ابتدائے عمر میں سید علی حسن ہوئے اور پھر سید علی حسن نظامی کہلائے۔ اسی نام سے انھوں نے اردو میں پہلا مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''انڈیا کی نازک حالت'' اور وہ انڈیا گزٹ بمبئی میں شائع ہوا۔ دھیرے دھیرے انھوں نے مضامین لکھنے کا سلسلہ تیز کیا۔ پھر وہ خواجہ حسن نظامی ہو گئے اور بالآخر اپنی تحریروں کی بدولت ''شمس العلما، مصور فطرت، حضرت خواجہ حسن نظامی'' کہلائے۔

عسرت اور تنگ دستی نے خواجہ صاحب کے ہاتھ میں قلم پکڑایا تھا۔ وہ تھے تو پیرزادے لیکن حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر آنے والے نذر و نیاز سے انھیں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے والد کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کہ بیٹے محنت کی روزی تلاش کرنا، کبھی بھی اس جانب للچائی نظریں نہیں اٹھائیں۔ ابتدائے عمر میں انھیں ایک بہت مخلص انسان ملے جن کا نام غلام نظام الدین خاکسار نظامی تھا۔ دلی میں ان کی کتابوں کی دوکان تھی۔ انھوں نے ہی خواجہ صاحب کو مضمون نویسی کی جانب مائل کیا۔ ایک طرف وہ مضمون لکھتے اور دوسری طرف پندرہ بیس کلو کا کتابوں کا وزنی گٹھر سر پر رکھ کر گھوم گھوم کر کتابیں بیچتے۔ وہ نظام الدین سے یہ گٹھر سر پر رکھے فصیل بند شہر جاتے اور پھر اسی طرح پیدل چل کر واپس آتے۔ رفتہ رفتہ ان کے مضامین ملک کے ممتاز اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے۔ پھر تو جوان کا اشہب قلم دوڑا ہے تو کم از کم پچاس سال

تک بلا تکان دوڑتا رہا۔ اس نصف صدی کے دوران انھوں نے اتنا کچھ لکھا کہ اس کی صحیح تعداد کوئی نہیں بتا پاتا۔ عام روایتوں کے مطابق ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد تین سو ہے۔ جبکہ ان کے ہم مجلس دہم کار اوران کے علم وفضل سے فیض یافتہ مفتی شوکت علی فہمی، ایڈیٹر ''دین دنیا'' کہتے ہیں کہ ان کی تصانیف کی تعداد پانچ سو ہے اوران کے ایک بہت بڑے عقیدت منداور صاحب علم و کمال پروفیسر نثاراحمد فاروقی کے مطابق انھوں نے کتنا لکھا ہے یہ بتا پانا ناممکن ہے۔ بہر حال انھی تصانیف میں دو سفرنامے، مضامین کے مجموعے اور بچوں کی کہانیوں کے مجموعے بھی شامل ہیں۔

دھیرے دھیرے خواجہ صاحب کے عقید تمند بھی پیدا ہونے لگے اور وہ اپنے ہاتھ پر لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے۔ چالیس سال کی عمر تک ان کے مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ دہلی کے صاحب طرز ادیب وقلمکار شاہد احمد دہلوی عام روایتوں کے حوالے سے ان کے مریدوں کی تعداد تین لاکھ بتاتے ہیں۔ اس دوران انھوں نے مختلف مقامات پر مختلف اخباروں میں کام بھی کیا اور خود اپنا اخبار اور رسالہ نکالا۔ بعد میں وہ کتابیں بھی لکھنے لگے اور اپنی کتابیں خود چھاپنے لگے۔ ان کی پہلی شائع شدہ کتاب کا نام ''مفلسی کا مجرب علاج'' ہے۔ اس کے بعد ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں ''غدر دہلی کے افسانے'' اور ''بیگمات کے آنسو'' بہت مقبول ہوئیں۔ اول الذکر کتاب بارہ حصوں میں ہے۔ اس میں انھوں نے افسانہ و تاریخ کی آمیزش کر کے خاندان مغلیہ کے زوال اور عبرت ناک انجام کی داستانوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد برطانوی حکمرانوں نے انتقامی کارروائی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان لرزہ خیز داستانوں کو خواجہ صاحب نے بھی سنا تھا اور یہ جان کر ان کو بہت دکھ پہنچا تھا کہ اچھے اچھے اور اعلیٰ خاندانوں کے افراد محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان واقعات کو بھی انھوں نے کتابی شکل دی۔ وہ زندگی بھر زوال مغلیہ کی داستانیں لوگوں کو سناتے رہے۔

خواجہ صاحب ایک صاحب طرز انشا پرداز اور منفرد ادیب وقلمکار تھے۔ انھوں نے جو اسلوب نگارش اختیار کیا تھا وہ خالصتاً ان کا اپنا تھا۔ اس میں کسی دوسرے قلم کار کے طرز کی ملاوٹ نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج تک کوئی دوسرا ان کے اسلوب نگارش کی نقل بھی نہیں کر سکا۔ وہ اردو زبان کے ایک شہسوار تھے۔ یہ زبان ان کے قلم کے ذریعے اپنی تمام تر توانائیوں اور وسعتوں کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ موضوع پر تو سب لکھتے ہیں وہ بغیر موضوع کے لکھتے تھے۔ البتہ مضمون کے عنوان پر گھنٹوں غور کرتے اور جب ایک اچھوتا عنوان ان کے ذہن میں

آ جاتا تو وہ فنافٹ مضمون بھی قلم بند کر دیتے۔ وہ بے تکان لکھتے۔ ان کی قوت مشاہدہ بھی بہت تیز تھی اور قوت متخیلہ بھی۔ وہ کہیں سے سرسری بھی گزر جائیں، اپنے تاثرات ایسی جزئیات کے ساتھ بیان کرتے کہ حیرت ہوتی۔ وہ کسی بھی واقعہ کو تخیلات کی بنیاد پر اس طرح لکھ دیتے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خیال میں '' ان کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے مگر اصل میں وہ اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگر چہ فکر وتراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن وہ اسے اس خوبی سے چھپا جاتے ہیں کہ اس پر بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو ہو جاتا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں۔ مگر اس کے بجائے سوز وگداز ہے۔ مرزا کے فقرے ظرافت کے ساتھ محبت میں گھلے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے مضامین درد سے بھرے ہوتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریر دراصل '' از دل ریزد بر دل خیزد' والی کیفیت رکھتی ہے۔ وہ دل سے اٹھتی ہے اور سیدھے دل پر اثر کرتی ہے اور کسی مصنوعی بات کا اثر دل پر نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی بات کا جس میں تصنع کی آمیزش ہو۔ ان کی تحریروں میں حکیمانہ اور فلسفیانہ نکات کی تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوگی۔ لیکن اہل دل کو ان کی باتوں میں بہت مزا آتا ہے۔ دردِ دل اور عشق ومحبت کی پونجی رکھنے والوں کے نزدیک ان کی تحریریں بیش قیمت ہیں۔ مولوی عبدالحق مزید کہتے ہیں '' معترض یہ پوچھتا ہے کہ خواجہ صاحب چاہتے کیا ہیں؟ ان کا مشن کیا ہے؟ (ان کی تحریر کی) کیا کوئی خاص غرض وغایت بھی ہے یا یوں ہی تک بے تک جو جی میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ 'میں مدینہ نگری سے پریم کا سندیسہ لایا ہوں' اور پھر چپ ہو جاتے ہیں''۔

کتابوں کی دوکان سے خواجہ صاحب کو بڑا فیض پہنچا۔ اسی کے توسط سے انھوں نے مولا عبدالحلیم شرر کے ناول پڑھے جس سے ان کو انشا پردازی کا چسکہ لگا۔ خواجہ حسن نظامی اپنے بارے میں لکھتے ہیں '' شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شرر کی تحریریں میری لفظی استاد ہیں اور فطرت معنوی استاد۔ ان کی تحریروں سے میں نے مضامین کی بندش سیکھی اور فطرت و مشاہدۂ قدرت نے معنوی اثر عنایت کیا''۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ '' اگر مجھ میں کسی کو کچھ آدمیت نظر آئے تو وہ اسے مولانا اکبرالٰہ آبادی کا عکس سمجھے، میرا اپنا کچھ نہیں ہے''۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی

ہے۔

اپنے زمانے کے بے مثل ادیب ملا واحدی دہلوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''حضرت صاحب پیرزادے ہیں اور خود صاحبِ سلسلہ وارشاد ہیں۔ انھیں طبیعت کی موزونی ورثہ میں ملی ہے۔ کیونکہ تمام صوفیائے کرام اسرارِ تصوف کو ہمیشہ اشعار کی رنگینی اور لٹریچر کی تاثیروں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ خواجہ صاحب شاید پہلے صوفی ہیں جنھوں نے نثر میں تصوف کے ولولے اور جذبات کو نظم کے انداز سے بھی بڑھ کر لکھا۔ وہ شعر نہیں کہتے لیکن بعض مضامین میں قافیہ بندی کی شان گواہی دیتی ہے کہ وہ کوشش کرتے تو بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے۔ علامہ شبلی مرحوم سچ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب نثر میں ایسی بے نظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آجکل کی نظموں میں بہت کم پایا جاتا ہے''۔

خواجہ حسن نظامی کی مضمون نویسی کا بس ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے تصوف کی اشاعت۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے جتنی بھی خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اس لیے کی ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابیں نہیں پڑھتے یا ان کتابوں کی قدیمی طرزِ تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جارہے ہیں، وہ میرے نئے اندازِ تحریر سے اِدھر راغب ہوں اور کیفِ روحانی سے فائدہ اٹھائیں۔ اِسی مقصد کے تحت انھوں نے رسالہ ''نظام المشائخ'' جاری کیا تھا جو بہت دنوں تک نکلتا رہا۔ اِس رسالے کی پیروی کرتے ہوئے تصوف پر بعد میں کئی رسالے نکلے۔

خواجہ صاحب کی تحریر بڑی پر اثر ہوتی ہے اور اُس میں بڑا نرالا اور انوکھا پن ہے۔ اِس کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ وہ وہی لکھتے جو دل پر طاری ہوتا۔ اسی لیے ان کا لکھا ہوا فوری طور پر دل پر اثر کر جاتا۔ وہ نہایت آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں لکھتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو اردو کا دشمن سمجھتے ہیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو اردو کے گلے پر کند چھری چلانے سے تشبیہ دیتے تھے۔ وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں وہ بجائے خود ایسے ہوتے ہیں جو طبیعتوں کو کھینچتے ہیں، اُن میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ وہ کوئی بھی مضمون لکھنے سے قبل اُس کے عنوان پر خوب غور کرتے۔ بعض اوقات تو وہ گھنٹوں گھنٹوں عنوان ہی پر سوچا کرتے اور جب وہ اِس کیفیت میں مبتلا ہوتے تو اپنے آس پاس سے بے خبر و بے نیاز ہو جاتے۔ خواجہ صاحب مردم شناس تو تھے ہی، وقت اور موقع شناس بھی تھے۔ جب کوئی مسئلہ عوام میں بری طرح چھا جاتا تو وہ اسی کو موضوع بناتے اور بالکل منفرد انداز

میں لکھتے۔ ان کی یہ انفرادیت صرف اپنی تحریروں تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اگر کسی کی بات کو دوہراتے تو اُسے بھی یکسر منفرد انداز میں کہتے۔ بات تو وہی ہوتی لیکن زبان ان کی اپنی ہوتی۔ وہ انشا پردازی میں کسی کے مقلد نہیں تھے۔ اس معاملے میں وہ غیر مقلد تھے اور ان کی یہی خوبی ان کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ خود کہتے تھے کہ میں کسی اچھے برے کی پیروی نہیں کرتا جو کہتا ہوں خود کہتا ہوں اور اپنی بات نکالتا ہوں۔

مولوی عبدالحق ان کی تحریروں کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے مطابق ''ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں کیا پڑھوں؟ میں نے کہا کہ اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے''۔

وہ ایک صحافی بھی تھے اور صحافیوں اور قلم کاروں کو عموماً یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے جبھی تو مولانا آزاد صبح کے تین بجے اٹھ کر قلم اور کاغذ سنبھال لیتے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی اس معاملے میں بھی دوسروں سے منفرد تھے۔ وہ اُسی وقت کچھ لکھ پاتے جب بہت زیادہ شور ہو رہا ہو۔ ہاں وہ پان کے شوقین تھے۔ جب بھی کچھ لکھنا ہو تو پان کی ڈبیہ اُن کے پاس ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایک گراموفون خریدا تھا اور بقول ملا واحدی انھوں نے مضمون لکھنے میں مدد دینے کے لیے ہی اسے خریدا تھا۔ باجہ بج رہا ہو تو وہ دور بیٹھ کر بہت اچھا مضمون لکھ لیتے تھے۔ کوئی دوسرا آدمی اسے بجاتا جاتا اور وہ مضمون لکھتے جاتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خواجہ صاحب کا شہرۂ آفاق مضمون ''کہو تکبیر'' جو ضبط ہو گیا اور جو کانپور کی مسجد کے سلسلے میں لکھا گیا تھا، اسی طرح معرض وجود میں آیا تھا کہ انھوں نے گراموفون بجوایا اور مضمون لکھا۔

خواجہ حسن نظامی خالص دہلوی تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کے مطابق ''خواجہ صاحب کو دلی کی تاریخ، تہذیب وتمدن، زبان و بیان اور طرز معاشرت سے گہری دلچسپی تھی بلکہ وہ خود ''دہلویت'' کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ جس نسل نے 1947 کے بعد کی دلی دیکھی ہے وہ یہ سمجھتی ہے کہ پھکڑ پن سے بات کرنا، آریا ہے، جاریا ہے کہنا اور تیز مرچوں والی نہاری کھانا ہی دلی والا ہونے کی نشانی ہے۔ میں بھی شاید ایسا ہی سمجھ لیتا مگر خوش قسمتی سے میں نے خواجہ حسن نظامی اور آغا حیدر دہلوی کو بھی دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دلی والے جو دلی کی تہذیب کا نمونہ تھے اب دلی میں نہیں پائے جاتے''۔

ان کے مضامین کے عنوانات بڑے انوکھے ہوتے جن کو دیکھتے ہی قاری مضمون پڑھنا شروع کر دیتا۔ مثال کے طور پر: مست الست کی دعا، آہ یہ خط، آ، طائر سبز بام کا پیام، طائر سیاہ فام، حسن کا فرمان، جھینگر کا جنازہ، رس کے بھرے تورے نین، آغوش مچھر میں شب عید، لیمپ، مٹی کا تیل، خدائی گراموفون، الو، مکھی، من کہ ایک دھوبی کا غذی گھاٹ پر، مرغ کی اذان، تیس راتوں کی شان، پسینہ، ہوتا تو کیا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اب کچھ نمونے ان کی تحریروں سے ملاحظہ فرمائیں:

''بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری و دلداری کے مالک، عرش کی اقامت میں جدا، دل کے گھرانے میں خدا، ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سربلند کر۔ فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما۔ دل میں ٹھکانا ہو تو اسے اپنے رہنے کے قابل بنادے۔ رگِ جاں میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا''۔ (مست الست کی دعا)

''خوشی بن کر آ، غم میں سما کر آ، مگر آ، عید کے چاند میں آ، محرم کے ہلال میں آ، چمک میں جھلک میں تاریکی میں لہریں لے، کڑک سے دل ہلا، لیکن اے آنے کے قابل آ، رمضان کے سناٹے میں آ، تراویح کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھا، افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سنائی دے، اب بھی آ، جس طرح چاہے آ، لیکن آ''۔ (آ)

''یہ بھنبھناتا ہوا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مہمیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے...... انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے، کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اُس وقت حملہ کرتا ہے جب ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ۔ اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع، پیاری ادا کے آدمی کی دشمنی۔ بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔ مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا

ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ ذات صفات نہ دیکھیے۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی، نیچ ذات سہی اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کی ناک میں دم کرتا ہوں۔ یہ سراسر الزام ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ حضرت میں تو کان میں آکر الٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ، اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور...... کل ایک شاہ صاحب اپنے مرید سے فرمارہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے، رات کو خدا کی یاد کا وقت ہے۔ باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں اور حمد و شکر کے گیت گائیں''۔ (مچھر)

اس طرح خواجہ صاحب کسی گرے پڑے اور افتادہ موضوع پر قلم اٹھاتے اور ہلکی پھلکی باتوں سے مضمون کی ابتدا کرنے کے بعد اس میں کوئی نہ کوئی ایسا عارفانہ پہلو نکال لیتے اور ایسی بات کہہ جاتے جو براہ راست جا کر دل پر اثر کر جاتی۔

خواجہ صاحب نے کئی اخباروں میں کام کیا تھا اور اپنے اخبار اور رسالے بھی نکالے تھے۔ انھوں نے 1913 میں میرٹھ کے اخبار ''توحید'' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔ اخباروں میں ''رعیت'' اور رسالوں میں نظام المشائخ، منادی اور صوفی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے منادی 1926 میں جاری کیا تھا۔ وہ اب بھی ان کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی نکالتے ہیں۔ وہ روزنامچہ بھی لکھتے رہے ہیں جو غالباً 1920 سے منادی میں چھپنا شروع ہوا اور اُسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی دوسرے روزنامچے کو نہ مل سکی۔ اُسے بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پڑھتے تھے اور سب کا اُس میں ذکر ہوتا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھڑکے فسادات سے وہ کافی دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ اسی دوران وہ دلی کو خیرباد کہہ کر حیدرآباد چلے گئے لیکن پھر تقریباً ایک سال کے بعد واپس آگئے۔ اس وقت وہ بہت بجھے بجھے رہنے لگے تھے۔ فسادات کے دوران تشدد اور قتل و غارت گری نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ خالص دہلوی تھے۔ دہلوی آن بان اور شان پر مرتے تھے۔ اردو والے تھے۔ اردو تہذیب کے شیدائی تھے اور اردو والوں سے ان کو ٹوٹ کر پیار تھا۔ دہلی سے ان کو کس درجہ دلی لگاؤ تھا اس کا اندازہ آپ اکبرالہ آبادی کے اس شعر سے لگا سکتے ہیں اور اسی شعر پر میں اپنی بات

بھی ختم کرتا ہوں:

حضرت ابوہریرہؓ سے بلّی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھٹ سکی

خواجہ حسن نظامی کی جو کتابیں مقبول ہوئیں ان میں بیگمات کے آنسو، غدر دہلی کے افسانے، دہلی کی آخری شمع، دہلی کی آخری سانس، سی پیرہ دل، سفر نامہ ہندوستان، محرم نامہ، یزید نامہ، بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، جنگ بیتی کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مصر، شام، فلسطین اور سعودی عرب سمیت کئی ملکوں کے دورے بھی کیے تھے۔

◆◆◆

خوشتر گرامی

خوشتر گرامی کی پیدائش اکتوبر 1902 میں سیالکوٹ پنجاب میں ہوئی اور ان کا انتقال 15 جنوری 1988 کو دہلی میں ہوا۔ یوں تو وہ ایک ادیب اور ادبی صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اپنے صحافتی کیریئر کے آغاز میں انھوں نے کئی روزنامہ اور ہفت روزہ اخباروں اور رسالوں میں بھی کام کیا تھا۔ انھوں نے اپنی صحافت کا آغاز لالہ لاجپت رائے کے زیر تربیت کیا اور بعد میں مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' میں بحیثیت رپورٹر خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے لاہور کے مشہور اخبار ''بندے ماترم'' کے شعبۂ ادارت میں بھی خدمات انجام دیں۔

خوشتر گرامی کا اصل نام رام رکھامل چڈھا تھا۔ خوشتر گرامی ان کا قلمی نام تھا جو بعد میں ان کی اصل شناخت ثابت ہوا۔ ان کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور اس سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں کہ انھوں نے ابتدائے عمر میں روزنامہ اخباروں میں کام کیا تھا۔ رام رکھامل چڈھا ایک وطن پرست انسان تھے۔ ہندوستان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''زمیندار'' اور ''بندے ماترم'' میں ان کی تحریریں حب وطن کے جذبات سے سرشار ہوتیں۔ ان اخباروں میں کام کے دوران انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیا اور رپورٹنگ کے علاوہ ڈیسک پر بھی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے خبروں کے ترجمے بھی کیے اور تقریباً وہ تمام کام کیا جو ایک اخبار میں کام کرنے والوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ انھوں نے ان اخباروں میں جو تجربات حاصل کیے ان کا استعمال انھوں نے اپنے ماہنامہ رسالہ ''بیسویں صدی'' میں کیا۔ ان کی تحریروں میں شروع سے ہی طنز و ظرافت کی آمیزش تھی۔ وہ ایک اچھے طنز نگار تھے۔ ان کی اس خوبی کا برملا مشاہدہ ''بیسویں صدی'' میں کیا جاسکتا ہے۔

خوشتر گرامی نے ادبی ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کا آغاز 1937 میں لاہور سے کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دہلی چلے آئے اور دریا گنج سے اسے دوبارہ شروع کیا۔ اس رسالے کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اردو والوں کے نزدیک دریا گنج اور بیسویں صدی لازم وملزوم بن گئے بالکل اسی طرح جیسے خوشتر گرامی اور بیسویں صدی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

وہ ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ سیالکوٹ میں ان کے دادا دیوان گنپت رائے ایک بڑے تاجر اور کاروباری تھے۔ شہر کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تجارت ماند پڑنے لگی اور ان کے والد دیوان بشمبھر ناتھ تک آتے آتے تجارت تقریباً ٹھپ پڑ گئی۔ زبردست خسارہ ہوا اور اس طرح ایک رئیس خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود رام رکھا مل چڈھا کو عسرت وتنگ دستی میں زندگی گزارنی پڑی۔ ابھی ان کی عمر صرف تین سال تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ نے کسی طرح ان کی پرورش کی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی کی حاصل کی لیکن جب وہ پندرہ برس کی عمر کو پہنچے تو والدہ بھی انھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ حالات نے انھیں میٹرک سے آگے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ تاہم انھوں نے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔

بہر حال حالات نے انھیں اس عمر میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا جس عمر میں عام خاندانوں کے لڑکے تعلیمی اداروں میں شب وروز گزارتے ہیں۔ پھر بھی اسے ان کی خوش قسمتی ہی کہا جائے گا کہ جہاں انھیں لالہ لاجپت رائے اور مولانا ظفر علی خاں کے زیر تربیت کام کرنے کا موقع ملا وہیں علامہ اقبال، مولانا تاجور نجیب آبادی، شہید بھگت سنگھ اور مولانا عبدالمجید سالک جیسی شخصیات کی قربت اور شفقت بھی حاصل رہی۔

تقسیم ہند سے قبل دس سال کے عرصے میں بیسویں صدی نے مقبولیت کے عروج پر اپنے قدم رکھ دیے تھے اور اس سے بڑے بڑے شاعر و ادیب وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن تقسیم ملک نے جہاں ہزاروں خاندانوں کو بے گھر کیا وہیں اس نے اس معیاری رسالے کو بھی بے گھر کر دیا۔ لیکن خوشتر گرامی نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے اس کا اپنے ذہن پر کوئی اثر قبول نہیں کیا کہ ان کا دفتر تباہ وبرباد ہوگیا یا پرچے کو نکالنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ وہ دہلی آگئے اور دریا گنج کے مین روڈ پر بیسویں صدی کے لیے ایک دفتر لے لیا۔ اس کے بعد انھوں نے نئے سرے سے اس رسالے کی عمارت تعمیر کی اور پھر 'میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے، مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد

پرواز سے‘ والا معاملہ بن گیا۔ رسالے کو جتنی شہرت و مقبولیت لاہور میں حاصل ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ دہلی میں حاصل ہوئی۔ پھر تو بیسویں صدی ادب کا ایک ٹریڈ مارک بن گیا۔ جو اس رسالے میں چھپ گیا سمجھو ایک مستند ادیب اور شاعر بن گیا۔

رام رکھا مل چڈھا نے بیسویں صدی نکالنے سے قبل اس وقت اپنا نام خوشتر گرامی رکھا تھا جب وہ صحافت سے کوسوں دور تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنی والدہ کا ایک مرثیہ لکھا تھا۔ اس کے بعد ان کے اندر موجود شاعری کا ذوق وشوق پروان چڑھنے لگا اور انھوں نے حب وطن سے سرشار بہت سی قومی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے ایک ادیب اور ادبی صحافی ہونے کا اصل جوہر بیسویں صدی سے کھلا۔ اس رسالے نے اردو ادب کو ایسے ایسے لعل و گہر دیے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس عہد کا کون سا ایسا شاعر اور ادیب تھا جو اس میں چھپنا نہیں چاہتا تھا۔ جب کسی کی غزل یا افسانہ اس میں چھپتا اور اسے اس کی خبر ہوتی تو وہ دوڑا دوڑا بک اسٹال تک جاتا اور رسالہ خرید کر لاتا۔ یہ صورت حال صرف متوسط شاعروں اور ادیبوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اعلیٰ پائے کے شاعر و ادیب کی بھی یہی حالت ہوتی۔ بیسویں صدی کا انتظار نہ صرف ادیبوں کے گھروں میں ہوتا بلکہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور یہاں تک کہ سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی ہوتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے تو شعری و ادبی حصے کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کا انتظار کرتے لیکن سیاسی ذوق رکھنے والے تیر و نشتر اور قلمی چہرہ اور خبر نامہ پڑھنے کے لیے اس کے منتظر رہتے۔ قلمی چہرہ تو اتنا جامع اور دلچسپ ہوتا کہ چند سطروں میں اس شخص کی پوری شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی جس کا قلمی چہرہ لکھا جاتا۔ اسی طرح تیر و نشتر بھی بہت دلچسپ ہوتا۔ پہلے ایک خبر ہوتی اور پھر اس کے جواب میں کوئی جملہ ہوتا جو اتنا بھرپور ہوتا کہ مزا آجاتا۔ ایک کالم سرگوشیاں ہوتا تھا جس میں منتخب سوالوں کے مزیدار جواب دیے جاتے۔ تیر و نشتر میں حکمرانوں اور طاقتور لوگوں کے جبر و ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ایک زبردست آواز ہوتی۔

بیسویں صدی کسی نظریہ کا مبلغ نہیں تھا۔ وہ اگر کسی بات کی تبلیغ کرتا رہا تو وہ معیاری ادب کی تبلیغ کرتا رہا۔ بیسویں صدی کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے اپنے صفحات پر بہت اچھے اچھے ادیبوں کو جنم دیا اور انھیں پروان چڑھنے کا موقع بھی دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں چھپنے والے

قلمکاروں کو معقول اعزازیہ بھی دیا جاتا۔ وہ 1977 تک بیسویں صدی کو نکالتے رہے اور جب پیرانہ سالی کو پہنچے تو ان سے اس رسالے کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایک معقول رقم کے عوض بیسویں صدی رحمٰن نیر کے ہاتھوں بیچ دیا۔ لیکن معروف قلمکار فاروق ارگلی اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خوشتر گرامی نے پرچہ بیچا نہیں بلکہ اسے ایک ایسے ہاتھ کو سونپ دیا جو اسے زندہ رکھنے کا صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ روزنامہ راشٹریہ سہارا 25 دسمبر 2013 کے شمارے میں ایک مضمون ''بیسویں صدی کا افسانوی صحافی: خوشتر گرامی'' میں لکھتے ہیں:

''ان کی محنت اور صلاحیت نے انھیں بے پناہ کامیابی عطا کی۔ قدرت نے انھیں ہر اس خوشی سے نوازا جس کے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن وقت بدل چکا تھا، ہندوستان کی نئی نسلیں اردو سے دور ہو رہی تھیں۔ ان کے بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم پا کر باپ کی ذمہ داری سنبھالنے کے بجائے بیرون ملک کی شاندار ملازمتیں کرنا پسند کیا۔ خوشتر صاحب نے بہت کوشش کی کہ ان کے صاحبزادے کشن کمار پبلشنگ کا کام سنبھال لیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ''نئی صدی'' کے نام سے ہندی بھاشا کا ایک رسالہ بھی شروع کیا لیکن بات نہیں بنی۔ 1975 کا سال آتے آتے ضعیفی اور بیماری نے گھیر لیا۔ جسم ساتھ چھوڑ رہا تھا لیکن بیسویں صدی کی پرورش تو خون جگر سے کی تھی۔ رسالہ ان کی اولاد کی طرح تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے بند نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے رحمٰن نیر مرحوم کے ہاتھوں معقول قیمت پر اسے فروخت کر دیا تھا۔ یہ قطعی غلط ہے۔ دراصل خوشتر صاحب کو بیسویں صدی بیچنا نہیں زندہ رکھنا تھا۔ انھوں نے صرف اتنی رقم قبول کی جتنی ایک پرنٹنگ پریس کو واجب الادا تھی۔ جو اندازاً دو سوا دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ صرف کرسی کی پشت پر لٹکا ہوا اپنا کوٹ پہن کر دریا گنج مین روڈ پر واقع اپنے دفتر سے اتر کر چلے گئے۔ انھیں رحمٰن نیر جیسا باذوق، محنتی اور پرجوش جانشین مل گیا تھا۔ اگر وہ سچ مچ ''بیسویں صدی'' کو فروخت کرتے تو دفتر کا ساز و سامان اور کتابوں کا ذخیرہ ہی لاکھوں کا تھا۔ دفتر کی جگہ کی قیمت اس وقت پندرہ بیس لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ انھوں نے بیسویں صدی فروخت نہیں کیا اسے زندہ رکھنے کے لیے صحیح ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ دنیا نے دیکھا کہ ان کا اندازہ درست تھا۔ رحمٰن نیر نے خوشتر گرامی کے بعد جس شان کے ساتھ بیسویں صدی کی اشاعت کی اس میں خوشتر صاحب کا عکس واضح تھا...... خوشتر گرامی جب تک زندہ رہے ضعیفی اور علالت کے باوجود تیرونشتر لکھتے رہے۔ اپنے پرانے پسندیدہ کارٹونسٹ بلرام سے کارٹون بنواتے رہے۔ سالہا سال

تک وہ رسالہ بیسویں صدی کے مؤسس کے طور پر اپنی اس معنوی اولاد سے وابستہ رہے''۔
بیسویں صدی میں شائع ہونے والے کالم تیر ونشتر اور قلمی چہرہ کے بارے میں بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ چھپتے تو خوشتر گرامی کے نام سے تھے لیکن ان کو لکھنے والے دوسرے تھے۔ لیکن فاروق ارگلی اس کی بھی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کالم خود خوشتر گرامی لکھا کرتے تھے۔ 1974 میں انھوں نے تیر ونشتر کا انتخاب شائع کیا تھا جس میں کالم قلمی چہرہ بھی شامل تھا۔

◆◆◆

(سردار) دیوان سنگھ مفتوں

سردار دیوان سنگھ مفتوں اگست 1890 میں حافظ آباد (گوجرانوالہ) کے کھنہ کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال 26 جنوری 1975 کو ہوا۔ ان کے والد ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ مفتوں 40 دن کے تھے کہ والد چل بسے۔ والد کے ترکہ سے 21 سال تک اخراجات چلتے رہے۔ ان کے ایک بڑے بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ والدہ نے کسی طرح ان کی شادیاں کیں۔ لیکن پھر عسرت و تنگ دستی نے یوں آگھیرا کہ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے دیوان سنگھ کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ لیکن بہر حال گھر کے اخراجات چلانے کے لیے کسی ملازمت کی ضرورت تو تھی ہی۔ لہٰذا 21 سال کی عمر میں حافظ آباد کے ایک ہندو بزاز کے ہاں پانچ روپے ماہوار پر ملازمت ملی۔ دیوان سنگھ کو بزاز کی دوکان پر کام کرتے چند روز گزرے تھے کہ محلے والوں کو پتہ چل گیا۔ ان کی گلی میں ایک امیر برہمن رہتا تھا۔ اس نے کبھی مفتوں کے والد سے رقم لی تھی۔ اب اس نے انھیں بلا کر کہا کہ اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا۔ اس بات کا ذکر مفتوں صاحب نے گھر آ کر والدہ سے کیا۔ والدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا ''لوگ کیا کہیں گے؟ یہ ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے''۔ والد نے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ روپیہ اور پھر زیور ختم ہوا تو گھر کی اشیا فروخت کر کے گزارا ہوا۔ چنانچہ عرصے تک یہ کام جاری رہا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بزاز کے یہاں ملازمت کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کے دھارے کا رخ ہی بدل دیا۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا)۔

انھوں نے اخبار ریاست 1924 میں نکالا اور برسوں اس کی شہرت میں چنداں فرق نہ آنے دیا۔ حق کو اپنایا، مظلوموں کے لیے جائے پناہ بنے۔ تحقیق کرنے کے بعد حمایت کے لیے کمر بستہ

ہو جاتے۔ والیانِ ریاست کے ستائے ہوئے لوگوں کی سنتے۔ بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے حقدار کو اس کا حق دلاتے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، ان کے مظالم، سازشیں، رشوت، حکومت کی چیرہ دستیاں، جیلوں کی زندگی، اخلاقی پستی اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات ان کی زندگی میں پیش آئے۔ 15 بار گرفتار ہوئے۔ پانچ جیلوں کے اسیر رہے۔ لیکن ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں، جتنے مقدمات چلے، اسی قدر ان کی عزت اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ وہ چاہتے تو گھر بیٹھے دولت کا انبار لگا لیتے مگر بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ انھیں متاثر نہ کر سکا۔ انھوں نے صرف پانچویں تک تعلیم حاصل کی تھی۔ حالات نے آگے پڑھنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن ان کے شوق، محنت، عزم اور شب و روز کے مطالعے نے انھیں صحافت کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا اور ان کے اخبار کو آزادیٔ رائے، بے لاگ تنقید اور زورِ بیان بخشا۔ وہ خود کامیابی کا راز محنت اور صرف محنت اور کام کی لگن میں سمجھتے تھے۔

وہ ایک کہنہ مشق اور کامیاب ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ جن لوگوں نے ان کا اخبار پڑھا ہے، انھیں آج بھی مفتوں کا اندازِ بیان یاد ہوگا۔ سیدھے سادے، بے تکلف انداز میں صحیح تصویر کھینچ کر قارئین کو متاثر کر دیتے۔ اخبار میں ''ناقابلِ فراموش'' کالم کے تحت مضامین شائع ہونے لگے تو لوگوں کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ یہی وجہ ان کی کتاب ''ناقابلِ فراموش'' کو صفحۂ قرطاس پر لانے کی بنی۔ اس کتاب میں جو جو واقعات درج ہیں وہ واقعتاً ناقابل فراموش ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان واقعات میں نصیحت کے بے شمار پہلو پوشیدہ ہیں۔ متعدد واقعات ایسے سبق آموز ہیں کہ ان کا کوئی بدل نہیں۔ انھوں نے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ جیل میں بھی وہ اپنے اوقات کو استعمال میں لاتے۔ اگر کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو انسانی زندگی کے بارے میں غور و فکر کرتے۔ نواب بھوپال والے مقدمہ میں جب تین ماہ ناگپور جیل میں رہے تو ریاست کے مستقل کالم ''جذبات مشرق'' کے لیے ہندی کے بہترین شعرا کے کلام کا ترجمہ کیا۔ وہ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ان کی دونوں کتابوں کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

دیوان سنگھ کی جد و جہد کی داستان بہت طویل ہے۔ انھوں نے لاہور میں رہ کر یکے بعد دیگرے کئی اخباروں میں کام کیا اور جب ایک اخبار جس کا نام ''خالصہ اخبار'' تھا ان کی آتش نوا تحریروں کی وجہ سے چار ماہ نکل کر ابدی نیند سو گیا تو انھوں نے لکھنؤ جانے کا قصد کیا۔ وہ وہاں میر

جالب دہلوی کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ سید جالب دہلوی ''ہمدم'' نام سے اخبار نکالتے تھے۔ وہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ دیوان سنگھ مفتوں ان کے دفتر پہنچے اور ملازمت کی درخواست دے دی۔ انھوں نے کہا کوئی جگہ نہیں ہے۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ چپراسی ہی رکھ لیجیے۔ وہ بات بھی رَد ہوگئی۔ انکار میں جواب سن کر انھوں نے کہا'' آپ کو مفت کام لینے میں کوئی اعتراض ہے؟'' سید جالب نے کہا، مفت کام لینے میں کیا انکار ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اگلے روز سے ''ہمدم'' کے دفتر میں انھوں نے بلا معاوضہ کام شروع کردیا۔ پہلا معاوضہ کئی ماہ بعد ملا۔ بقول دیوان سنگھ'' اس وقت میری ذاتی آمدنی اور خرچہ روزانہ آٹھ آنے سے زیادہ نہیں تھا۔'' پھر اس کے بعد آپ نے میدانِ صحافت میں جو معرکے انجام دیے، انھیں دیکھ کر بابائے صحافت سید جالب دہلوی نے کہا'' میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے۔ اس کی کامیابی پر مجھے فخر ہے۔''

لیکن اس ملازمت کے دوران ان کو شدید محنت کرنی پڑتی تھی اور خوراک کی بھی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئے اور پنجاب واپس چلے گئے۔ صحافی اور سیاست داں انور دہلوی دیوان سنگھ پر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ'' دیوان سنگھ کو میر جالب دہلوی سے ہمیشہ شکوہ رہا کہ انھوں نے صحیح نگرانی اور رہنمائی سے پہلوتہی نہ کی ہوتی تو میں لکھنؤ سے کبھی پنجاب کا رخ نہ کرتا''۔ کچھ عرصہ وہ ریاست نابھ میں ملازم رہے۔ پھر دہلی آگئے اور ملا واحدی، بھیا احسان الحق رئیس میرٹھی اور خواجہ حسن نظامی کے ساتھ اخبار'' رعیت'' میں کام کیا۔ لیکن یہ پرچہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ مالی خسارے کی وجہ سے بند ہوگیا۔ یہ غالباً 1919 یا 1920 کی بات ہے۔ اس کے بعد دیوان سنگھ مفتوں نے 1924 میں'' ریاست'' نامی اخبار نکالا۔ یہ بڑی شان سے نکلا اور قلیل عرصے میں ملک کے طول وعرض میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس اخبار کے اداریوں نے پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔

پروفیسر خالد محمود لکھتے ہیں کہ دیوان سنگھ مفتوں نے اپنے اخبار'' ریاست'' کو ریاستوں کے جبر واستبداد کے خلاف وقف کردیا تھا۔ ریاستی امور کے تعلق سے وہ ایسے ایسے انکشافات کرتے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔ ان کی صاف گوئی اور بے باکی کی وجہ سے صاحبان اقتدار ان سے بدظن و بیزار ہوکر ان کے دشمن بن گئے لیکن دیوان صاحب نے ان کی پروانہ کی اور اپنی روش پر قائم رہے۔ والیان ریاست کی عیش کوشیوں کو انھوں نے خوب اجاگر کیا اور ان کی زیادتیوں پر کھل.

کر لکھا۔ یہاں تک کہ ان کے قلم کی بے باکی سے گھبرا کر بعض ریاستوں نے اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے ان کی باتوں پر توجہ دی۔ اس کی ایک مثال ریاست جونا گڑھ ہے جس نے اپنے اس وزیر کو برطرف کر دیا تھا جس کی زیادتیاں بڑھ گئی تھیں۔ آج کی صحافت نے بے پناہ قوت اور اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ 1857 سے 1947 تک کا زمانہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا اس لیے آزادی کے متوالے آزادی کی تڑپ کا اظہار جس لب و لہجے میں کرتے تھے اس میں تندی، تیزی اور شدت در آتی تھی۔ ہر صورت حال کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اس وقت کے تقاضوں کے مطابق اردو کے اخبارات نے جو خدمات انجام دیں اور ان کے مدیروں نے جو اداریے تحریر کیے وہ آسان کام نہ تھا مگر ان جیالوں نے مشکل کام بھی آسان کر دکھایا۔ جیلوں کی تنہائیاں اور عذاب جھیلے، سختیاں اٹھائیں مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوتی۔ ان کے قلم نے وہی کام انجام دیے جو میدان جنگ میں بہادر سپاہی اور بہادر جرنیل انجام دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی انھوں نے حق و انصاف کی آواز کو بلند کیا اور اپنے قلم کے زور سے مظلومین و معتوبین کی ڈھارس بندھائی۔ ہم ان مدیران گرامی کی جاں سوزی، ان کے اخبارات کی جرأت مندی اور ان کے اداریوں کی سچی رہنمائی کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے اپنے خون جگر سے اس خارزار کو لالہ زار بنا دیا۔

دیوان سنگھ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ریاست اخبار نکالنے سے قبل جب وہ فیروز پور کے سول اسپتال میں ملازم تھے تو کئی ادبی رسالوں کے خریدار تھے۔ حالانکہ تنخواہ صرف چھ روپے ماہوار تھی۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں کوئی رسالہ یا اخبار مل جاتا تو پورا ہضم کر جاتے۔ فیروز پور کے بعد انھوں نے تین سال موگا میں ملازمت کی۔ اس کے بعد پٹیالہ چلے گئے اور ڈاکٹری کرنے لگے۔ پٹیالہ کے مانسہ میں ڈاکٹری سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر یہیں انھوں نے پہلی بار قلم کاغذ سے اپنا رشتہ قائم کیا اور لاہور کے خالصہ اخبار میں ایشر سنگھ فیروز پوری کے فرضی نام سے پہلا مضمون بھیجا جو شائع ہو گیا۔ کچھ اور مضامین شائع ہوئے اور اخبار کے ایڈیٹر نے ان کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور اخبار کی ادارت سنبھال لیں۔ پھر انھوں نے اپنی کامیاب میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر خالصہ اخبار جوائن کر لیا۔

لیکن ان کی اصل شہرت "ریاست" اخبار سے ہوئی۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں اور اخبار ریاست لازم و ملزوم تھے۔ ریاست کے ایڈیٹر کی کہانی ایک شخص یا ایک ذات کی کہانی نہیں متحدہ

ہندوستان کے ایک پورے دور اور ایک ادارے کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ سردار صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ریاست اخبار مکمل ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بے شمار لوگوں کا جی ان کی صحبت میں لگتا تھا۔ دفتر ریاست میں صبح سے شام تک لوگوں کی آمد ورفت جاری رہتی تھی۔ ہر قسم کے لوگ اپنی ضرورت کے تحت آتے تھے اور وہ سب کی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ ایک پختہ قوم پرست انسان تھے اور انھوں نے اپنی زندگی ایک نصب العین اور ایک مشن کے لیے وقف کر دی تھی۔

وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ علی الصباح ہی بیدار ہو جایا کرتے تھے اور کرسیٔ ادارت سنبھال لیتے تھے۔ اخبار کے بیشتر مضامین وہ خود لکھتے تھے۔ ان کے دو کالموں ''ناقابل فراموش'' اور ''جذبات مشرق'' اور ان کے اداریوں کی بڑی دھوم تھی۔ ناقابل فراموش اور جذبات مشرق کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے قلم کی کاری ضرب سے فرماں روا کانپتے تھے۔ بزرگ صحافی جی ڈی چندن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ان کی بیباکی اور صاف گوئی کی وجہ سے کئی ریاستوں کے حکمراں ان کے دشمن ہو گئے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ وہ ان ریاستوں کے خلاف جہاں عوام پر زیادتیاں ہوتی تھیں، کھل کر لکھتے تھے۔ انھیں ایسے معاونین ملے ہوئے تھے جو ریاستوں کے بارے میں انھیں پوری تفصیلات مہیا کرتے تھے۔ والیان ریاست کو بے نقاب کرنے کی وجہ سے حکومت برطانیہ کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے اس وقت کے پولیٹیکل سکریٹری نے ریاستوں کو اس سلسلے میں ایک سرکلر بھیجا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سرکلر بھی مفتوں کے ہاتھ آ گیا جس کا ذکر انھوں نے اپنے اخبار میں کیا ہے۔

سردار جی کو اونچے اونچے آدمیوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالنے میں مزا آتا تھا اور یہ واقعات وہ نہایت چٹخارے اور زوردار قہقہوں کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے خلاف برسوں مقدمات چلتے رہے لیکن ان کی جرأت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی اور انھوں نے آخر وقت تک اپنے رویے اور اپنی پالیسی میں تبدیلی نہیں کی۔ انھوں نے زندگی میں کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ ان کی نیک نامی ہی ان کی جائیداد تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے اور بعد میں نفرت اور دشمنی کا جو ماحول پیدا ہو گیا تھا اس نے ان کے اوپر بہت اثر ڈالا تھا۔ اس وقت بھی وہ سچی قوم پرستی اور اتحاد و یکجہتی کے جذبے سے سرشار تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے مختلف شماروں میں ان واقعات کا بڑے درد

انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

شروع میں دیوان سنگھ نے لاہور میں مختلف اخبارات میں دو تین گھنٹے کام کیا۔ مالی حالت چنداں اچھی نہ تھی۔ وہ اسے اپنی زندگی کا ناکام دور تصور کرتے تھے۔ اکثر دو سینئر صحافیوں لالہ رام چھپال سنگھ شیدا اور لالہ بانکے دیال کے ساتھ وقت گزارتے۔ ایک روز پنڈت راج نرائن ارمان انھیں ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں بتایا کہ ''بھر گو سنگت'' کا کچھ حصہ ان کے پاس ہے۔ ''بھر گو سنگت'' نادر و نایاب کتاب ہے اور علم جوتش کے موجد بھر گو رشی کی تصنیف ہے۔ ہزار ہا برس پہلے لکھی گئی۔ کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ مکمل کتاب کا وزن کئی من ہے۔ کتاب میں دنیا میں کتنے لوگ پیدا ہو چکے، موجودہ اور آئندہ، ہر آنے والے انسان کا زائچہ ہی نہیں اس کے ہر جنم کا حال بھی لکھا ہے کہ آئندہ وہ کہاں پیدا ہوگا۔ مفتوں لکھتے ہیں ''میرا زائچہ بھی لیا۔ پھر ہزار ہا کنڈلیوں میں سے میری کنڈلی (زائچہ) ملائی اور نتیجہ مجھے پڑھ کر سنایا، وہ مجھے اب تک یاد ہے''۔

''یہ انسان حمل میں ہوگا تو باپ کی صحت گرنی شروع ہو جائے گی۔ پیدا ہونے کے چھ ماہ کے اندر باپ انتقال کر جائے گا۔ بہت ہوشیار ہوگا۔ 18 برس کی عمر میں زمین ملے گی۔ 17 برس کی عمر میں ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگا اور بہت تکلیف اٹھائے گا۔ لڑکی کے ساتھ اس انسان کا پچھلے جنم میں بھی تعلق تھا۔ اس نے لڑکی کو پچھلے جنم میں تکلیف دی تھی۔ یہ لڑکی پچھلے جنم کا بدلہ اس جنم میں لے گی جب اس کی عمر 17 سال ہوگی۔ یہ انسان پچھلے جنم میں بنارس کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ انسان بہت خوش نصیب اور خوش بخت ہے۔ زندگی میں لاکھوں انسانوں کے دماغ پر حکومت کرے گا۔ چڑھنے کے لیے سواری نصیب ہوگی۔ لاکھوں روپیہ پیدا کرے گا اور لاکھوں روپیہ خرچ کرے گا لیکن ہمیشہ مقروض رہے گا۔ زندگی بھر دشمنوں کا مقابلہ کرتا اور ان کو نیچا دکھاتا رہے گا۔ راجوں، مہاراجوں کے لیے خطرناک ہوگا۔ اس کا رزق اس کے وطن سے مشرق کی طرف ہوگا۔ 80 برس کی عمر کے بعد یکدم حرکتِ قلب بند ہونے سے موت واقع ہوگی''۔

دیوان سنگھ لکھتے ہیں ''یہ مختصر حالات سن کر میں حیران رہ گیا۔ گزرے واقعات بالکل سچے تھے۔ آئندہ زندگی اتنی شاندار ہوگی یقین نہ آتا تھا۔ میرے والد میری پیدائش کے 40 دن بعد فوت ہو گئے تھے۔ تعلیم پانچویں تک حاصل کی۔ 18 برس کی عمر میں زمین تقسیم ہوئی تو ملی۔ 17 برس کی عمر میں جب دھرم کوٹ ضلع فیروزپور میں تھا مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ آپ یقین نہیں کریں گے اس زمانے میں مجھے عورت مرد کے تعلقات کا علم بھی نہیں تھا۔ اس لڑکی سے میں نے

کبھی بات بھی نہیں کی لیکن ایک برس تک مجھے نیند نہ آئی، بے چین رہتا۔ دو سال بعد وہ لڑکی مر گئی۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو میرے ہاتھ میں کچھ سامان تھا وہ گر گیا۔ اب بھی جب کبھی اس کی یاد آئے پورے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی ہے''۔

دیوان سنگھ مفتوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا انسان صرف اور صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر آگے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ جب وہ اخبار ''رعیت'' میں کام کرتے تھے تو ملا واحدی کے مکان کے ایک حصہ میں رہتے رہے جہاں اخبار کا دفتر بھی تھا۔ بھوک لگتی تو بازار سے کھانا منگوا کر کھا لیتے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے اٹھ کر کام کرنے لگتے۔ اتفاق سے ایک رات واحدی صاحب دس بجے آئے تو دیکھا کہ دیوان سنگھ کام کر رہے ہیں۔ رات ایک بجے پھر غسل خانے جانے لگے تو دیکھا کہ دیوان سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے پوچھا، آخر تم اتنا کام کیوں کرتے ہو؟ دیوان سنگھ نے کہا ''انسان کی کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سخت محنت کا عادی ہو اور اپنی زندگی میں بہت کام کرے''۔ اس دنیائے فانی میں کوئی ہمیشہ نہیں رہتا۔ ایک نہ ایک دن سبھی کو جانا ہے۔ لیکن دیوان سنگھ مفتوں کی بے باک صحافت کا نقش آج بھی لوگوں کے دلوں میں رقم ہے۔ ان کی تحریر کردہ دونوں کتابیں ناقابلِ فراموش ہیں۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے یادوں کی بارات میں سردار دیوان سنگھ کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کی آپ بیتی ''ناقابل فراموش'' کے بارے میں لکھتے ہیں ''میرے مخلص ترین دوست سردار دیوان سنگھ مفتوں ہماری قدیم وضعداری، ہماری قدیم شرافت، ہماری قدیم دریادلی اور اخلاقی جرأت کی ایک ایسی عظیم یادگار ہیں کہ اگر ہماری قوم اندھی نہ ہو چکی ہوتی تو ان کو اسی احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا جس احتیاط کے ساتھ حکومتیں اپنے آثار قدیمہ کو برقرار رکھتی ہیں۔ ان کی کتاب ناقابل فراموش ان کی زندگی کا ایک زبردست کارنامہ اور اردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوش قدم کو بڑی دیدہ وری کے ساتھ چن چن کر اس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا اس کی زندگی کے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اٹھیں گے جن کی مستقل روشنی میں وہ بے خوف وخطر آگے بڑھے گا اور کسی نشیب وفراز یا کسی موڑ پر وہ

ٹھوکر نہیں کھائے گا"۔

دیوان سنگھ نے اردو زبان میں جو قابلیت اور صلاحیت حاصل کی وہ بقول خود امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے بزرگوں کی تحریروں کا صدقہ ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری اپنے شاگرد دیوان سنگھ مفتوں کے بارے میں لکھتے ہیں "سردار دیوان سنگھ کی ساری زندگی صحافت ہی کے مشغلے میں بسر ہوئی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ اخبار "ریاست" ان کی صحافتی زندگی کا اتنا زبردست کارنامہ ہے کہ کہ ہم اس سے ہٹ کر ان کو اچھی طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کسی کام کا ارادہ کر لینا ان کے نزدیک ایک ایسا روحانی عہد ہے جس کی تکمیل میں وہ اپنی تمام تر ذہنی و حیوانی قوت صرف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر کام کا اسلوب پہلے سے سوچ لیتے ہیں اور پھر اس سے نہیں ہٹتے۔ ان کی محنت کا یہ حال ہے کہ وہ تھکنا جانتے ہی نہیں اور ایک مشین کی طرح ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کامیاب صحافتی زندگی کا سب سے بڑا راز ان کا یہی جوش عمل ہے اور اس کے ساتھ ضمیر کی پاسداری کہ "موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے"۔ لیکن وہ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہیں لکھیں گے...... وہ صحافی ادیب ہیں اور اس فن کے پورے ماہر۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک صحافی کو کس وقت کس انداز سے لکھنا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھی فرط جوش میں ان کا قلم مناسب حدود سے آگے گزر جاتا ہے۔ الغرض دیوان سنگھ بڑا سچا دوست، بڑا خطرناک دشمن، نہایت بے باک صحافی، بے خوف اور نڈر انسان ہے اور میں نے کم ایسے انسان دیکھے ہیں جو دیوان سنگھ کی طرح صابر و ضابط اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے شیر کا سا دل رکھتے ہوں"۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق دیوان سنگھ کی زندگی اور صحافت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دیوان سنگھ کا گھر مظلوموں اور ظلم رسیدوں کی پناہ گاہ تھا۔ وہ اپنی فریادیں لے کر ان کے ہاں پہنچتے یا لکھ کر بھیجتے۔ ان میں امیر، غریب، رئیس سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ جب تحقیق ہو جاتی کہ شکایت صحیح ہے تو وہ ان کی حمایت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ ان میں اکثر ظالم، جابر، بے درد والیان ریاست کے ستائے ہوئے ہوتے تھے جن کے مقابل آتے ہوئے بڑے بڑے بہادر سورماؤں کے پتے پانی ہوتے تھے۔ سردار جی نے ایک جگہ مسٹر ہارنی مین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اخبار نویس دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوا ہے جو مصائب

میں ہوں۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں''۔ دیوان سنگھ مفتوں نے ہارنی مین کے اس قول پر ہمیشہ عمل کیا اور جان جوکھوں میں ڈال کر مظلوموں کی حمایت کی۔ اگر چہ اس کی بدولت انھیں بہت سے برے دن دیکھنے پڑے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور آٹھ جیلوں کی سیر کی۔ لیکن ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں اور جتنے مقدمات قائم ہوئے اسی قدر ان کی عزت اور وقعت بڑھتی گئی...... سردار دیوان سنگھ کی زندگی سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت کچھ بھی نہ تھی صرف پانچویں جماعت پڑھنے پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرنی پڑی اور محض اپنے سرگرم شوق اور شب و روز کے مطالعہ سے ایسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت کی صف اول میں آ گئے۔ جو اقوام اور افراد کام سے بھاگتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام اور غلام رہیں گے۔ کامیابی اور آزادی ان کی قسمت میں نہیں''۔

ملا واحدی دیوان سنگھ کی زندگی کی ایک بے حد اہم خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''سردار صاحب کی عادت ہے کہ جاڑا گزر جانے کے بعد گرمی میں کام نہ آنے والے کپڑے اور گرمی گزر جانے کے بعد جاڑے میں کام نہ آنے والے گرمی کے کپڑے خیرات کر دیتے۔ دوسرے جاڑے اور دوسری گرمی کے واسطے کپڑا روکتے نہیں۔ لیکن یہ تماشہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ سردار صاحب جیل سے لوٹے ہیں اور ایک سے دوسرا جوڑا بدلنے کو نہیں ہے۔ اسے ہی دھوتے ہیں اور پہن لیتے ہیں''۔ ملا واحدی اخبار ریاست کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''سردار صاحب کی تحریر میں اللہ تعالیٰ نے خاص نوعیت کی قوت بخشی ہے۔ تحریر بناوٹ اور تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ سردار صاحب خیالات کو تکلف اور ہجر مجر کے ساتھ نہیں پیش کرتے۔ بالکل بے ساختہ لکھتے ہیں۔ غالباً یہی ان کی تحریر کی قوت کا راز ہے۔ اس بات نے تحریر میں وہ زور بھر دیا ہے اور تحریر کو وہ پختگی دے دی ہے جس کی بنا پر باوجود زبان کے نقائص کے انھیں صاحب طرز لکھنے والا کہا جا سکتا ہے۔ اخبار ریاست کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں بہت سے ممتاز اہل قلم اور زبان داں شامل رہ چکے ہیں۔ لیکن اہل قلم اور زبان داں حضرات اور مضامین لکھا کرتے تھے یا اوروں کے مضامین کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اخبار ریاست کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا۔ کبھی اتفاق سے سردار صاحب بیمار ہو گئے اور ایڈیٹوریل اہل قلم اور زبان داں حضرات کو لکھنا پڑ گیا تو اخبار ریاست پھیکا اور پھسپھسا سمجھا جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزا نہ آتا تھا''۔

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی بھی سردار دیوان سنگھ مفتوں کے پرانے شناساؤں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں ان کے تعلق سے بہت سے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کی صحافت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر میں جو دلکشی پائی جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے صحافت نگار کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ ایڈیٹر ریاست کی تحریر کی دوسری نمایاں خوبی ان کا بے باکانہ انداز ہے۔ جب ہندوستانی صحافت کے گلے پر انگریزی قانون کی شمشیر برہنہ ہر وقت لٹکی رہتی تھی وہ اس وقت بھی بدیسی حکومت اور اس کے پروردہ والیان ریاست پر اتنی ہی شدت سے تنقید کرتے تھے جس شدت سے آج ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد موجودہ ذمہ داران حکومت پر تنقید کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طرح آج حکام اور ملک کے ارباب حل وعقد ان کے قلم سے لرزہ براندام رہتے ہیں وہی حالت بدیسی حکومت کے دور میں والیان ریاست اور ان کے آقائے نامدار کی تھی۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرزمین پنجاب سے تین معجزے وجود میں آئے۔ اول سر اقبال، دوسرے مولانا ظفر علی خاں اور تیسرے سابق بھاری بھرکم اور موجودہ نحیف الجثہ دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ریاست''۔

دیوان سنگھ مفتوں کی آپ بیتی ''ناقابل فراموش'' پر بڑے بڑے ادبا اور صحافیوں اور قلم کاروں نے اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ ان کو صحافتی اور ادبی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے جہاں ان کے اخبار کا اہم رول ہے وہیں ان کی اس کتاب کا بھی ہے۔ اگر لوگ ان کے اخبار کو فراموش بھی کر دیں تو اس کتاب کو فراموش کرنا مشکل ہے۔ جنھوں نے یہ کتاب پڑھی ہے ان کے ذہنوں میں دیوان سنگھ مفتوں کی شخصیت ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔

صغیرہ بانو شیریں ان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ایک ادبی مجلس میں دیوان سنگھ کا ذکر چھڑا۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے ان کی صاف گوئی کے مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے کہا ''اردو کی ہفتہ وار اخبار نویسی میں صرف تین پرچے ایسے ہیں جو مر کر بھی زندہ رہیں گے: الہلال، اودھ پنچ اور ریاست۔ الہلال کا ہمیشہ ادب کیا گیا۔ اودھ پنچ خود ہنستا اور ہنساتا رہا لیکن ریاست ایسا پرچہ ہے جس سے اربابِ اقتدار خوف کھاتے رہے۔'' چراغ حسن حسرت نے کہا ''مفتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آنکھیں چار کر کے لکھتا ہے، عام ایڈیٹروں کی طرح آنکھ مچولی نہیں کرتا۔'' احمد شاہ بخاری نے صاد کیا ''مفتوں بت کدہ میں اذان کی آواز ہے۔'' مولانا عبدالمجید سالک بھی ان سے متفق تھے۔ انھوں نے اتنا اضافہ اور کیا ''مفتوں نے ہفتہ وار اخبار

نویسی کر کے تنہا نویسی کی عمارت کھڑی کی ہے۔'' شورش کاشمیری ان باتوں کے راوی ہیں۔

دیوان سنگھ مفتوں کا نام سامنے آتے ہی بے باک صحافت کے حوالے سے نئی جہت سامنے آتی ہے۔ ایک بار ثقہ ادیبوں کی محفل میں یہ سوال زیرِ بحث تھا کہ اردو اخبار نویسی میں کتنے ایڈیٹر ایسے ہیں جن کے قلم سے انسانوں کے بڑے گروہوں نے محبت کی اور جن کی تحریروں کا دبدبہ تنی گردنیں جھکانے پر قادر رہا یا پھر جنھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ ایسے مباحثہ میں ایک بات پر متفق ہونا مشکل ہے لیکن تقریباً سارے ادبا کا اتفاق تھا کہ ہفتہ وار صحافت میں طویل عرصے تک جو درجہ وکمال دیوان سنگھ مفتوں کو حاصل رہا وہ بے مثال ہے۔ مفتوں اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے واحد ایڈیٹر ہیں جنھوں نے ربع صدی تک پورے ہندوستان میں اپنا سکہ بٹھایا۔ ان کے ہم عصروں نے انھیں رشک سے دیکھا، دوستوں نے فخر کیا اور مخالفوں نے سر چھپانے میں خیر سمجھی۔

◆◆◆

دیش بندھو گپتا

لالہ دیش بندھو گپتا 14 جون 1901 کو پانی پت میں اردو ادیب شادی لال گرگ کے یہاں پیدا ہوئے اور 21 نومبر 1951 کو کلکتہ جاتے وقت وہاں پیش آنے والے ہوائی حادثے میں ان کی موت ہوگئی۔ ان کا پیدائشی نام رتی رام تھا۔ انھیں ''دیش بندھو'' کا خطاب معروف آریہ سماجی رہنما سوامی شردھانند نے دیا تھا جو ان کی شخصیت پر ایسا چسپاں ہوا کہ ان کا نام ہی بن گیا۔ سوامی جی نے دیش بندھو کے ساتھ مل کر اردو میں روزنامہ ''تیج'' اور ہندی میں روزنامہ ''ارجن'' جاری کیا تھا۔ تیج کی تمام تر ذمہ داری دیش بندھو کے شانوں پر رہی۔ اس اخبار کا آغاز 1923 میں ہوا تھا جو اس وقت سے تاحال مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

جمنا داس اختر کے مطابق لالہ دیش بندھو گپتا نے کئی برسوں تک تیج کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔ سوامی شردھانند ان کو اپنا بیٹا مانتے تھے اور انھوں نے لالہ جی کو اپنا عملی جانشین مقرر کیا تھا۔ اس زمانے میں جدید دور کی ٹیکنالوجی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مضامین وغیرہ کی تیاری میں حوالے اور دیگر مضامین کی ضرورت پڑتی تھی اور اخباروں میں کام کرنے والے پرانے اخبارات اور کتابوں سے استفادہ کرتے۔ لالہ جی نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تیج کے دفتر میں ایک لائبریری قائم کر دی جس سے لوگ بوقت ضرورت فائدہ اٹھاتے۔ انھوں نے اس لائبریری میں سیاسیات، تاریخ اور دوسرے موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابوں کا انتظام کیا تھا۔

دیش بندھو گپتا ایک مجاہد آزادی اور سیاست داں تھے۔ وہ کانگریس کے چوٹی کے رہنما تو تھے ہی آئین ساز اسمبلی کے بھی رکن تھے۔ وہ دہلی کے چیف کمشنر کی مشاورتی کونسل کے بھی ممبر

تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے وہ اخبار کو ضروری وقت نہیں دے پاتے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ایک رپورٹر جمنا داس اختر کو ادارت کی تمام ذمہ داری سونپ دی۔ وہ ایڈیٹر کے کام میں مداخلت کے بالکل قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈیٹر کو کچھ بھی لکھنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس اخبار نے جب مہاراجہ کشمیر کے خلاف جاری تحریک کا ساتھ دیا اور کشمیر کو خصوصی اختیارات تفویض کرنے والی دفعہ 370 کی حمایت کی تو اس کی شکایت دیش بندھو سے کی گئی اور ایڈیٹر کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن لالہ جی نے اس مطالبے پر کان تک نہیں دھرا اور نہ ہی اپنے ایڈیٹر کو روکنے کی کوشش کی۔ جب دہلی میں ورکنگ جرنلسٹ یونین قائم ہوئی تو اس اخبار کے ایڈیٹر بھی اس کے بانیوں میں شامل تھے۔ لیکن دیش بندھو نے اس کو بھی برا نہیں مانا اور یہ خیال نہیں کیا کہ یونین سے اخبار کے مالکان کو پریشانی ہو سکتی ہے لہٰذا وہ اپنے ایڈیٹر کو اس میں شامل ہونے سے روک لیں۔ اس بارے میں وہ بہت وسیع القلب تھے اور جہاں اپنے ایڈیٹروں اور صحافیوں کو کھل کر کام کرنے کی آزادی دینے کے قائل تھے وہیں ان کی اس قسم کی سرگرمیوں کے بھی مخالف نہیں تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے اسٹاف کو تنخواہوں کے علاوہ بونس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ جمنا داس اختر کے مطابق تیج اردو کا پہلا اخبار تھا جس کے کارکنوں کو اس بارے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

دیش بندھو اردو صحافیوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بلاک پرنٹنگ شروع کی۔ تیج کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے کچھ صفحات بلاک پرنٹنگ کے ذریعے شائع کیے جاتے تھے۔ انھوں نے ہی اردو صحافت میں سب سے پہلے آفسیٹ پرنٹنگ کا اہتمام کیا۔ وہ تیج اخبار کے ہفت روزہ ایڈیشن میں کام کرنے والوں کو الگ سے معاوضہ دیتے تھے۔ معروف صحافی چمن لال برطانیہ اور جاپان میں تیج اخبار کی نمائندگی کرتے تھے۔ جب وہ دہلی لوٹ کر آئے تو ان کے ذمہ پارلیمنٹ کی کارروائیوں کی رپورٹنگ دی گئی۔ وہ بہت دنوں تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔

انھوں نے اپنے قوم پرستانہ نظریات کے اظہار کے لیے اخبار تیج کو ذریعہ بنایا۔ وہ جس بے خوفی کے ساتھ مضامین تحریر کرتے اس سے وہ اخبار کے قارئین میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ ان کی تحریروں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ابہام اور شکوک و شبہات سے پاک ہوتیں۔ جس کے نتیجے میں واضح خیالات کے لیے ان کی تحریریں مشہور ہو گئیں۔ ان کی شعلہ نوا تحریروں کی وجہ سے اخبار

تیج بہت جلد مجاہدین آزادی کے خیالات کو عوام تک پہنچانے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گیا۔

انہی دنوں دہلی کے چاوڑی بازار میں عصمت فروشی کے اڈوں کے خلاف ایک تحریک چل رہی تھی۔ تیج بھی اس میں پیش پیش تھا اور اس کے ایڈیٹر جمنا داس اختر بھی اس میں شریک تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں اس اڈے سے بہت سی عورتوں کو آزاد کرایا گیا۔ کچھ لوگوں نے دیش بندھو گپتا سے شکایت کی کہ تیج کی اس تحریک میں شمولیت سے کانگریس پارٹی کو نقصان ہوگا اور اس حلقے سے اسے ووٹ نہیں ملیں گے۔ اس پر لالہ جی نے جو جواب دیا تھا وہ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا ''میں عصمت فروشی کو کاروبار کا درجہ دینے والوں کے ووٹوں کا محتاج بننے کو تیار نہیں''۔ جب ان سے شکایت کی گئی کہ تیج اخبار کا ایڈیٹر کانگریس حکومت کی کارکردگی پر بھی نکتہ چینی کرتا رہتا ہے لہٰذا آپ کو اس کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔ اس پر لالہ جی نے کہا کہ میرا ایڈیٹر میرے خلاف بھی لکھ دیتا ہے مگر مجھے اس کی ایمانداری پر شک نہیں ہے۔ میں آزادیٔ تحریر میں مداخلت کا حامی نہیں ہوں۔ ایک بار ایک غیر ملکی سفارت خانہ کی ایک خاتون افسر نے لالہ جی سے شکایت کی کہ آپ کا اخبار یہ الزام لگا رہا ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان کو اپنے فوجی اڈے کے طور پر استعمال کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ لالہ دیش بندھو نے اس خاتون افسر کو جواب دیا کہ آپ اس کی تردید کر دیں اور اخبار کے الزام کا صحیح صحیح جواب دیں۔ ان کی یہ خوبی بلاشبہ قابل ستائش ہے جو بہت کم مالکوں میں نظر آتی ہے۔ ورنہ اخباروں میں کام کرنے والوں کی صورت حال یہ ہے کہ وہ مالک کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے۔ ایسے مالک صحافی کم گزرے ہیں جنھوں نے اپنے ایڈیٹروں کو تحریر کی پوری آزادی دی ہو۔

انہی دنوں دیش بندھو گپتا نے شری گوینکا کے اخبار انڈین نیوز کو اپنے انتظام میں لے لیا تھا۔ آچاریہ کرپلانی کو اس کی مشاورتی کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ لالہ جی نے ہندی کا بھی ایک اخبار جاری کیا تھا۔ انھیں اتفاق رائے سے آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانگریس کا صدر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اس تنظیم کو مضبوط کرنے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے 1947 کے دنوں میں اخبارات کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ انھوں نے اخبار نویسوں کو اکٹھا کر کے اس بات کی کوشش کی کہ فرقہ وارانہ خون خرابہ رک جائے۔ انھوں نے فساد زدگان کی مدد کی۔ ریلیف کمیٹیاں قائم کیں۔ انھوں نے شہر کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مدد کی۔ وہ تاعمر روزنامہ تیج کے مینیجنگ ایڈیٹر رہے۔ وہ پریس کی آزادی کے زبردست حمایتی تھے۔ وہ

ایسے بلوں کی مخالفت کرتے رہے جن سے پریس کی آزادی پر ذرا بھی آنچ آتی ہو۔

دیش بندھو گپتا ایک معروف مجاہد آزادی تھے۔ جب وہ دہلی کے مشہور سینٹ اسٹیفنس کالج میں زیر تعلیم تھے انہی دنوں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تھی۔ دیش بندھو نے جو اس وقت تک رتی رام تھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور اس تحریک میں کود پڑے۔ انھوں نے گاندھی جی کی اس اپیل پر کہ لوگ بدیسی کپڑا استعمال نہ کریں اور اسٹوڈنٹس اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کریں، کالج کے صدر دروازے پر ہی ترنگا لہرادیا۔ انھوں نے وہاں بدیسی کپڑوں کی ہولی بھی جلائی۔ اس کے بعد وہ جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ ان کی تقریر بڑی پراثر ہوتی اور عوام کے دلوں میں آزادی کا جوش پیدا کر دیتی۔ اس وقت جب انگریزوں نے دیکھا کہ یہ تحریک زور پکڑ رہی ہے تو انھوں نے اسے ناکام بنانے کے لیے ہندو مسلم فساد کروادیا۔ رتی رام نے فسادات کے سلسلے میں انگریزوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے دن رات محنت کی۔ انھوں نے برسوں تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور سب سے پہلے 19 سال کی عمر میں جیل گئے۔ وہ سوامی شردھانند کے شاگرد تھے۔ شردھانند ایک مقبول رہنما تھے۔ جب انگریزوں نے دہلی کی جامع مسجد میں داخل ہو کر نہتے اور پرامن عوام پر گولیاں چلانے کی دھمکی دی تو شردھانند نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر انگریزوں کو للکارا اور کہا کہ اگر ان میں جرأت ہے تو وہ پہلے ان پر گولی چلائیں۔ (بحوالہ: روزنامہ تیج 11 جون 2011)

1942 کی بھارت چھوڑو تحریک کے دوران ان کو دہلی میں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے لاہور اور پھر ملتان لے جایا گیا جہاں ان کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ جس سے ان کی صحت پر برا اثر پڑا اور انھیں یرقان ہو گیا۔ جب انگریزوں کو یہ لگنے لگا کہ شاید وہ بچیں گے نہیں تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ جب وہ دہلی ریلوے اسٹیشن پر آئے تو وہاں انھیں دیکھنے والوں کی زبردست بھیڑ تھی۔ اس وقت انھیں اسٹریچر پر لے جایا گیا۔ انھوں نے عوام کی مبارکبادیوں کا جواب ہاتھ اٹھا کر دیا۔

دیش بندھو گپتا پنجاب کی سیاست میں بھی بہت سرگرم تھے۔ انھوں نے ملتان جیل سے ہی 28-1927 میں ہریانہ کو الگ ریاست بنانے کی تحریک شروع کی تھی۔ انھوں نے ہریانہ کی ترقی کی خاطر دو بار گاندھی جی کا پانی پت کا دورہ کروایا۔ وہ سات بار جیل گئے تھے۔ مجاہد آزادی چودھری رنبیر سنگھ ہڈا نے اپنی کتاب ''سوراج کے سور'' میں لکھا ہے کہ دیش بندھو گپتا نے 1932 میں کھل کر ہریانہ کو الگ ریاست بنانے کا مطالبہ کیا اور کہا تھا کہ تاریخ میں انبالہ ڈویژن شملہ ضلع کو

چھوڑ کر کبھی بھی پنجاب کا حصہ نہیں رہا۔ وہ 1951 تک ہریانہ کو الگ ریاست کا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے رہے۔ بالآخر یکم نومبر 1966 کو ہریانہ جب ایک الگ ریاست کی شکل میں ابھرا تو وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھے۔

اس وقت دہلی میں جن کی تقریریں جادو کا اثر رکھتی تھیں ان میں مسٹر آصف علی، مولانا آزاد اور مولانا احمد سعید ملیح آبادی کے بعد لالہ دیش بندھو گپتا قابل ذکر تھے۔ خلافت تحریک کے آخری دنوں میں جب جگہ جگہ فسادات ہوئے تو انھوں نے فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑی محنت کی۔ حیدرآباد ستیہ گرہ میں بھی انھوں نے حصہ لیا۔ جب انگریزوں نے کانگریس کو غیر قانونی قرار دے دیا تو انھوں نے دہلی کے چاندنی چوک میں کانگریس کا جھنڈا لہرانے کی جرأت کا مظاہرہ کیا اور ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔ بھارت چھوڑو تحریک کے دوران بہت سے لیڈروں کے ساتھ ان کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت تیج کا دفتر سول نافرمانی کرنے والوں کا مرکز بن گیا تھا۔

دیش بندھو گپتا نے دہلی کو دوسری ریاستوں کے مساوی درجہ دلانے کی جدوجہد کی۔ انھیں یقین تھا کہ یہ مہم کامیاب ہوجائے گی۔ اس بارے میں انھوں نے زبردست بحث کی اور یہ دلیل دی کہ برطانوی سامراج کے خلاف بہادری کے ساتھ لڑنے والے دہلی کے عوام کو قانون ساز اسمبلی کا تحفہ ملنا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ سردار پٹیل سے بھی ٹکرا گئے جو دہلی کو یہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بالآخر پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور پٹیل نے ان کی باتوں پر توجہ دی اور دہلی کو ''سی'' کلاس اسمبلی کا درجہ دیا گیا۔ دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے سابق صدر برج موہن کی ایک تحریر کے مطابق تقسیم ہند کے بعد چودھری برہم پرکاش کی قیادت میں نوجوان کانگریسیوں کے ایک نئے گروپ نے دہلی کانگریس کے پرانے لیڈروں کو کنارے لگا دیا۔ جب الیکشن کا اعلان ہوا تو اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ برہم پرکاش کو وزیر اعلیٰ ہونا چاہیے اور دیش بندھو گپتا کو لوک سبھا کے لیے منتخب کیا جانا چاہیے۔ لیکن برہم پرکاش اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دہلی کا پہلا وزیر اعلیٰ ہونے کا اعزاز لالہ دیش بندھو گپتا کو ملے۔ وہ لالہ جی کی رہائش گاہ گئے اور ان سے کہا کہ وہ نئے نظام میں ان کے ماتحت رہ کر کام کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ لالہ جی ہی دہلی کے پہلے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ عوام کو بھی یقین تھا کہ لالہ جی دہلی کے پہلے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ انھوں نے دہلی اسمبلی کے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن ان کی قسمت میں یہ عہدہ نہیں تھا۔ بالآخر کلکتہ کے ہوائی حادثے میں وہ ہلاک ہو گئے۔

بزرگ صحافی اور روزنامہ تیج کے موجودہ مدیر پی پی مسیح کے مطابق انھوں نے گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ کام کیا تھا۔ کئی بار ان کو جیل کی یاترا کرنی پڑی۔ وہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے بہت قریبی تھے۔ انھوں نے دہلی میں کانگریس کو مضبوط بنانے کی تحریک کے علاوہ مندروں میں ہریجنوں کے داخلے کی تحریک بھی چلائی۔ انھوں نے 1937 میں پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں حصہ بھی لیا اور کامیاب ہوئے۔ اس وقت سر سکندر حیات پنجاب کے حکمراں تھے۔ وہ لالہ جی سے متاثر تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ پی پی مسیح مزید کہتے ہیں کہ لالہ جی نے اگرچہ پانی پت میں جنم لیا لیکن دہلی ان کی کرم بھومی تھی۔ وہ دہلی والے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ دہلی کی مشترکہ تہذیب کے نمائندہ تھے اور کسی بھی قیمت پر اس تہذیب کو نقصان پہنچانے کے خلاف تھے۔ ایسے صحافی اور ایسے رہنما روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم صحافت میں ان کے دکھائے ہوئے اصولوں پر چلیں اور صحافتی قدروں کو پامال ہونے سے بچائیں۔

بہر حال لالہ دیش بندھو گپتا کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے دہلی کے اجمیری گیٹ پر ایک پارک، ایک قد آدم مجسمہ، دیش بندھو گپتا روڈ اور دیش بندھو گپتا کالج قائم کیا گیا ہے۔ جبکہ ہریانہ حکومت نے پانی پت میں ایک منی سکریٹریٹ قائم کیا ہے۔ ان کے نام سے کالج بنانے کے علاوہ ان کے نام سے ایوارڈ دینے کا بھی اہتمام کیا ہے۔

◆◆◆

رنبیر

روزنامہ ملاپ کے ایڈیٹر شری رنبیر 29 دسمبر 1907 کو جلال پور، گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئے اور 8 دسمبر 1982 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے 9 سال کی عمر میں اپنی زندگی کا پہلا افسانہ لکھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ملاپ اخبار 13 اپریل 1923 کو رنبیر کے والد مہاشہ خوشحال چند خورسند نے لاہور سے شروع کیا تھا۔ اس وقت اس میں دو سب ایڈیٹر رکھے گئے تھے مہاشہ امرناتھ جلال پوری اور پریم ناتھ الفت۔ خوشحال چند خورسند نے بحیثیت ایڈیٹر تین مرتبہ گرفتاری دی تھی۔ پہلی گرفتاری کا سبب ملاپ میں شائع ایک کارٹون تھا جسے توہین عدالت سمجھا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ ملاپ میں ایک اسپتال کی خبر کو ڈرامائی انداز میں چھاپنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا۔ تیسری مرتبہ بھی ملاپ ہی میں شائع مضامین کی بنیاد پر انھیں جیل بھیجا گیا تھا۔ بعد میں ان کی طبیعت سنیاس کی طرف مائل ہوگئی۔ اس دوران وہ جنگل میں چلے جاتے اور لوگوں سے ملنا جلنا اور بات کرنا ترک کردیتے تھے۔ انھوں نے 28 برس تک سنیاسی کی زندگی گزاری اور 24 اکتوبر 1977 کو ان کا انتقال ہوا۔

رنبیر ایک انقلابی انسان تھے۔ انقلابی تحریکوں میں انھوں نے حصہ لیا۔ رنبیر، یش اور یدھ ویر تین بھائی تھے۔ رنبیر ملاپ دہلی کے ایڈیٹر، یش ملاپ جالندھر کے ایڈیٹر اور یدھ ویر حیدرآباد ملاپ کے ایڈیٹر تھے۔ ہندوستانی صحافت میں رنبیر کا ایک بلند مقام ہے۔ وہ قوم پرست تھے اور سماجواد کی بنیادوں کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مضامین میں سماجواد کی حمایت کرتے، وہ کانگریس کے حق میں بھی لکھتے تاکہ حکومت اپنی ترقی پسندانہ پالیسیاں عوامی فلاح و بہبود میں وضع کرے۔

لیکن جب 1975 میں ایمرجنسی لگائی گئی تو ملاپ میں کانگریس کے خلاف بہت سے مضامین شائع ہوئے تھے۔ مولانا امداد صابری کے مطابق انھوں نے ان مضامین کو جن میں کانگریسیوں پر رکیک حملے کیے گئے تھے، انبالہ جیل میں پڑھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ رنبیر جی کے ملاپ میں ایسے مضامین کی اشاعت افسوسناک ہے۔

شری رنبیر ایک انسان دوست اور ہمدرد شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے جانے کتنے نوجوانوں کو روزگار ملا اور ان کے معاش کا مسئلہ حل ہوا۔ وہ کسی ضرورت مند کی صرف مدد ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا انتظام کر دیتے تھے کہ وہ مستقل طور پر کسی روزگار سے لگ جائے تا کہ آئندہ اس کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کسی کو پیسہ دینے سے بہتر ہے کہ اسے روزگار کرا دو تا کہ وہ دوسروں کی مدد کر سکے۔

بڑے بڑے سیاست دانوں اور بیوپاریوں سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اخبار نویس کا سیاست کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے صنعت کار بھی رنبیر جی سے ملنے آتے تھے لیکن وہ ہمیشہ اپنے نرالے انداز سے ملتے تھے۔ چہرہ پر ہنسی اور دل میں انسانیت کے لیے بہتری بھی ان کی زندگی کے دو نشان تھے اور انھوں نے ان دونوں باتوں کو ساری عمر نبھایا۔ رنبیر جی ایک دفعہ جو فیصلہ کر لیتے اس پر عمل ضرور کرتے تھے۔

رنبیر ایک پکے محبِ وطن تھے۔ انھوں نے گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کی زندگی پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام ''یگ پرش'' ہے۔ پہلے یہ کتاب اردو میں اور پھر ہندی میں شائع ہوئی۔ اس کا اجرا اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ رنبیر جی میرے والد اور میرے خاندان کے پرانے دوست ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی تحریروں سے فرقہ وارانہ اتحاد اور میل جول قائم کرنے پر زور دیتے ہیں۔ یہ کتاب جہاں بھی جائے گی اتحاد و اتفاق کو تقویت فراہم کرے گی۔ اس پر رنبیر نے کہا کہ اس کتاب کی تصنیف کا ان کا مقصد سکھوں کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے رکھنا ہے۔ گورو گوبند سنگھ جی کسی مذہب کے خلاف نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

رنبیر ہمیشہ فرضی اور جعلی سادھو سنتوں اور گروؤں کے خلاف لکھتے رہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ جعلی گرو انسانوں کے دشمن ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ وہ تحریر کے بھی دھنی

تھے اور تقریر کے بھی۔ وہ ایک صاف گو اور دلیر انسان تھے۔

رنبیر نے اپنے والد مہاشہ خوشحال چند خورسند کی زندگی پر بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس میں انھوں نے ملاپ اخبار کے شروع ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اخبار ملاپ کے 13 اپریل 1973 کے شمارے میں شائع ہوا ہے اور اسے مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب ''تاریخ صحافت اردو'' جلد پنجم میں نقل کیا ہے۔

اس کے مطابق شری خوشحال چند خورسند آریہ گزٹ کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی عوامی خدمت کا جذبہ اور تنظیمی قابلیت دیکھ کر مہاتما ہنس راج جی نے فیصلہ کیا کہ انھیں مالابار بھیجنا چاہیے۔ لیکن ماتا جی کو یہ فیصلہ اچھا نہیں لگا۔ ان کے پانچویں بیٹے ستیہ پال (یدھ ویر) کی پیدائش کچھ ہی مہینے پہلے ہوئی تھی۔ ان کی اپنی صحت کافی کمزور تھی، ڈھائی برس کے لیش کو ان دنوں نمونیا تھا، کافی خراب حالت تھی۔ اس کی ماں کو کسی نے بتایا تھا کہ مالابار میں کسی بھی ہندو کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اور یہ سوچ کر کہتے ہیں کہ خوشحال چند ایک لمبے عرصہ کے لیے ہزار ہا میل کی دوری پر چلے جائیں گے، چلا اٹھیں بہت روئیں اور کہا کہ وہ شری خوشحال چند جی کو جانے نہیں دیں گی۔ لیکن خوش حال چند نے کہا تم روؤ یا کچھ بھی کرو۔ مجھے تو جانا ہی ہے۔

ماتا جی نے روتے ہوئے کہا اور ''لیش'' جو اتنا بیمار ہے اس کا کیا بنے گا؟ والد صاحب نے کہا میں جانتا ہوں اس کی حالت خراب ہے تمھاری صحت کمزور ہے لیکن کسی آدمی کو اس کے سوا اور تو کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ مرجائے اس سے زیادہ کوئی بات ہو تو مجھے اطلاع دے دینا، میں آجاؤں گا۔ ایک رشتہ دار نے ان سے کہا کہ رنبیر کی ماں اتنی دکھی ہے تو آپ جاتے کیوں ہیں۔ پتا جی نے جواب دیا میں وہاں جاؤں گا جہاں ہزاروں رنبیروں کی مائیں زیادہ دکھی ہیں جہاں ہزاروں بچے مدد چاہتے ہیں۔ صرف ایک بچے کے لیے ہزاروں بچوں کو کیسے چھوڑ دوں جنھیں میری زیادہ ضرورت ہے۔ اور تیسرے دن وہ چل پڑے ایک ایسے علاقہ میں جس کی زبان وہ جانتے نہیں تھے۔ لیکن دوسروں کی تکلیف کو وہ اپنی تکلیف سے بھی زیادہ ضروری اور زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

مالابار میں وہ تقریباً چھ مہینے رہے۔ اس لمبے عرصے میں وہ اور ان کے ساتھیوں نے کس طرح کام کیا۔ جن لوگوں نے یہ لیکچر سنے اور یہ تصویریں دیکھیں ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اصل کمی پوری نہیں ہوئی جو روزانہ اخبار نہ ہونے کی وجہ سے

محسوس کی گئی۔ اس لیے تجویز سامنے آئی کہ اخبار نکالا جائے۔ یہ سوال پیدا ہوا کہ اخبار کو شروع کون کرے اور اس کی پالیسی کی دیکھ بھال کون کرے؟ قدرتی طور پر مہاتما ہنس راج جی کے سامنے جو سب سے پہلا نام آیا وہ شری خوشحال چند جی کا تھا۔ شری خوشحال چند جی نے کہا میں تیار ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسے اخبار کی ضرورت ہے جو سچائی کے ساتھ انصاف کرے۔ انگریز کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کے خلاف جہاد کرے اور ملک میں اتفاق بنائے رکھے۔ لیکن روزانہ اخبار چلانے کے لیے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ شروع میں کئی برس تک گھاٹا اٹھانا پڑے گا۔ اس کے لیے روپے چاہیے اور میرے پاس جو کچھ ہے وہ تو آپ جانتے ہیں۔ میں تنخواہ بعد میں لیتا ہوں اسے خرچ پہلے کر دیتا ہوں۔ مہاتما بولے روپے کا انتظام ہو سکتا ہے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کام کے لیے روپے دے سکتے ہیں۔

مہاتما ہنس راج کی ہمت افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شری خوشحال چند جی نے فیصلہ کیا کہ وہ روزانہ اخبار نکالیں گے۔ لڑائی جھگڑے، پھوٹ اور فساد سے ان کو نفرت تھی۔ ان کا مشن تھا ملک اور سماج میں اتحاد۔ اس لیے انھوں نے اخبار کا نام ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے مشورہ سے ملاپ رکھا۔ اس طرح روزانہ ملاپ لاہور میں 13 اپریل 1923 کے روز بیساکھی کے موقع پر جاری ہوا۔ آریہ سماج انارکلی لاہور کی عمارت کے باہری حصہ میں پہلی منزل پر وہ کمرہ جس میں کبھی آریہ گزٹ کا دفتر ہوتا تھا، اس کمرہ کے علاوہ سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو شری خوش حال چند جی کا دفتر تھی اور جہاں سے وہ بڑے کمرے میں دیکھ سکتے تھے۔ اس کمرہ اور کوٹھری میں جس میں ملاپ کا آغاز ہوا تھا وہ آج ایک عظیم انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے۔ جن لوگوں نے قرض کے طور پر شری خوش حال چند جی کو مدد دی تھی ان میں بخشی ٹیک چند جی بھی تھے جو اس وقت لاہور کے سرکردہ وکیلوں میں سے ایک تھے جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے ایک ہزار روپے دیے۔ فیروز پور کے ایک شخص سیٹھ ہرجی مل نے پانچ سو روپے دیے۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگوں نے وقت وقت پر مدد کی جو بعد میں واپس کر دی گئی۔ لاہور میں ان دنوں ایک بینک تھا۔ یونائیٹڈ بینک۔ اس کے مینجنگ ڈائرکٹر لالہ لال چند جی نے شری خوشحال چند جی سے کہا آپ کو جتنے روپے کی ضرورت ہو وہ میرے بینک سے بغیر ضمانت کے قرض لیجیے۔ اس طرح یہ بھی ایک مدد ہوئی۔ ایک دن ملاپ کی پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا وہ پرچہ مل گیا جو 13 اپریل 1933 کے روز شائع ہوا تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر ملاپ کے مشن کا ایک شعر درج ہے:

ہر ایک شکستہ دل کی ہمت بڑھائے گا یہ
حب وطن کے دلکش نغمے سنائے گا یہ

شعر کے اوپر اوم کا جھنڈا ہے۔ اس کے نیچے پہلے ہندی میں پھر اردو میں روزانہ ملاپ لاہور لکھا ہوا ہے۔ ساتھ ہی لکھا ہے ایڈیٹر خوش حال چند خورسند۔ پہلے صفحہ پر ایک نظم ہے ملاپ کا خیر مقدم، جسے شری پریم ناتھ جی الفتؔ نے لکھا۔ اس کے شروع کا بند ہے:

کیا پر امید مژدہ نو روز لا رہا ہے
یعنی ملاپ روئے عالم پر آ رہا ہے
آتا ہے بانکپن سے، دل کو لبھا رہا ہے
سرمست جام الفت سب کو پلا رہا ہے
او آنے والے آجا آنا تجھے مبارک
بھارت کے گلستاں میں گانا تجھے مبارک

اسی پہلے پرچہ میں شری خوش حال چند جی نے خود جو لیڈنگ آرٹیکل لکھا تھا اس کے یہ الفاظ ملاپ کے مشن کو عیاں کرتے ہیں۔

"سوراجیہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی مختلف قوموں کا اتحاد لازمی چیز ہے۔ بھارت کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان جب تک متحد نہیں ہوتیں تب تک آزادی ایسی نعمت میسر نہیں ہو سکتی۔"

ان دنوں پہلے صفحہ کا آدھا حصہ اخبار کی پیشانی ہوتی تھی باقی آدھے حصہ میں خبریں نہیں بلکہ کوئی نظم یا مضمون چھاپا جاتا تھا۔ کافی عرصہ ایک صاحب شری موہن لال بھٹنا گر ایڈوکیٹ ملاپ کے پہلے صفحہ پر اپنے مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ دوسرے اور تیسرے صفحہ پر بھی خبریں نہیں ہوتی تھیں۔ دوسرے صفحہ پر لیڈنگ آرٹیکل ہوتا تھا۔ تیسرے صفحہ پر واقعات و یا کھان کے عنوان سے مختصر نوٹ، لیڈنگ آرٹیکل کی بغل میں پورا ایک کالم وید و منتر کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ ہر روز ایک نیا وید و منتر ترجمہ اور ویا کھان کے ساتھ دیا جاتا تھا جسے شری امر ناتھ جلال پوری لکھتے تھے۔

ملاپ ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا کی خبریں لیتا ضرور تھا لیکن انھیں شائع کیا جاتا تھا اخبار کے پانچویں، چھٹے، ساتویں صفحہ پر۔ باقی آٹھ صفحے مضامین یا نظموں سے بھرے رہتے تھے۔ اخبار بارہ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔

مہاشہ خوش حال چند خورسند اور شری رنبیر کٹر ہندو آریہ سماجی تھے۔ان کی تحریریں بھی ہندو ازم کو تقویت فراہم کرنے والی ہوا کرتی تھیں۔لیکن وہ پکے قوم پرست بھی تھے۔اخبار ملاپ میں بھی پرتاپ کی مانند ہندی کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔پالیسی بھی اس کی تقریباً وہی ہے۔اس میں ہندو مذہب سے متعلق مضامین زیادہ شائع ہوتے ہیں۔

شری رنبیر نے متعدد ملکوں کے دورے کیے تھے۔انھوں نے پہلا غیر ملکی دورہ 1952 میں کیا تھا۔وہ 1958 میں جنرل ایوب خاں کی دعوت پر پاکستان گئے تھے۔انھوں نے روس، تاشقند، مصر وغیرہ کا بھی دورہ کیا تھا۔انھوں نے 70 سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔جن میں 18 کتابیں ان کے والد پر ہیں۔ان کی قابل ذکر تصانیف میں ناگیشور، نیل کی دلہن، ایک دن کا بادشاہ، پانچ پرمیشور کی کرم بھومی، پھانسی کی کوٹھری سے، یگ پرش گورو گوبند سنگھ، شری آنند سوامی سرسوتی اور باپ کا خط بیٹی کے نام کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

◆◆◆

سلامت علی مہدی

سلامت علی مہدی کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور 1988 میں ان کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ ان کی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے غالباً 1940 میں ممبئی کے روزنامہ انقلاب سے اپنی صحافت کا آغاز کیا۔ بعد میں وہ دہلی آئے اور ادارہ شمع سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ''شبستاں'' ڈائجسٹ کی ادارت سنبھالی اور اسے مقبولیت کی بلندی پر پہنچایا۔ اس میں وہ ''ملاقاتی'' کالم کے تحت اہم شخصیات کے انٹرویوز کیا کرتے تھے۔

سلامت علی مہدی نے یوں تو کئی اخباروں میں کام کیا تھا لیکن ہفت روزہ ''عوام'' نے اور بعد میں ہفت روزہ ''بنیاد'' نے ان کو مقبولیت کے بام پر پہنچا دیا۔ اخبار عوام معتبر اور معروف صحافی مہدی نظمی نے شروع کیا تھا۔ بعد میں وہ انور دہلوی کے پاس چلا گیا۔ انور دہلوی سے رحمٰن نیر نے لے لیا۔ جب سلامت علی مہدی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو اس اخبار کی سرکولیشن میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ لیکن سرکولیشن میں اس اضافہ کا ایک سبب جہاں سلامت علی مہدی کا منفرد، پر اثر اور پر کشش انداز تحریر تھا وہیں دوسرا سبب ان دنوں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری، مقدمہ بازی اور پھر پھانسی کا واقعہ بھی تھا۔ وہ اخبار میں ایسی سرخی لگاتے تھے کہ ایک نظر پڑتے ہی قاری اسے خریدنے پر مجبور ہو جاتا۔ بھٹو کی پھانسی کے زمانے میں اخبار عوام دہلی کا کثیر الاشاعت اخبار بن گیا۔ انھوں نے بعد میں بھٹو پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا اخبار ''بنیاد'' نکالا۔ وہ بھی ہفت روزہ تھا۔ لیکن اس کے نصیب میں وہ شہرت نہیں آئی جو عوام کے حصے میں آئی تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک نہیں چلا، بند ہو گیا۔

سلامت علی مہدی نے اپنا ایک ڈائجسٹ ''آنچل'' نکالا تھا جو نام ہی سے ظاہر ہے خواتین کا

ڈائجسٹ تھا۔ انھوں نے ایک ماہنامہ ''سب رنگ'' بھی نکالا تھا۔ لیکن شبستاں اور آنچل کی قسمت میں جتنی مقبولیت آئی اتنی سب رنگ کی قسمت میں نہیں آئی۔ اس لیے وہ زیادہ دنوں تک اپنی بہار نہیں دکھا سکا۔ ان کے اخباروں اور رسالوں کے نہ چلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک اچھے صحافی تو تھے لیکن مینجمنٹ میں صفر تھے۔ وہ سرمایے کا انتظام تو کر سکتے تھے لیکن اس کو کیسے استعمال کیا جائے اس فن میں کورے تھے۔ ظاہر ہے اخبار اور رسالے صرف قلم کی طاقت پر نہیں چلتے ان کے لیے پیسے کی طاقت بھی ہونی چاہیے۔ ایسے بہت سے کامیاب صحافی گزرے ہیں جو مینجمنٹ میں ناکامی کے سبب دریائے گمنامی میں غرق ہو گئے۔

سلامت علی مہدی نے اردو صحافت کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ ان سے پہلے اخباروں میں اس انداز کی سرخیاں نہیں لگائی جاتی تھیں جیسی کہ وہ لگاتے تھے۔ قارئین کی نبض پر ان کی انگلی تو تھی ہی قلم پر بھی تھی۔ وہ اپنے قلم سے جیسا چاہتے ویسا کام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو اخباروں کو جذباتی سرخیاں اور جذباتی انداز بیان میں مضامین لکھنے کا ہنر سکھایا۔ بہت سے لوگ ان کی جذباتیت کو سنسنی خیزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ان کو قریب سے جاننے والے اور ان کی تحریروں کے مداح اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ دہلی کے معروف ادیب ڈاکٹر فیروز دہلوی کے خیال میں ''سلامت علی مہدی سرخیوں اور مضامین میں اور خبروں میں بھی جذبات نگاری کرتے تھے۔ اسے سنسنی خیزی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تحیر پسند شخص تھے۔ سسپنس پیدا کرنا جانتے تھے''۔ ان کو معلوم تھا کہ کس انداز میں چیزیں پیش کی جائیں کہ لوگ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ وہ جہاں بہترین ''مال'' کے قائل تھے وہیں بہترین ''پیکنگ'' کے بھی قائل تھے۔ بہت سے لوگ ان پر زرد صحافت کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ اس کی تردید کرتے ہیں۔

ان کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ جس وقت وہ شبستاں میں کام کرتے تھے، ان دنوں امریکی رسالے نیشنل جیوگرافی، وائلڈ لائف اور ٹائم میگزین ادارہ شمع میں آتے تھے۔ وہ ان میں سے مضامین کا ترجمہ کرتے۔ ترجمہ کیا کرتے مضمون کی روح کو پہلے اپنے ذہن میں اتارتے پھر اسے کاغذ پر منتقل کر دیتے۔ اس سلسلے میں ان کا انداز یہ تھا کہ پہلے پورا مضمون پڑھ لیتے۔ پھر رسالے کو پلٹ کر رکھ دیتے۔ سگریٹ پیتے۔ پھر ایک بار پیراگراف کے اعتبار سے مضمون کو دیکھتے۔ پھر پلٹ کر رکھ دیتے۔ پھر سگریٹ پیتے۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ان کا قلم چل پڑتا۔ جب وہ لکھنے کے لیے سر جھکاتے تو اس وقت تک نہیں اٹھاتے

جب تک کہ مضمون مکمل نہ ہو جائے۔ اس درمیان وہ دنیا جہان سے بے خبر ہو جاتے۔ مضمون مکمل کرنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتے اور براہ راست کاتب کو دے دیتے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ پورا کا پورا مضمون اردو میں منتقل ہو جاتا۔ یہاں تک کہ انگریزی میں جہاں سے پیراگراف شروع ہوتا اردو میں بھی وہیں سے شروع کرتے۔ وہ مضمون کو اپنے انداز میں تو لکھ دیتے لیکن مضمون کی روح ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔

انھوں نے شبستاں کے کئی خاص نمبر بھی نکالے تھے اور تقریباً ہر نمبر مقبول ہوا۔ غالب نمبر میں انھوں نے ''غالب کی محراب عظمت'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے غالب کی وہ تمام عادتیں یکجا کر دی تھیں جن کو عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔ وہ اس میں اہم شخصیات کے انٹرویو بھی کرتے۔ اسی شبستاں میں انھوں نے ملک کے جید صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کا ایک طویل انٹرویو شائع کیا تھا۔ وہ انٹرویو بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ سے ہی مولانا فارقلیط نے سلامت علی مہدی کو اپنی بہت سی نادر و نایاب کتابیں مفت دے دی تھیں۔

سلامت علی مہدی صحافت میں کسی بندھے ٹکے اصول کے پابند نہیں تھے۔ وہ اپنے صحافتی اصول خود بناتے۔ ہاں ان کا یہ کہنا ضرور تھا کہ اخبار کی زبان ایسی ہو کہ ایک مزدور بھی اسے سمجھ لے اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص بھی۔ وہ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے قائل تھے۔ خبروں اور مضامین میں رنگ آمیزی تو کرتے لیکن اس کا مقصد تحریر کو خوشگوار اور موٴثر بنانا ہوتا۔ وہ اخبار میں اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے قائل نہیں تھے۔ بالکل سیدھے سیدھے بات کرتے اور اس انداز میں کرتے کہ وہ بات سیدھے سیدھے دل میں اتر جاتی۔ وہ مضامین میں عربی، فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی بہت مہتم بالشان جملے تراشتے۔ وہ گنجلک تحریر سے پرہیز کرتے۔ وہ بہت زود نویس بھی تھے۔ بہت کم وقتوں میں مضامین لکھ لیتے۔

سلامت علی مہدی کسی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ لیکن صحافت میں وہ تین لوگوں سے متاثر تھے اور تینوں کی بہت قدر کرتے۔ ایک مولانا محمد عثمان فارقلیط، دوسرے محمد مسلم اور تیسرے مولانا عبد الماجد دریابادی۔ وہ ایک مردم شناس انسان تھے۔ جس کے بارے میں جو رائے دے دی وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی۔ یہ ان کی صحافتی علمیت اور صلاحیت تھی کہ سیاست میں جو پیشین گوئی کر دی وہ ہو کر رہی۔ وہ ہر قسم کا مضمون لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ سیاسی، سماجی، فلمی، ادبی اور دوسری نوعیت کے مضامین بھی وہ خوب لکھتے۔ اس بارے میں ایک تو ان کا وسیع مطالعہ کام

آتا اور دوسرے ان کی خیال آفرینی ان کے قلم کا ساتھ دیتی۔ ان کی قوت حافظہ بھی بہت تیز تھی اور قوت متخیلہ بھی۔ ایک بار جو چیز دیکھ لی اس کی طویل عرصے بعد بھی ایسی منظر کشی کرتے کہ لگتا ابھی ابھی اس سے سابقہ پڑا تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ بیک وقت دو دو تین تین کاتبوں کو میٹر دیتے اور ہر خبر الگ ہوتی۔ وہ اپنے دور کے ایک مہنگے ایڈیٹر تھے۔ دوسروں سے کئی گنا تنخواہ ان کو ملتی۔ لیکن اخبار یا رسالے کے مالک کے لیے گراں نہیں گزرتا۔

وہ حاضر جواب بھی بہت تھے۔ فقرہ بازی میں ماہر تھے۔ چست جملے کسنے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مثال کے طور پر یومیہ اخبار نکالنے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ روزنامہ اخبار نکالنا روزانہ ایک جنازہ اٹھانے جیسا ہے۔ وہ بہت دلچسپ گفتگو کرتے۔ ایک بار جس سے بات کر لیں وہ ان کا مداح ہو جاتا تھا۔

وہ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کے بھی دھنی تھے۔ ان کے اندر خطابت کا بھی جوہر تھا۔ وہ اپنی اس صلاحیت کا استعمال سیاسی جلسوں میں بھی کرتے اور مذہبی جلسوں میں بھی۔ وہ جتنی مؤثر سیاسی تقریر کرتے تھے اتنی ہی پر اثر مذہبی تقریر بھی کرتے۔ یہاں تک کہ سیرت النبیؐ کے جلسوں میں بھی انھیں بلایا جاتا۔

وہ خورد نواز تھے۔ انھوں نے صحافت میں ایک نسل کی تربیت کی ہے۔ ان سے تربیت یافتہ کئی صحافیوں نے اس میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ جن میں ہفت روزہ اخبار نو کے مدیر، سابق رکن پارلیمنٹ اور سابق سفیر ہند جناب م۔ افضل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ م۔ افضل کے مطابق سلامت علی مہدی ایک زبردست صحافی تھے۔ وہ صحافت میں ان کے استاد دوم تھے۔ پہلے استاد مولانا عبد الوحید صدیقی تھے۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جہاں نو واردان صحافت کی حوصلہ افزائی کرتے وہیں اپنے یہاں کام کرنے والے صحافیوں کے نام اخبار میں چھاپنے کے سلسلے میں بھی قطعاً بخیل نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنا واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ ایک روز حاجی انیس دہلوی کے دفتر میں سلامت صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حاجی جی نے ان سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ م۔ افضل ہیں اور ''نئی دنیا'' میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں یہ نام تو سنا ہوا ہے۔ بقول افضل صاحب اس وقت تک وہ نئی دنیا چھوڑ چکے تھے اور اختلاف اخبار میں نام چھاپنے کے سوال پر ہوا تھا۔ سلامت علی مہدی سے انھوں نے کہا کہ میں اسکول میں ٹیچر بھی ہوں اور صحافت بھی کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم میرے اخبار

''بنیاد'' میں کام کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ ضرور کروں گا۔ اس پر سلامت صاحب نے کہا کہ میں تمھیں ڈھائی سو روپے ماہانہ تنخواہ دے سکوں گا اس سے زیادہ نہیں۔ م۔ افضل نے کہا کہ آپ تنخواہ جو چاہیں دیں لیکن آپ کے اخبار میں کام کرنے کی میری ایک شرط ہے وہ یہ کہ آپ اخبار میں میرا نام دیں گے۔ بقول م۔ افضل سلامت علی مہدی نے اس پر ایک ایسا جملہ کہا جو میں نہیں بھول سکا اور جو آج تک مجھے یاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''افضل صاحب میں پرنٹر پبلشر نہیں ہوں میں ایک صحافی بھی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ایک صحافی کے لیے نام کی کیا بھوک ہوتی ہے، میں آپ کا نام دوں گا۔ آپ میرے یہاں کام کیجیے''۔ اس کے بعد افضل صاحب نے ان کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔

سلامت علی مہدی نے ان سے کہا کہ اردو صحافت میں ایک شعبہ خالی ہے۔ اگر تم اس پر کام کرو تو بہت اچھا رہے گا۔ اس وقت 1980 میں نئی پارلیمنٹ وجود میں آئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تم نو منتخب ممبران پارلیمنٹ کے انٹرویو کرو۔ اردو صحافت میں انٹرویو کرنے کی روایت ابھی قائم نہیں ہوئی ہے۔ سب سے پہلے کانپور سے جیت کر آئے ایک نوجوان ممبر پارلیمنٹ عارف محمد خاں کا انٹرویو کرو۔ بقول م۔ افضل اس کے بعد انھوں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کر دیا اور اردو صحافت میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا۔

سلامت علی مہدی اپنے دفتر میں کام کرنے والوں کو پیسے دینے میں بخیل تھے۔ البتہ خود پر اور اپنے دوستوں پر خوب خرچ کرتے تھے۔ بقول م۔ افضل وہ تھے تو خراج لیکن کارکنوں کے لیے نہیں۔ افضل صاحب کے مطابق سلامت علی مہدی کی بربادی میں خود انہی کا ہاتھ تھا۔ وہ رنگین مزاج شخص تھے اور ناؤ ونوش سے بھی زبردست رغبت رکھتے تھے۔ وہ اپنی ساری کمائی اسی میں اڑا دیتے تھے۔ سلامت علی مہدی کو قریب سے جاننے والے دیگر بہت سے لوگ بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ان کے اندر یہ عیب نہ ہوتا تو وہ آخری دنوں میں مفلوک الحالی کی زندگی نہیں گزارتے۔ جناب م۔ افضل ایک اور واقعہ سناتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک روز وہ بنیاد کے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں کوئی ان سے ملنے آیا۔ انھوں نے اس سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور بہت اچھے صحافی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سلامت صاحب مجھے اس وقت پیسوں کی ضرورت ہے تعریف کی نہیں۔ آپ مجھے پیسے دیجیے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ''افضل تم میری ایک بات نوٹ کر کے رکھ لو کہ تم ایک دن اپنا اخبار نکالو گے''۔

بقول افضل صاحب مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا اور میں نے کہا کہ یہاں حالات اتنے سخت ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اپنا اخبار نکالوں گا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور ایک دن واقعی انھوں نے اپنا اخبار نکالا۔ وہ اخبار ''اخبارِ نو'' تھا جس کی کاپی انھوں نے سلامت صاحب کو لکھنؤ بھی بھیجی جو اس وقت تک لکھنؤ جا چکے تھے اور بیمار رہا کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ وہی م۔ افضل ہیں جو ان کے یہاں کام کرتے تھے تو انھوں نے ان کے اخبار میں کالم لکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ کالم کا تسلسل قائم نہیں رکھ سکے اور چند کالموں کے بعد ان کا مضمون آنا بند ہو گیا لیکن بقول افضل صاحب وہ کافی دنوں تک اعزازیہ بھیجتے رہے اور ان کے کشمیر جا کر علاج کرانے کے سلسلے میں انھوں نے انتظام بھی کیا تھا۔

ان دنوں بعض اخبار اور رسالے والے دواخانہ بھی چلاتے تھے۔ جس کی کامیابی کا انحصار ان خطوط پر ہوتا جو مریضوں کو لکھے جاتے۔ ایسے بہت سے خطوط سلامت علی مہدی نے بھی لکھے۔ لیکن مریض یہ سمجھتے رہے کہ ''بڑے حکیم صاحب'' نے خط لکھا ہے۔ اس شعبے میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا۔ وہ ایسا پر اثر خط لکھتے کہ نصف بیماری خط پڑھنے سے ہی دور ہو جاتی اور نصف دوا سے چلی جاتی۔ ہر مریض کو یہ لگتا کہ بڑے حکیم صاحب نے اس کے کیس پر خصوصی توجہ دی ہے اور یہ رازدارانہ خط صرف اسی کو لکھا گیا ہے۔

وہ ایک صحافی کے علاوہ ایک ناول نگار بھی تھے۔ افسانے بھی لکھتے تھے اور بوقت ضرورت شاعری بھی کرتے تھے۔ وہ ناول میں ادبی زبان استعمال کرتے اور منظر کشی بہت غضب کی کرتے۔ ان کے یوں تو تمام ناول مشہور ہوئے لیکن دو ناول بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ایک ''زمرد'' اور دوسرا ''کفرستان''۔ آخر الذکر ناول کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے۔ وہ اتنے زود نویس تھے کہ ایک رات میں ایک ناول لکھ دیا کرتے تھے۔ دہلی کے پبلشر ان کے ناولوں کا انتظار کرتے۔ ان کے قریب رہنے والے بتاتے ہیں کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد ساغر و مینا سے رسم و راہ پیدا کرتے اور پھر ان کا قلم چل پڑتا۔ اگلے دن وہ ناول کوئی نہ کوئی پبلشر خرید لیتا۔ وہ اپنے نام سے بھی لکھتے اور اپنی اہلیہ رابعہ باٹلی والا کے نام سے بھی لکھتے۔ انھوں نے تاریخی کرداروں پر بھی متعدد ناول لکھے ہیں۔ زمرد بہادر شاہ ظفر کی ایک کنیز کے کردار پر تھا۔ انھیں خود اپنا یہ ناول بہت پسند تھا اور اپنے دوستوں کی محفلوں میں خود اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔

وہ مسلکاً شیعہ تھے لیکن خود کو سنی کہتے تھے۔ ان کی زیادہ تر رشتے داریاں بھی سنیوں میں

تھیں۔ وہ مذہب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اسی لیے روزہ نماز وغیرہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کو برباد کرنے میں ان کی اپنی بدعادتیں زیادہ ذمہ دار ہیں جن میں ان کی رنگین مزاجی اور بادہ خواری نے اہم رول ادا کیا۔ بہت سے لوگ ان کی ان عادتوں کی وجہ سے ان کو ناپسند کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ اگر وہ ان خرافات میں گرفتار نہ ہوئے ہوتے تو ان کا آخری وقت اتنا عبرت ناک نہ ہوتا۔

وہ سیاسی اعتبار سے جے پرکاش نرائن سے متاثر تھے۔ رام منوہر لوہیا کے نظریات کو بھی پسند کرتے تھے۔ وہ ایمرجنسی میں اندرا حکومت کے شدید مخالف ہو گئے تھے۔ لیکن جنتا پارٹی کی حکومت میں اس کی غلط پالیسیوں کے سبب اس کے بھی مخالف ہو گئے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ بین الاقوامی شخصیات میں یاسر عرفات اور کرنل قذافی سے عقیدت رکھتے تھے۔ وہ یاسر عرفات کو فلسطینیوں کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ فلمی دنیا کے لوگوں سے بھی ان کے مراسم تھے۔

اتنے بڑے صحافی کے آخری دن بے حد کسمپرسی میں گزرے۔ ان دنوں وہ لکھنؤ میں اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے تھے۔ معتبر ذرائع کے مطابق ان کے پاس علاج معالجہ کے لیے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر کم وبیش ۶۵ سال رہی ہوگی۔ اس دوران انھوں نے اپنے کئی مخلصین سے مدد کی اپیل کی تھی۔ ہفت روزہ ''نئی دنیا'' کے مالک و مدیر جناب شاہد صدیقی سے بھی ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کے نام بھی انھوں نے خط لکھا تھا اور جناب م۔ افضل کے نام بھی۔ اس تعلق سے انھوں نے روزنامہ ''جدید خبر'' کے مدیر معصوم مرادآبادی کے نام بھی، جو کہ ان دنوں نئی دنیا میں برسرکار تھے، دو خطوط لکھے تھے۔ پہلا خط 6 جولائی 1988 کو تحریر کیا گیا تھا اور دوسرا 16 جولائی 1988 کو۔ پہلے خط میں وہ لکھتے ہیں:

''برادرم جناب معصوم مرادآبادی صاحب السلام علیکم۔ مجھے بڑا دکھ ہوا ہے کہ آپ اور عزیزم شاہد صدیقی صاحب اردو تحفظ کنونشن میں شرکت کے لیے 19 جون کو لکھنؤ میں موجود تھے اور مجھے اس کی خبر تک نہ تھی۔ اپنی بیماری کی وجہ سے میں خود اس کنونشن میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب میرے بارے میں ایک تازہ خبر پڑھیے۔ 24 جون کو میرے سینے میں درد ہوا اور پھر دل کا دورہ پڑ گیا۔ مجھے فوراً بلرامپور سرکاری اسپتال میں لے جایا گیا جہاں میرا ECG ہوا اور فوری طبی سہولت دی گئی۔ لیکن میں بھرتی نہیں ہوا کیونکہ اب یوپی کے سرکاری اسپتالوں میں دوا اور علاج کی پوری قیمت لی جاتی ہے اور جرنلسٹوں کو جو مفت علاج کی سہولت حاصل تھی وہ بھی ختم کی جا چکی ہے۔ ان

حالات میں دوستوں اور بہی خواہوں سے امداد لینے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔
اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ عزیزم شاہد صدیقی صاحب کے نام میرا منسلکہ خط آج ہی ان کو دے دیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے لیے ان کے دل میں درد ہے وہ فوراً مجھے اتنی رقم کا منی آرڈر ضرور بھیج دیں گے کہ میں اسپتال میں بھرتی ہو کر کم از کم پندرہ دن تک اپنا علاج کرواسکوں۔
مجھے امید ہے کہ آپ میرا یہ کام ضرور کریں گے۔آپ کے مضامین پڑھتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوں کیونکہ یہ تعریف کے قابل ہوتے ہیں۔

جواب کا منتظر: سلامت علی مہدی۔6 جولائی 1988''۔

جبکہ وہ دوسرے خط میں لکھتے ہیں: ''برادرم معصوم مرادآبادی صاحب! السلام علیکم۔ایک رجسٹری خط بھیج چکا ہوں جس میں ایک خط عزیزم شاہد صدیقی صاحب کے نام بھی تھا۔ یہ خط ایک اور گزارش کرنے کے لیے لکھا ہے۔ اگر آپ کے اخبار میں ایک مختصر سا شجرہ شائع ہو جائے جس میں وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے یہ اپیل ہو کہ وہ میری خطرناک بیماری کے پیش نظر میری PM ریلیف فنڈ سے امداد کر دیں تو میرا علاج معالجہ ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے میں ٹھیک ہی ہو جاؤں۔ ویسے آثار اچھے نہیں ہیں۔ مجھے شام کو سورج ڈوبنے کے بعد یہ یقین ہی نہیں ہوتا ہے کہ میں دوسرے دن کا سورج دیکھ سکوں گا۔آپ میرا خط شاہد صاحب کے سامنے رکھ دیں باقی ان کی مرضی پر منحصر ہے۔

دعا گو: سلامت علی مہدی

16 جولائی 1988''۔

اس کے بعد حاجی انیس دہلوی نے اپنے رسالے ''فلمی ستارے'' میں اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے مدد کی اپیل شائع کی تھی۔ ستمبر 1988 کے شمارے میں شائع اس اپیل کا عنوان ہے ''اردو کے عظیم صحافی سلامت علی مہدی کو بے بسی کی موت نہ مرنے دیا جائے، وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ہمدردانہ اپیل''۔اس اپیل میں تحریر تھا:

''سلامت علی مہدی...... اردو کے ایسے صحافی، ادیب اور افسانہ نگار کا نام ہے جسے اردو کا ہر قاری جانتا ہے اور ان کی تحریروں سے پوری طرح واقف ہے۔آپ نے گزشتہ چالیس سالوں کے دوران ملک کے کئی جریدوں کے ذریعے اپنے وطن اور قوم کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔لیکن اب......وہ تھک چکے ہیں اور تقریباً چھ سال سے دل اور پھیپھڑوں کے

موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ دہلی کی رہائش گاہ ترک کر کے اپنے آبائی وطن لکھنؤ میں صاحب فراش ہیں۔ ان کی زندگی ایک شکستہ جہاز کی طرح کھلے سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ قلب پر ہر وقت ایک نا معلوم سا بوجھ رہتا ہے۔ اپنے ایک دردناک خط میں موصوف تحریر فرماتے ہیں 'کبھی میری دنیا بھی رنگین خوابوں کی بستی تھی۔ اس میں تصورات کے سنہری محل کھڑے مسکرایا کرتے تھے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کا ایک ہجوم تھا۔ ولولوں اور امنگوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اب یاس و ناامیدی کا کھنڈر ہے۔ رنگین خواب بکھر گئے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ زندگی کے یہ مسرت آمیز لمحات جاڑے کی دھوپ اور بادل کی چھاؤں ہوتے ہیں۔ میرے مالی حالات بدستور خراب ہیں اور اب مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ بیماری کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔ بیماری اور بیکاری یکجا ہو جائیں تو انسان بالکل ہی تباہ ہو جاتا ہے'۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سلامت علی مہدی مسلسل بیماری اور بیکاری سے بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔ ان کا دم لبوں پر ہے۔ ان کا ہر لمحہ اذیت ناک ثابت ہو رہا ہے۔ وہ بیک وقت زندگی اور موت سے لڑتے ہوئے تھکے جا رہے ہیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ چند سال قبل آنجہانی اندرا گاندھی نے وزیر اعظم فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم سے ان کی مالی امداد کی تھی اور کشمیر سرکار نے سری نگر کے اسپتال میں ان کو زیر علاج بھی رکھا تھا۔ جس کے نتیجے میں افاقہ ضرور ہوا تھا۔ لیکن اب پہلے سے بھی زیادہ ابتر حالت میں ہیں۔ ان حالات میں سلامت علی مہدی کی تحریروں کے شیدائی، ان کے دوست احباب اور ان کے پرستاروں سے اپیل ہے کہ وہ ان کی مالی امداد کریں۔ تاکہ وہ اپنا علاج جاری رکھ سکیں اور خاص طور پر ملک کے نوجوان اور ہمدرد وزیر اعظم راجیو گاندھی سے التماس ہے کہ وہ ان کی بروقت امداد فرما کر ایک سچے محب وطن اور اردو کے عظیم صحافی کی کشتی حیات ڈوبنے سے بچائیں۔ امداد میں تاخیر ہوئی تو اس کا وہ فائدہ نہیں ہوگا جو ہونا چاہیے۔ علاج میں تاخیر بیماری میں اضافہ کر سکتی ہے۔ امید ہے وزیر اعظم جلد توجہ فرمائیں گے۔ سلامت علی مہدی کو فوری امداد پہنچانے پر تمام محبان اردو آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ درخواست کنندہ: ''فلمی ستارے'' میگزین۔ دہلی (یکم اگست 1988)۔ سلامت علی مہدی کا پتہ: سلامت علی مہدی، کوٹھی شہزادے عالم، 18، کنگھی والی گلی، نخاس، لکھنؤ-3-یوپی''۔

بتایا جاتا ہے کہ راجیو گاندھی نے اس اپیل پر کارروائی کی اور ایک رقم لکھنؤ بھجوائی لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی اور سلامت علی مہدی اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کے انتقال پر اردو

اخباروں میں کچھ زیادہ نہیں چھپا۔ غالباً لوگوں کو معلوم نہیں ہو سکا یا تاخیر سے انتقال کی خبر ملی یا پھر لوگوں نے اس میں بوجوہ دلچسپی نہیں لی۔ البتہ ممبئی کے ہفت روزہ ''بلٹز'' نے ان کی ایک بڑی سی تصویر لگا کر ان کے انتقال کی خبر چھاپی تھی۔

سلامت علی مہدی نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں کچھ کے نام یوں ہیں: کفرستان (یہ کتاب 1963 میں تصنیف کی گئی اور اس کے چھ ایڈیشن چھپے)۔ ایمر جنسی کی قیامت (یہ 1977 میں شائع ہوئی تھی)۔ آخری خط (یہ ایک جذباتی ناول ہے جو 1966 میں لکھا گیا اور اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے)۔ زمرد، روح کی سرگزشت، شاہ فیصل، سوویت مسلمان (دو ایڈیشن)، وسطی ایشیا کی جمہوریتیں جہاں مسلمان بستے ہیں (دو ایڈیشن)، تابوت، شیخ مجیب الرحمٰن کا قتل اور بھٹو کی پھانسی۔

◆◆◆

مفتی شوکت علی فہمی

مفتی شوکت علی فہمی کی پیدائش 24 دسمبر 1901 کو میرٹھ کے مفتیوں کے ایک خاندان میں ہوئی اور ان کا انتقال 14 اپریل 1993 کو دہلی میں ہوا۔ ان کے والد کا نام برکت علی تھا۔ وہ میرٹھ کے مفتیوں، ہاشمیوں اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1857 میں اس خاندان نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے مسلم فوجیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ مفتی شوکت علی فہمی 1923 میں دہلی آ گئے تھے۔ ان کے ماموں زاد بھائی محمد انوار ہاشمی ان دنوں ''دین دنیا'' نام سے ایک رسالہ شائع کرتے تھے جس کے ایڈیٹر سید ظہور احمد وحشی شاہ جہاں پوری تھے اور سرپرست خواجہ حسن نظامی تھے۔ بعد میں سید ظہور احمد کو ایک معاون کی ضرورت ہوئی اور مفتی شوکت علی فہمی کو ایڈیٹوریل میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح یہ رسالہ 1923 سے سید ظہور احمد اور شوکت علی فہمی کی مشترکہ ادارت میں نکلنے لگا۔

جب وہ دہلی آئے تو خواجہ حسن نظامی کی قربت سے فیضیاب ہوئے۔ وہ ایک طویل عرصے تک خواجہ صاحب کے زیر تربیت رہے۔ 1923 سے 1964 تک مفتی شوکت علی دین دنیا کے مدیر رہے۔ انھوں نے دوسرے اخبار و رسائل بھی نکالے۔ 1935 میں جب خواجہ حسن نظامی نے روزنامہ ''عادل'' نکالا تو انھوں نے اس کا ایڈیٹر مفتی صاحب کو بنایا۔ اس سے قبل 1925 میں انھوں نے ''طاقت'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا تھا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی پیروی کی جاتی وہ الہلال کی مانند باتصویر تھا۔ اس اخبار پر برطانوی حکومت کی جانب سے کئی مقدمات قائم ہوئے۔ جس کی وجہ سے وہ بند ہو گیا۔ 1937 میں انھوں نے ماہنامہ دین دنیا کو ہفت روزہ اخبار میں تبدیل کر دیا جو 1947 تک نکلتا رہا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد اخبار و پریس کے

اخبار عادل کو سہ روزہ کی شکل میں جاری کیا جو 1947 تک نکلتا رہا۔ مگر اس کا عملہ بھی پاکستان چلا گیا اور اسے بھی بند کرنا پڑا۔ انھوں نے 1937 میں ماہنامہ ''اسلامی دنیا'' جاری کیا۔ 1947 میں پورے عملہ کے پاکستان چلے جانے کے بعد وہ بند ہو گیا۔ انھوں نے 1937 میں روزنامہ وہ بھی بند ہو گیا۔ ادھر دین دنیا 1947 سے 1951 تک بند رہنے کے بعد 1952 میں پھر شروع ہوا۔ اس بار اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ انھوں نے 1963 میں ایک اور ماہنامہ ''سیاسی دنیا'' کے نام سے نکالا۔ جو دین دنیا کی مانند ایک خوبصورت رسالہ تھا۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ رسالہ دو سال تک نکلنے کے بعد ہزاروں روپے کے خسارے کے ساتھ بند ہو گیا۔ لیکن دین دنیا نکلتا رہا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے آصف فہمی اسے نکال رہے ہیں۔

مفتی شوکت علی فہمی اپنے سیاسی مضامین میں حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید بھی کرتے تھے۔ جبکہ اصلاحی مضامین میں مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے۔ انھیں صحافتی خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈ ملے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ جن میں مکمل تاریخ اسلام، ہندوستان پر اسلامی حکومت، ہندوستان پر مغلیہ حکومت، انگریز کا شرمناک دور حکومت اور ہند اور پاکستان کے اولیا قابل ذکر ہیں۔ وہ مجاہد آزادی بھی تھے اور مفسر قرآن بھی تھے۔ ان کی تقریریں لوگ بہت شوق سے سنتے اور پڑھتے تھے۔ رسالہ دین دنیا ان کے دور میں اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا۔ سادہ اور عام فہم زبان و بیان کی وجہ سے قارئین میں کافی مقبول تھا۔ اس کی سرکولیشن بھی خاصی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد اس میں وہ بات نہیں رہ گئی۔ ان کے صاحبزادے آصف فہمی نے ان کی حیات و خدمات پر ایک کتاب شائع کی ہے جس میں ان کے حالات زندگی کے علاوہ ان کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے منتخب مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ''مفتی شوکت علی فہمی: حیات و خدمات'' ہے۔

◆◆◆

ظفر پیامی

ظفر پیامی کا اصل نام دیوان بریندر ناتھ ہے۔ وہ 6 جنوری 1932 کو کپورتھلہ پنجاب کے ایک باعزت خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 10 جنوری 1989 کو دہلی میں ہوا۔ ان کے دوست اور اہل خاندان ان کو بندی، بندر، ظفر، ظفر بھائی، بندر بھائی اور دیوان صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دانشور، ایک مفکر، ایک ادیب، ایک دردمند انسان، ایک ذمہ دار اور سیکولر شہری اور ایک جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی روایت تھے۔

انھوں نے 17 سال کی عمر سے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں اور اٹھارہ سال کی عمر میں سری نگر کشمیر سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تعمیر" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ وہ صرف اردو کے ہی صحافی نہیں تھے بلکہ ہندی، پنجابی اور انگریزی میں بھی کالم نویسی کرتے تھے۔ اردو میں وہ ظفر پیامی کے قلمی نام سے اور دیگر زبانوں میں دیوان بریندر ناتھ کے نام سے لکھتے تھے۔ ان کو بڑی شخصیات سے انٹرویو کرنے سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے متعدد ملکوں کے دورے کیے اور وہاں کے رہنماؤں کے انٹرویوز لیے۔ ان انٹرویوز کو وہ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی شائع کرواتے۔ وہ صرف پرنٹ میڈیا کے صحافی نہیں تھے بلکہ الیکٹرانک میڈیا کے بھی صحافی تھے۔ ان کا تعلق ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی رہا ہے۔ ریڈیو پر حالات حاضرہ پر ان کے تبصرے خاصے مقبول تھے۔ رات میں سوا نو بجے نشر ہونے والا ان کا تبصرہ سامعین بڑی دلچسپی سے سنتے۔

انھوں نے 70 کی دہائی میں "پریس ایشیا انٹرنیشنل" کے نام سے ایک فیچر اینڈ نیوز ایجنسی شروع کی تھی۔ جس میں ان کے ساتھ ان کی صحافی اہلیہ منورما دیوان بھی کام کرتی تھیں بلکہ

دونوں نے مل کر ہی یہ ایجنسی شروع کی تھی۔ اس ایجنسی نے جہاں ان کو شہرت اور عزت سے نوازا وہیں بقدر ضرورت یافت بھی ہونے لگی اور زندگی کی گاڑی پٹری پر آسانی سے دوڑنے لگی۔

ظفر پیامی کون ہیں اور دیوان بریندر ناتھ کون ہیں؟ اس سلسلے میں عموماً لوگ غلط فہمی کے شکار ہو جایا کرتے تھے۔ جو نہیں جانتے وہ ان کو مسلمان اور ان کی اہلیہ کو ہندو سمجھتے۔ اس بارے میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے، جو کہ ان کے بہت قریب رہے ہیں اور ظفر پیامی کو بھائی صاحب اور منورما دیوان کو دیدی کہتے رہے ہیں، اپنے ایک مضمون میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ان کے مطابق ہولی اور دیوالی کے موقع پر ڈاکیہ آتا اور میم صاحب کو پوچھتا اور ان سے اپنا انعام حاصل کرتا اور عید بقرعید پر وہ صاحب کو یاد کرتا اور انعام پا کر خوشی خوشی لوٹ جاتا۔ دونوں زندگی بھر اس کو اسی طرح بخشش دیتے رہے لیکن کبھی نہیں بتایا کہ ہم کیا ہیں۔

کشمیر کے زیڈ جی محمد نے بھی اپنے ایک مضمون میں ایسا ہی ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے چچا آل انڈیا ریڈیو سنا کرتے تھے جس پر ظفر پیامی کا حالات حاضرہ پر تبصرہ آتا تھا۔ ہم لوگ ان کو مسلمان سمجھتے رہے۔ اسی دوران ایک نیوز اینڈ فیچر ایجنسی شروع ہوئی جس کا نام ''پریس ایشیا انٹرنیشنل'' تھا جسے دیوان بریندر ناتھ نے شروع کیا تھا۔ میں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کر دیے اور بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دیوان صاحب ظفر پیامی ہی ہیں اور وہ مسلمان نہیں ہندو ہیں۔ اسی وقت یہ بھی پتہ چلا کہ یہ بریندر ناتھ وہی ہیں جو میرے دوست رہے ہیں اور جو نیشنل کانفرنس کے کمیونسٹ نظریہ ساز بی پی ایل بیدی کے بھتیجے ہیں۔ ناموں کے چکر میں ان کو پریشانیاں اٹھانی پڑیں مگر انھوں نے کبھی بھی مذہب کا سہارا نہیں لیا۔ دہلی کے نظام الدین ایسٹ میں وہ جس مکان میں رہتے تھے اس کے مالک نے ان سے اس لیے مکان خالی کروا لیا تھا کہ وہ ظفر پیامی کو مسلمان اور منورما دیوان کو ہندو سمجھتا تھا۔ دونوں نے مکان خالی کرنا گوارہ کر لیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ انسان ہیں اور ہندوستانی ہیں۔

ظفر پیامی واقعتاً ایک سیکولر شہری تھے۔ نہ صرف ذاتی طور پر بلکہ خاندانی اعتبار سے بھی۔ بقول پروفیسر اختر الواسع ''ان کے والد سردار اعلی دیوان بدری ناتھ ہندو، ان کی ماں سکھ، پھوپھی زاد بڑے بھائی اور مربی بی پی ایل بیدی مذہباً سکھ اور نظریاتی اعتبار سے مارکسسٹ، ماں سے زیادہ شفیق اور مہربان بھابھی فریڈا بیدی پہلے مذہباً عیسائی اور بعد میں بدھ مت قبول کر کے راہبہ بن گئیں۔ رفیق سفر اور رفیق حیات مسز منورما دیوان کے والد پرنسپل چھبیل داس پکے انقلابی بلکہ

باغی، بائیں بازو کی آتش نوا تقریروں اور تحریروں کے لیے مشہور، شہید بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کے علمی و فکری رہنما اور استاد، منورما دیوان کی والدہ شریمتی سیتا دیوی عدم تشدد کی پیرو، پکی گاندھیائی، گروکل کانگڑی (ہری دوار) کے بانی آچاریہ رام دیو کی بیٹی، غیر منقسم ہندوستان میں لاہور سے پنجاب اسمبلی کی ممبر اور بعد ازاں ممبر راجیہ سبھا اور ٹریڈ یونین کی لیڈر، ادھر فردوسی اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری سے گہرا نیاز مندی کا رشتہ اور احمد رشید شیروانی سے بھائیوں سے بھی زیادہ گہرا تعلق۔ یہ سب دیکھ کر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ ایسے اور اتنے متضاد عناصر ہمارے یہاں جمع ہو جائیں تو کرفیو نہ سہی دفعہ 144 کے نفاذ کی ضرورت فوراً ہی لاحق ہو جائے گی۔ پھر آپ نے کس طرح توازن برقرار اور بحال رکھا۔ اپنی مخصوص دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ہندوستان کا حسن اور عظمت دونوں اسی وصل خواہی اور صلح کل میں ہے۔ آج لوگوں نے مشترکہ تہذیب اور مشترکہ ثقافت کو صرف نعرہ سمجھا ہے۔ ہم اس میں پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور جیے ہیں۔ ہندوستان کی بقا اور ترقی کی کنجی بھی یہی ہے۔ کاش اس حقیقت کو ہم ہندوستانی سمجھ پاتے"۔

ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں سے خوب ملتے، ان سے باتیں کرتے اور مختلف موضوعات پر ان کے خیالات جاننے کی کوشش کرتے۔ ظاہر ہے اس کے لیے وقت چاہیے۔ وہ وقت نکال لیتے تھے۔ صبح جلد اٹھتے اور ساڑھے نو بجے تک اپنے تمام صحافتی کام نمٹا لیتے اور پھر روشناس خلق کے لیے نکل پڑتے۔ انھوں نے اپنے دل پر جو بہت سے زخم کھائے تھے شاید ان کا بھی تقاضا تھا کہ وہ لوگوں سے ملتے ملاتے اور اس طرح اپنے زخموں کی ٹیس کو مندمل کرتے۔ زخم کیسے تھے۔ لوگوں کی مفلسی اور بے چارگی دیکھ کر تڑپ اٹھتے، عوام کی محرومی و مظلومی بے قرار کر دیتی، ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال انھیں بددل کر دیتی اور اردو کی مظلومی انھیں کسی کل چین نہ لینے دیتی۔ وہ زندگی بھر انہی زخموں کے ساتھ جیتے رہے اور انہی کے ساتھ دنیا کو الوداع بھی کہہ گئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ابن انشا کی یہ غزل بڑے شوق سے سنتے اور اشکبار ہو جاتے کہ انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں دل کا لگانا کیا۔

ظفر پیامی کو بابا نانک سے بھی پیار تھا اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے بھی۔ وہ آخری دنوں میں خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دیتے اور وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اسی طرح وہ گرونانک کی طرف بھی رجوع کرنے لگے تھے۔ ان کی پرورش ایک سکھ فیملی میں ہوئی تھی لیکن

ان کے نزدیک سکھ اور ہندو مذہب میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی شناخت کسی ایک مذہب سے نہیں کروائی بلکہ وہ خود کو ایک انسان اور ایک ہندوستانی کہتے تھے۔ بابا نانک اور بابا نظام الدین سے دونوں کے رشتے ذاتی نوعیت کے تھے۔

مختلف اخباروں اور رسالوں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے بہت دورے کیے۔ انھوں نے مشرق وسطیٰ کے بھی خوب دورے کیے۔ اس خطے سے ان کا ذاتی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں کوئی مفاد پوشیدہ نہیں تھا۔ یہ ایک پیشہ ورانہ رشتہ تو تھا ہی ایک جذباتی رشتہ بھی تھا۔ وہ مسلمانوں کی سماجی، تہذیبی و ثقافتی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ لیکن اس پسندیدگی کی جڑ پنجاب میں تھی جہاں ہندو، سکھ اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ انھوں نے دسمبر 1971 اور جنوری 1972 میں ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں کافی دن گزارے تھے۔ لاہور کی ثقافتی زندگی نے ان پر اور ان کے خاندان پر کافی اچھے اثرات مرتب کیے تھے۔

لیکن وہ پہلے تقسیم ہند اور پھر بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے المناک حالات سے بہت دکھی تھے۔ انھوں نے ''فرار'' نامی ایک ناول لکھا تھا جو اسی پس منظر میں تھا۔ 1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آبادی، جسے بہاری مسلمان کہتے ہیں، بے گھر ہو گئی۔ اسے نہ پاکستان قبول کرتا ہے اور نہ ہی بنگلہ دیش۔ اب بھی وہ کیمپوں میں انتہائی ابتر اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان لوگوں کی تکلیف دہ اور المناک زندگی کو انھوں نے اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔

یہ ناول ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام کی ایسی دلدوز کہانی ہے جس کا ہر کردار اپنے مسائل و مصائب کی صلیب اٹھائے ہوئے ہے۔ بقول ظفر پیامی ''برصغیر کی کہانی از اول تا آخر جنگی قیدیوں، کیمپوں، فوجی چھاؤنیوں، پولیس کی بیرکوں اور گندی بستیوں سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کے مظلوم عوام کا درد فرار میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ہم کہاں کہاں سے بھاگ کر کہاں کہاں ملتے ہیں۔ میاں والی، ملتان، لاہور، دہرہ دون، لکھنؤ، دہلی، کراچی، ڈھاکہ، سیالکوٹ، جالندھر، الہ آباد، کلکتہ، اکھوڑا اور اگرتلہ جو اوروں کے لیے نقشے پر کالے دھبے ہیں ہمارے دل کے داغ ہیں۔ اور جہاں کے خواص کی پریشانی یہ ہے کہ یار آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم جب گھر میں ملتے ہیں تو بھائیوں کی طرح اور بھیڑ میں ملتے ہیں تو قصائیوں کی طرح''۔

ظفر پیامی کے والد دیوان بدری ناتھ کپورتھلہ اسٹیٹ کی جانب سے مشرقی اتر پردیش کے

بہرائچ میں تعینات تھے۔ وہ تین ہی ماہ کے تھے کہ والدہ کی آغوش سے محروم ہو گئے۔ یہ سوچ کر بہرائچ بہت دور ہے، ان کی بیوہ پھوپھی بی بی پھول کوران کو اپنی سسرال ڈیرہ بابا نانک شاہ لے کر چلی گئیں اور وہاں انھوں نے ان کی پرورش کی۔ ان کے دو ہی اولاد تھیں دونوں بیٹے تھے اور وہ انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے۔ لہٰذا پھول کور نے ان کو اپنے بچے کی مانند پالا اور ایک ماں کا پیار دیا۔ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی اور چاہتے تھے کہ بریندر ناتھ ان کے پاس چلے جائیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ان کے والد اور پھوپھی کے درمیان کچھ تلخی پیدا ہوگئی کیونکہ وہ بھی اپنے چھوٹے بندی کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھیں۔ بہر حال اہل خاندان کے دباؤ کے آگے ان کو جھکنا پڑا اور وہ اس پر راضی ہوگئیں کہ وہ بندی کو ان کے والد کے پاس وقتاً فوقتاً بھیج دیا کریں اور ان کے والد چند ہفتوں کے اندر انھیں واپس کپورتھلہ بھیج دیں۔

دیوان بریندر ناتھ تین چار سال کے تھے کہ ان کی پھوپھی کے چھوٹے بیٹے پیارے لال جن کو لوگ بی پی ایل بیدی کہا کرتے تھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی انگریز بیوی فریڈا اور بچے رنگا کے ساتھ ہندوستان واپس آگئے۔ وہ ڈیرا بابا نانک شاہ گئے اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کرنے لگے۔ لیکن ان کی والدہ نے اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا جو کہ اس وقت لاہور میں رہ رہے تھے۔ پی ایل نے وہاں رکشہ چلانے والوں کی ایک یونین تشکیل دی تھی اور وہ ایک ہفت روزہ اخبار ''منڈے مارننگ'' بھی ایڈٹ کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کانگڑا چلے گئے جہاں انھوں نے ایک کسان اسکول قائم کیا اور کسانوں کو سامراجی حکومت اور اس کے استحصالی رویے کے خلاف بیدار کرنے لگے۔

دیوان بریندر ناتھ دس گیارہ سال ہی کے تھے کہ ان کے اندر حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے کھادی کا کرتا پاجامہ پہننا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت ڈیرا بابا نانک شاہ کے ایک اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے طلبہ کو برطانوی حکومت کے خلاف متحد کیا اور ایک مارچ نکالا۔ ادھر کپورتھلہ میں ان کے بڑے والد سوٹ بوٹ میں رہتے تھے اور ان کے بیٹے سول سروس میں آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی دوران بریندر ناتھ بہرائچ گئے اور انگریزوں اور ریاست کے ظلم و استبداد کے خلاف پمفلٹ بانٹنے لگے جس کی وجہ سے ان کے والد کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی۔ کیونکہ وہ وہاں کپورتھلہ اسٹیٹ کے نمائندے تھے۔ انھوں نے فوراً اپنے بیٹے کو کپورتھلہ واپس بھیج دیا۔

17 سال کی عمر میں دیوان بریندر ناتھ نے ظفر پیامی کے قلمی نام سے اردو میں افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ جب ان کی کہانیوں پر ان کے والد کی نظر پڑی اور انھیں معلوم ہوا کہ ظفر پیامی کوئی اور نہیں ان کا بیٹا ہے تو بیٹے سے ان کی ناراضگی ختم ہو گئی۔ کم عمری ہی میں ان کی ایک شناخت بن گئی اور وہ ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جانے لگے۔ چالیس کی دہائی میں وہ غیر منقسم کمیونسٹ پارٹی کی طلبہ شاخ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم ممبر بن گئے۔ انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کیا۔ وہاں احمد رشید شیروانی سے ان کی دوستی ہو گئی جو تاعمر قائم رہی اور ان سے گھریلو تعلقات رہے۔

1950 کے وسط میں دیوان صاحب دہلی آ گئے۔ یہاں انھیں منورما نامی ایک خاتون سے عشق ہو گیا جو کہ پرنسپل چھبیل داس اور سیتا دیوی کی بیٹی تھیں (ان کے بارے میں اوپر گزر چکا ہے)۔ ان لوگوں کا تعلق پی ایل اور فریڈا سے بھی تھا۔ دونوں نے ایک معمولی سی تقریب میں شادی کر لی۔ بس دونوں طرف سے چند افراد موجود تھے۔ اس موقع پر نہ تو خورد و نوش کا کوئی اہتمام کیا گیا نہ ہی روایتی انداز اپنایا گیا۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی رسم انجام دی گئی۔ اس طرح دونوں یعنی منورما دیوان اور دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی 35 سال تک ازدواجی رشتے سے منسلک رہے۔ اس دوران انھوں نے کئی ملکوں کے دورے کیے اور عالم عرب کے واقعات قلم بند کرنے لگے۔ ظفر پیامی کو فلسطینیوں کی بدحالی سے بڑا رنج پہنچا تھا۔ وہ ان کے حق میں مسلسل لکھتے رہے۔

ان تحریروں نے ظفر پیامی کو مکمل طور پر میدان صحافت میں دھکیل دیا۔ اس سے قبل وہ آل انڈیا ریڈیو کے لیے انگریزی اور اردو میں حالات حاضرہ پر تبصرہ لکھتے رہے ہیں۔ جبکہ افسانے لکھنے کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ لیکن ان کالموں اور تحریروں سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی اور اردو میں سیاسی تبصرے لکھنے شروع کر دیے۔ وہ انگریزی میں دیوان بریندر ناتھ کے نام سے اور اردو میں ظفر پیامی کے نام سے لکھنے لگے۔ ماہنامہ شمع میں ان کے سیاسی اور ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں انھوں نے ایک قسط وار کہانی لکھی ''ستاروں کے قیدی'' جو بہت مقبول ہوئی۔ اس دوران وہ کہانیاں بھی لکھتے رہے۔ البتہ انھیں کبھی چھپوایا نہیں۔ پنجاب میں دہشت گردی کے دنوں میں بھی انھوں نے کئی کہانیاں لکھی تھیں۔ بعد میں منورما دیوان کے اصرار پر انھوں نے ''دہشت'' نام سے اپنی کہانیوں کا مجموعہ

شائع کیا۔

دیوان فیملی کی دو بیٹیاں ہیں صبا دیوان اور سمیرا دیوان۔ انھوں نے ان دونوں بیٹیوں پر کبھی کوئی بات تھوپی نہیں، کسی نظریے کا پابند نہیں بنایا۔ یہاں تک کہ جب دونوں نے اپنی اپنی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بخوشی اسے قبول کیا۔ صبا دیوان نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ تین چار سال کی تھیں اور ان کے والدین نظام الدین منتقل ہو گئے تھے۔ اسی دوران صبا کا یوم پیدائش آیا اور انھوں نے برتھ ڈے پارٹی رکھی۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کے ننھے سے دل کو شدید صدمہ پہنچا کہ پڑوس کے امیر گھروں کے بچے اس پارٹی میں نہیں آئے۔ جب انھوں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تم نے ان غریب بچوں کو بھی بلایا ہے جو ہمارے گھروں میں کام کرتے ہیں ہم اس پارٹی میں کیسے آسکتے ہیں۔ لیکن انھی غریب بچوں نے پارٹی میں شرکت کر کے اس کی رونق دوبالا کر دی۔

ظفر پیامی میاں بیوی ہندو ہیں یا مسلمان؟ اس بارے میں ان کی بیٹی صبا کو بھی ایک تلخ تجربے سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ پانچ چھ سال کی تھیں کہ ایک روز روتے ہوئے گھر آئیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ ان کے دوست ان سے پوچھتے ہیں کہ تم ہندو ہو یا مسلمان۔ ان کے والد نے کہا کہ تم نے کیا جواب دیا؟ انھوں نے کہا کہ میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اس پر ظفر پیامی نے کہا کہ جب تک تم عقل و ہوش والی نہیں ہو جاتی ہو (یعنی کچھ فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی ہو) تب تک تم یہی کہو کہ میں ہندوستانی ہوں۔ لیکن میں نے پوچھا کہ آخر آپ اور ممی کیا ہیں ہندو یا مسلمان؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم دونوں مذہب میں یقین نہیں رکھتے۔ ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان نہ سکھ نہ عیسائی۔ ہم صرف ہندوستانی ہیں اور یہ بات ہمارے لیے کافی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا تھا وہ کتنا مناسب اور درست تھا۔ وہ تو ایک قوم پرست تھے اور ان کی اولاد کو بھی ایک ہندوستانی ہی ہونا چاہیے، ایک سچا سیکولر ہونا چاہیے۔ جسے مساوات میں یقین ہو اور جو خالص ہندوستانی ہو۔

◆◆◆

ظفر عدیم

ظفر عدیم مئی 1950 میں بہار کے مظفر پور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال 16 نومبر 2013 کو دہلی میں ہوا۔ وہ ایک کم آمیز انسان تھے۔ کم گوئی اور خاموشی ان کی مخصوص اداؤں میں شامل تھی۔ وہ جس طرح زندگی بھر خاموشی کے ساتھ جیتے رہے اسی طرح خاموشی کے ساتھ راہی ملک عدم بھی ہو گئے۔ میں فروری 1987 میں سابق ممبر پارلیمنٹ جناب م۔ افضل کے ہفت روزہ اخبار ''اخبار نو'' سے وابستہ ہوا۔ انھی دنوں ایک روز دفتر میں ایک انتہائی خوبرو اور خوش اخلاق انسان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا یہ ظفر عدیم ہیں۔ بہت اچھے صحافی ہیں۔ اخبار نو کے لیے بھی مضامین لکھتے ہیں۔

ظفر عدیم ایک بار دہلی آ کر واپس جا چکے تھے اور جب دوبارہ آئے تو بظاہر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس بار انھیں روزنامہ ''تیج'' میں ملازمت مل گئی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اخبار تیج صحافت میں داخل ہونے کے سلسلے میں ان کے لیے پہلا زینہ ثابت ہوا۔ پھر تو وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ ظفر عدیم ایک باصلاحیت شخص کا نام تھا۔ ایک بار دروازہ کھلا تو پھر کبھی بند نہیں ہوا۔ آخری وقت تک کام کے دروازے ان کے لیے کھلتے رہے۔

دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے قبل وہ قسمت آزمانے ممبئی بھی گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں فلمی دنیا میں کہانی یا مکالمے لکھنے کا چانس مل جائے گا۔ لیکن ممبئی کی فلم نگری بڑی ظالم ہے۔ صلاحیت کو اس وقت تک نہیں پہچانتی جب تک کہ وہ کسی گاڈ فادر کے شانوں پر سوار نہ ہو۔

ظفر عدیم بنیادی طور پر ایک ادیب تھے۔ لیکن وہ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ روزنامہ تیج

کے بعد وہ روزنامہ ''قومی آواز'' میں بطور سب ایڈیٹر ملازم ہو گئے اور اس کے بند ہونے تک اس میں برسر کار رہے۔ اس سے قبل وہ ماہنامہ فلمی ستارے، ماہنامہ جرائم، ماہنامہ نکہت گل، ماہنامہ روبی اور ماہنامہ بیسویں صدی وغیرہ سے بھی وابستہ رہے۔ قومی آواز جب تک نکلتا رہا وہ اس کا بین الاقوامی صفحہ تیار کرتے رہے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی مدد لینے کو تیار نہیں تھے۔ پورا صفحہ خود ہی بناتے۔ وہ ایک حسن پرست انسان تھے لہٰذا خبروں میں بھی حسن کاری کرتے اور ایسی خبریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بناتے جن میں قاری کی دلچسپی ہو۔ ان کے تیار کردہ صفحے میں ادبی چاشنی بھی ہوتی۔ وہ بہت دنوں تک بین الاقوامی سیاست پر ایک کالم بھی لکھتے رہے۔ جسے قارئین چٹخارے لے لے کر پڑھتے۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی۔ بالخصوص مسلم اور اسلامی ملکوں کے حالات پر لکھتے وقت وہ جو تجزیہ کرتے وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوتا۔ ان کے صفحے کے لیے دو ایک کاتب مخصوص ہوتے۔ وہ ان کو فٹافٹ خبریں بنا کر دیتے۔ کسی کو بیکار بیٹھنے نہیں دیتے۔ ان کو اس کا بھی بہت صحیح اندازہ تھا کہ کتنی خبریں کتابت کرائیں کہ صفحہ مکمل ہو جائے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ خبریں کم پڑ جائیں یا کچھ زیادہ بچ جائیں۔ وہ اپنا صفحہ خود ہی مسطر پر جوڑتے۔ صفحہ سازی کے بعد دو ایک لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے اور اپنے دلچسپ اور مخصوص انداز گفتگو سے لوگوں کی تفریح طبع کا سامان کرتے۔

ان کو قومی آواز میں ہمیشہ یہ احساس رہا کہ انھیں ان کی اہلیت کے پیش نظر جو پوزیشن ملنی چاہیے وہ نہیں ملی۔ وہ ایک وضعدار اور شریف انسان تھے اس لیے ایڈیٹر سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن تھے زود حس اور زود رنج۔ اس لیے ان حالات کا ان کی زندگی پر بھی اثر پڑا۔ قومی آواز سے چیف سب ایڈیٹر کے عہدے سے سبکدوش ہونے والے سینئر صحافی سید منصور آغا کے مطابق:

> ''اگر ان کو ان کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری تفویض کی جاتی تو اس کو نہ صرف یہ کہ وہ بحسن وخوبی انجام دیتے بلکہ اس کام میں چار چاند بھی لگا دیتے۔ مثال کے طور پر وہ چونکہ ایک ادیب تھے اس لیے اخبار کا ادبی ضمیمہ بھی بہت اچھا نکال سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضمیمہ کے انچارج جناب فرحت احساس نے ضمیمہ کو بہت معیاری بنایا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ظفر عدیم کو ایسا کوئی کام ملتا تو وہ بھی انتہائی معیاری ہوتا۔ بین الاقوامی صفحہ کے قاری آج بھی اس بات کی شہادت دیں

گے کہ وہ بہت معیاری، بھر پور اور دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ ان کو فلموں سے بھی زبردست شغف تھا۔ فلمی مضامین بہت عمدہ لکھتے تھے۔ اگر فلمی صفحات کی ذمہ داری ان کو مل جاتی تو وہ یہ کام بھی بہت اچھا کرتے''۔

وہ سگریٹ نوش تھے۔ لیکن پیکٹ والی سگریٹ کبھی نہیں پیتے۔ بلکہ کاغذ پر تمبا کو لپیٹ کر بنانے والی سگریٹ پیتے۔ کام کے دوران بھی اور کام کے بعد بھی وہ اس شغل میں مصروف ہو جاتے۔ قومی آواز میں ورکرس یونین کے الیکشن کے دوران وہ پس پردہ سرگرم ہو جاتے۔ کئی بار یونین کے صدر منتخب ہونے والے جناب عبدالحئی عرف خرم قیومی کے مطابق ''ظفر عدیم یونین کے الیکشن میں کنگ میکر کا کام کرتے''۔

ظفر عدیم کے نزدیک صحافت بھی ایک ادب ہے لیکن وہ صحافت جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ ہو۔ انھوں نے ایک مضمون ''صحافت میں ادب کی پیشکش'' میں لکھا ہے:

''...... بیشک صحافت بھی ایک ادب ہے، بشرطیکہ صحافی مولانا آزاد کی صحافت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن صدمے کی بات یہ ہے کہ اردو ادب کے علمائے کرام نے ادب پر تنقید و تحقیق کو لاد کر نہ صرف ادب سے انسانی جذبات کو چھین لیا بلکہ اس کے اثر سے صحافت بھی رفتہ رفتہ ادبیت سے محروم ہوتی چلی گئی۔ صحافت میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ اس میں انسانی جذبات کی ایک موج تہہ آب موجود ہو۔ اگر صحافت کو صرف ''خبر نگاری'' یا سیاسی یا واقعاتی موضوع کو حالات حاضرہ کے تشریحی خاکے تک محدود کر دیا جائے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ صحافت میں ادبی چاشنی ختم ہو جائے گی۔ تب صحافی کے نجی جذبات نیوز اور میڈیا کے مروجہ آئٹموں سے مغلوب ہو جائیں گے''۔

وہ ایک بہت اچھے مترجم بھی تھے۔ اردو زبان، اس کی باریکیوں اور اس کی نزاکتوں پر تو انھیں عبور حاصل ہی تھا انگریزی زبان پر بھی گرفت تھی۔ اسی لیے وہ کسی بھی قسم کی تحریر کا بہت اچھا ترجمہ کر لیتے۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے لیے کورس کی متعدد کتابو ں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جن میں لسانیات کے ساتھ ساتھ سائنس وغیرہ کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو سمیت متعدد سیاست دانوں اور شخصیات کی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ سیاسی مضامین کا ترجمہ وہ بہت تیزی سے کرتے۔ وہ زود نویس تھے اور اسی لیے ان کی ہینڈ رائٹنگ شکستہ تحریر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان کی تحریر بہت کم لوگ پڑھ

پاتے۔ قومی آواز میں کچھ خاص کاتب تھے جو ان کی لکھاوٹ کے ماہر تھے ورنہ عام طور پر ان کی تحریر کو پڑھنا سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ اگر کبھی ہاتھ روک کر لکھتے تو لکھاوٹ میں ایک حسن نظر آتا۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً ادیب تھے صحافی نہیں۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں جس کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں: ''سچ یہ ہے کہ میں صحافی نہیں ہوں۔ بیکاری اور بے روزگاری مجھے کھینچ کر اخباری دفتروں میں لے گئی جو مجھے گھسیٹ کر کسی کارخانے، فیکٹری یا اینٹ بھٹہ میں بھی لے جا سکتی تھی۔ صرف اخبارات یا نیوز ڈیسک سے وابستہ ہو جانا صحافی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ میں چاہتا تو خود کو صحافی کہہ کر خوش ہو لیتا لیکن میں نے یہ خوش فہمی کبھی نہیں پالی''۔

ظفر عدیم کے ادیب ہونے کا ثبوت ان کی ادبی تحریریں اور ادبی تصانیف ہیں۔ صحافت میں آنے سے قبل ہی وہ ادبی میدان میں داخل ہو گئے تھے۔ جن دنوں وہ روزنامہ تیج میں ملازمت کر رہے تھے ماہنامہ ''جرائم'' میں ان کا قسطوار ناول شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ ناول نویسی کے ساتھ ساتھ وہ میدان سخن میں بھی ہاتھ آزماتے رہے۔ لیکن مزاج میں درویشی اور گوشہ گیری کی وجہ سے مشاعروں سے دور دور رہے۔ ہاں علاقے کی شعری نشستوں میں ضرور شریک ہوتے۔

1977 ہی میں ان کے دو ناول ''انجو'' اور ''رات کے آنچل میں'' شائع ہو کر منظر عام پر آگئے تھے۔ ایک ناول ''شوفر'' 2007 میں، دوسرا ناول ''سڑک سیدھی جاتی ہے'' 2008 میں اور جاسوسی ناول ''یاسمین'' 2008 میں شائع ہوا۔ 2011 میں کہانیوں کا مجموعہ ''پھول اور خوشبو'' اور 2012 میں خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''ہر چہ بادا باد'' شائع ہوا۔ جبکہ 2003 میں شعری مجموعہ ''بھینی بھینی مہک'' 2008 میں منظوم ڈراما ''لالہ رخ'' اور 2009 میں ''دیوان عدیم'' شائع ہوا۔ تین کتابیں پہاڑیاں بول اٹھیں (جاسوسی ناول)، اڑان (ناول)، بانگ درا کا عروضی نظام (شاعری کے عددی فارمیٹ) زیر طبع تھے کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

''ظفر عدیم: ایک سخن ساز اور معاصر غزل کا منظر نامہ'' کے مصنف ڈاکٹر منظر اعجاز کے مطابق، جن کے بارے میں ظفر عدیم نے لکھا ہے کہ جن تین ہستیوں نے ان کی زندگی پر عظیم احسانات کیے ہیں ان میں تیسری ہستی منظر اعجاز کی ہے: ''میرا ذاتی خیال ہے کہ ظفر عدیم کی بے

پناہ ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے اور ادبی ذوق کو نکھارنے میں مسلم کلب اور بزم فیض (مظفر پور) نے اہم کردار ادا کیے''۔

جہاں تک ان کے ناولوں کی بات ہے تو انھیں ان کی شاعری کی مانند مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ناول تو ہیں لیکن اول درجے کے نہیں ہیں۔ ہاں ان کی شاعری وہ بہت توانا ہے۔ لیکن ان کی منکسر المزاجی اور کم آمیزی اور اس کے ساتھ ساتھ گوشہ نشینی کی عادت نے ان کی شاعری کو عصری ادبی منظرنامے پر ابھرنے نہیں دیا۔

ظفر عدیم عہد حاضر کے نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ ''ہر چہ باداباد'' میں شامل ایک مضمون ''فرد نہیں فارمولہ'' میں لکھتے ہیں: ''اردو ادب کی ہر صنف وصنعت پر نقادوں کا قبضہ ہے۔ کالج یونیورسٹی کے جتنے اردو ٹیچر ہیں سب ماشاء اللہ نقاد ہیں اور ان کا سلسلہ کسی نہ کسی ماہر اقبالیات، ماہر غالبیات، ماہر عروضیات، ماہر واہیات سے ہے۔ کوئی کچھ بھی لکھتا ہے وہ ادبی مضمون نقاد صاحب کے مقالے، مضمون سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ وہی پیمانہ طے کریں گے کہ خاکہ کیا ہے اور انشائیہ کیا ہے''۔

ظفر عدیم ایک خوش شکل، خوش پوش، خوش گوش اور خوش گفتار شخصیت کا نام تھا۔ ان کے چہرے پر مردانہ حسن کے ساتھ ساتھ شرم وحیا کا رنگ بھی غالب تھا۔ وہ ایک بے حد نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ پسند و ناپسند میں معیار کا خیال رکھتے۔ ان کا انداز گفتار بہت دلفریب تھا۔ متبسم گفتگو کرتے۔

وہ کثیر التحریر تھے۔ ان کے کام کرنے کا وقت رات میں گیارہ بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا۔ صبح تک کام کرتے۔ فجر کے وقت سو جاتے۔ پھر دوپہر میں بیدار ہوتے۔ ان کا کمرہ کسی خانقاہ کی مانند تھا۔ خوشبو ان کو بہت پسند تھی۔ اس کا ذکر بھی انھوں نے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کے کمرے میں ہمیشہ اگربتی جلتی رہتی۔ ان کا ایک شعر ہے:

جو شمع جلی، جل جل کے بجھی، میں اس پر نیند لٹاتا تھا
اس رات کا ساتھ نبھاتا تھا جو صبح کی آس میں رہتی تھی

وہ اپنے ہر کام میں انفرادیت کے قائل تھے۔ ''ہر چہ باداباد'' میں ''التعارفُ علّت'' کے عنوان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: نام: ظفر عدیم۔ اسم فراموشیدہ: محمد جاوید حسن ابن سید ابوظفر۔ جائے پیدائش: شہر غزل، مظفر پور، بہار۔ تعلیم: فارغ ابتلائے مسعات۔ استاد

روحانی: حضرت اسد اللہ خاں غالب۔ قوت محرکہ فطریہ: شہناز رانی بیگم غزل مظفر پور۔ انھوں نے تقریباً دو سال تک روز نامہ ''انقلاب'' کے لیے ہفتہ واری کالم لکھتے رہے ہیں جسے قارئین دلچسپی سے پڑھتے۔

◆◆◆

(مولانا) عبدالوحید صدیقی

مولانا عبدالوحید صدیقی کی پیدائش 1897 میں اتر پردیش کے غازی پور ضلع کے گاؤں میرا میں ہوئی اور ان کا انتقال 19 اپریل 1981 کو دہلی میں ہوا۔ ان کے والد عبدالعزیز پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ انھوں نے اس عہد کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ مولانا سید ناظم علی نے انھیں فارسی، اردو اور علم ہندسہ کی تعلیم دی۔ وہ ایک محنتی اور ذہین طالب علم تھے۔ انھیں بچپن سے ہی مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی ذہانت دیکھ کر ان کے والد نے انھیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔ ابھی ان کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور گھریلو ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں۔ لہٰذا انھوں نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے محکمۂ نہر میں ملازمت اختیار کر لی۔

ان دنوں خلافت تحریک زوروں پر چل رہی تھی، مولانا عبدالوحید صدیقی بھی اس تحریک میں سرگرمی سے کود پڑے۔ شاید اسی سلسلے میں انھیں مہاراشٹر کے بھیونڈی جانا پڑا جہاں ان کو انجمن اسلامیہ کے ایک اسکول میں مدرسی کی پیش کش کی گئی اور انھوں نے اسے اپنے مزاج کے مطابق سمجھتے ہوئے مدرسی شروع کر دی۔ لیکن جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ انھیں ابھی مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔ انھوں نے وہ ملازمت بھی ترک کر دی اور سہارنپور جا کر مظاہر علوم میں داخلہ لے لیا اور کچھ دنوں کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔

ان کے اندر صحافت کا ذوق وہیں پیدا ہوا اور انھوں نے طلبہ کی ایک تنظیم قائم کی اور 1924 میں ''مہاجر'' نام سے ایک ہفت روزہ اخبار شروع کر دیا۔ اس کے بعد 1929 یا 30 میں وہ دہلی آ گئے اور یہاں سے ''جاوید'' نام سے ایک ماہنامہ شروع کیا۔ مگر وہ بعض وجوہ سے چل نہ

سکا اور انھیں دیوبند واپس جانا پڑ گیا جہاں انھوں نے ادارہ اہتمام میں ملازمت اختیار کر لی۔

اس سے قبل مولانا عبدالوحید صدیقی نے لاہور میں بھی کچھ دنوں تک کام کیا۔ جن اخباروں سے وہ وہاں وابستہ رہے ان میں مولانا ظفر علی کا روزنامہ ''زمیندار'' اور ''مساوات'' اور ''انقلاب'' قابل ذکر ہیں۔ غالباً لاہور کی فضا نے ان کے صحافتی ذوق کو جلا بخشی اور ان کے اندر اخبار نکالنے کا داعیہ پیدا کیا جس نے آگے چل کر ان کو ایک بڑا صحافی بننے میں مدد دی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جمعیۃ علماء کا اخبار ''الجمعیۃ'' روزنامہ ہو گیا تھا۔ شروع میں اس کے مدیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ مودودی صاحب نے استعفیٰ دیا تو عبدالوحید صدیقی کو کچھ دنوں کے لیے اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ پھر مولانا محمد عثمان فارقلیط کو چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس وقت مولانا الجمعیۃ کے منیجر کی ذمہ داریاں انجام دینے لگے۔ لیکن ان کے اندر اپنے بل بوتے پر کچھ کرنے کا جذبہ موجیں مار رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے 18 جولائی 1951 کو روزنامہ ''نئی دنیا'' جاری کیا۔ شروع میں ان کے ساتھ نئی دنیا کے ادارتی عملہ میں مولانا عبدالباقی اور ناز انصاری بھی رہے۔ بعد میں اختر صدیقی اور پروانہ ردولوی بھی اس سے منسلک ہو گئے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی نے ہفت روزہ ''ہمت'' اور ہفت روزہ ''طاقت'' بھی نکالا۔ اس کے علاوہ ایک اور روزنامہ ''واقعات تو'' بھی جاری کیا۔ لیکن یہ اخبارات زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کو نئی دنیا سے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور انھیں پورے ملک میں ایک بے باک اور جرأت مند صحافی کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ اس نے اپنی شعلہ بار تحریروں سے کافی ہنگامہ برپا کیا اور غالباً آزاد ہندوستان میں یہ واحد اخبار تھا جس کی اشاعت سے قبل اس سے ایک ہزار روپے کا زر ضمانت طلب کیا گیا، جس کے خلاف پورے ملک کے اخبارو ل نے زبردست احتجاج کیا۔ بالآخر حکومت کو مجبور ہو کر ضمانت واپس کرنی پڑی۔ یہ اخبار لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتا تھا اور کوئی بھی مسئلہ ہو جرأت مندی اور بے باکی کے ساتھ اپنی بات رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار پر حکومت کی ''نظر عنایت'' رہی اور اخبار اور اس کے مالک و مدیر مولانا عبدالوحید صدیقی پر مقدمات کی بھرمار کر دی گئی اور انھیں بارہا جیلوں میں ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ 80-82 سال کی عمر میں بھی انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالا گیا۔ لیکن ان تعزیری اقدامات نے مولانا کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کی اور ان کا قلم کبھی بھی زنگ آلود یا کمزور نہیں ہوا۔ وہ ملک وملت کے مسائل کو بے باکی سے اٹھاتے رہے اور ناانصافیوں اور چیرہ

دستیوں کو بے نقاب کرتے رہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی نئے تجربات سے نہ گھبراتے تھے نہ خوف کھاتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے اخبار میں نئے نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔ ان کی خواہش اور کوشش ہوتی کہ ان کا اخبار ایک مضبوط اور پائیدار اخبار بنے اور ان کا ادارہ ایک مستحکم ادارہ ثابت ہو۔ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور آج ان کے بیٹے شاہد صدیقی کی ادارت میں نئی دنیا اخبار اور ان کے ادارے نے پوری اردو دنیا میں اپنی انفرادی شناخت قائم کر رکھی ہے۔

اسی درمیان مولانا نے ''ہما'' نام سے ایک ڈائجسٹ نکالا۔ اس کا پہلا ہی شمارہ بہت مقبول ہوا۔ مولانا اس مقبولیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے تقریباً تین ہی ماہ کے بعد اس کے دفتر کے لیے نظام الدین سے قریب جنگ پورہ ایکسٹینشن میں ایک عمارت حاصل کر لی جو اس قدر کشادہ تھی کہ اس میں ان کے خاندان کا قیام بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے قبل وہ بلی ماران کا گھر فروخت کر چکے تھے اور دریا گنج کے علاقے میں ایک مکان میں رہتے تھے۔ مولانا نے ''ہما'' کی کامیابی کے بعد چار رسالے اور نکالے اور جب ان کا کام بڑھ گیا تو وہ بستی حضرت نظام الدین منتقل ہو گئے اور وہاں سے کام کیا جانے لگا۔

نئی دنیا میں کام کرنے والے ایک اور صحافی جو آگے چل کر ایک بلند پایہ صحافی ثابت ہوئے یعنی ناز انصاری نے مولانا کی صحافت، ان کی زندگی، ان کے اخلاق و کردار اور ان کی سیاسی وصحافتی سرگرمیوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالوحید صدیقی کو میں نے پہلی بار 1946 میں قاضی محمد احمد کاظمی اور نواب زادہ لیاقت علی خان کے معرکۃ الآرا الیکشن کے دوران سہارنپور کے جلسوں میں تقاریر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت میں ان کی تقاریر سے بہت متاثر ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں جب 1947 میں صحافتی زندگی شروع کروں گا تو مجھے ان کی رفاقت بھی نصیب ہوگی۔ نومبر 1948 میں جب روزنامہ ''انصاری'' سے اخبار ''الجمعیۃ'' میں آیا اور وہاں مولانا سے پہلا براہ راست تعارف ہوا تو ان کی پرانی یادوں کے نقوش ابھر آئے۔ ان کے برتاؤ اور سلوک نے ان کی چھاپ اور گہری کر دی۔ جب انھوں نے کسی اختلاف کی بنا پر الجمعیۃ کو جہاں وہ جنرل منیجر تھے چھوڑا تو انھوں نے مجھ سے گفتگو کی اور بتایا کہ وہ روزنامہ ''نئی دنیا'' شروع کر رہے ہیں۔ میں بڑی خوشی سے ان کے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہو گیا۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کے ساتھ ایک اور بزرگ صحافی اختر صدیقی نے بھی کام کیا تھا۔ روزنامہ نئی دنیا شروع ہونے کے وقت وہ روزنامہ سیاست کانپور میں کام کر رہے تھے۔ مگر کسی وجہ سے وہ اس کے شعبۂ ادارت سے علاحدہ ہوگئے تھے۔ ایک خط کے ذریعے انھوں نے یہ اطلاع عبدالوحید صدیقی صاحب کو بھی دی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ بعض صحافتی تحریروں کی بنیاد پر میرے خلاف مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ مولانا نے فوراً جواب دیا کہ خط وکتابت میں وقت ضائع نہ کیجیے فوراً دہلی چلے آیئے۔ ادارہ نئی دنیا میں آپ کی کرسی خالی ہے۔ اس کو سنبھالیے اور کام شروع کر دیجیے۔ جہاں تک مقدمہ کا سوال ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہاں بھی مقدموں کی بھرمار ہے۔ مقدمہ میں ہر ممکن حد تک آپ کی معاونت کی جائے گی۔ آگے اللہ مالک ہے۔ بہر صورت آیئے اور جلد چلے آیئے۔ مولانا کا انتہائی پُرخلوص اور ہمت افزا جواب پڑھ کر وہ اپنے گھر لکھنؤ جانے کے بجائے کانپور سے سیدھے دہلی چلے آئے اور نئی دنیا کے عملہ ادارت میں شامل ہو کر 1952 سے 1961 تک کم وبیش مسلسل 8 سال تک کام کرتے رہے۔ مولانا کے انتقال سے کچھ روز قبل جب وہ بستر علالت پر تھے اور اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھے کہ ایک روز انھوں نے مولانا سے کہا کہ آپ پرنٹر پبلشر کسی دوسرے کو بنا دیجیے تاکہ اخبار کی کسی تحریر پر آپ کو صعوبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مسکرا کر بولے ''کیوں؟ کیا میں کبھی صعوبتوں سے گھبرایا ہوں''۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا کہ اس وقت آپ بستر علالت پر ہیں۔ پھر مسکرائے اور کہا ''یہ تو اور اچھا ہے۔ یہاں نہ لیٹے وہاں لیٹے رہیں گے''۔ اسی زمانہ میں نئی دنیا ویکلی کے ایڈیٹر شاہد صدیقی سے کہتے رہتے تھے کہ بیٹا تم میرے خیال سے اپنے قلم کو نہ روکنا۔ لکھو، خوب لکھو، کھل کر لکھو، سخت سے سخت لکھو جیسا کہ میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کی ہمت مجھ میں پوری طرح موجود ہے۔ یہ کبھی نہ بھولنا کہ صحافت صرف عبارت آرائی کا نام نہیں بلکہ جنگ ہے۔ جنگ اس جنگ کو ہمیشہ ہمت وجرأت سے لڑو۔

جب 1980 میں مولانا عبدالوحید صدیقی کا انتقال ہوا تو پاکستان کے روزنامہ ''نوائے وقت'' نے ایک اداریہ لکھا اور ان کی صحافتی خدمات کو خوبصورت انداز میں خراج عقیدت وتحسین پیش کیا۔ اخبار نے لکھا کہ ''بھارت میں اردو صحافت ہمیشہ کے لیے ایک بے باک، بے خوف، بے لوث اور حق پرست صحافی سے محروم ہوگئی۔ برصغیر کے ایک معمر اور سینئر صحافی حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی 19 اپریل کو انتقال کر گئے۔ مولانا کی وفات کے ساتھ اردو صحافت کے ایک

پورے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ صرف ایک صحافی نہیں تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ایک باعمل مجاہد بھی تھے۔ انھوں نے اپنے قلم کو نیزہ بنا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور آزادی کے بعد جب بھارت کے مسلمان احساس کمتری میں مبتلا ہو کر مایوسی کے دروازے سے جا لگے تو اس وقت مولانا ہی کی شخصیت تھی جس نے بھارتی مسلمانوں میں پھیلی ہوئی مایوسی کے خلاف جہاد کیا۔"

مولانا صرف تحریر میں مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ مینجمنٹ میں بھی ماہر تھے۔ ان کے مینجمنٹ کا سارا کام ایک چھوٹے سے کمرے سے چلتا تھا۔ وہ باہر سے آنے والے خطوط کے جواب خود لکھتے تھے۔ ایک ایک ایجنٹ سے خط وکتابت کے ذریعے رابطہ رکھتے تھے۔ وہ فجر کی نماز کے بعد مکان کے نچلے حصے میں چلے جاتے جہاں دفتر قائم تھا۔ وہاں وہ اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ آٹھ بجے تک اخبارات پڑھ لیتے اور ضروری خبروں اور مضامین کو نشان زد کر دیتے۔ پھر لکھنے کے کام میں لگ جاتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ کرتے۔ وہ کئی کئی روز تک گھر سے ہی نہیں نکلتے۔ صرف اور صرف کام میں مشغول رہتے۔ وہ صرف اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتے بلکہ تمام کارکنوں کے کاموں کی بھی نگرانی کرتے۔ یہاں تک کہ کاتبوں کے پاس پہنچ جاتے اور انھیں کتابت کی باریکیاں بتانے لگتے۔

وہ ایک خوددار انسان تھے۔ وہ دوسروں کی خودداری کا بھی خیال رکھتے۔ نئی دنیا کے خلاف مقدمات بھی خوب قائم ہوتے۔ کہنا چاہیے کہ مقدمات کی بھرمار رہتی۔ انہی دنوں دہلی کے ڈپٹی کمشنر نے ایک پریس کانفرنس طلب کی تھی جس میں اخباروں کو حکومت سے تعاون کرنے کی جانب کمشنر صاحب توجہ دلا رہے تھے۔ اس وقت ان سے کہا گیا کہ حکومت کو بھی تو اخباروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ نئی دنیا پر مقدمات کے تعلق سے کمشنر نے مولانا کو اپنے دفتر میں حاضر ہونے کو کہا لیکن مولانا نہیں گئے۔ انھوں نے یہ جواب بھیج دیا کہ وہ قیامت تک وہاں نہیں جائیں گے وہ چاہیں تو اور مقدمات قائم کر دیں۔ عدالت جو بھی فیصلہ سنائے گی وہ بھگت لیں گے لیکن مقدمہ اٹھانے کی بھیک نہیں مانگیں گے۔

مولانا تقسیم کے بعد مسلمانوں کے حالات پر بہت متفکر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے ماحول میں وہ مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے سہارا دیں اور ان میں شعور پیدا کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں لہٰذا ان کے ذہن وشعور میں بھی نیا پن آنا چاہیے۔ اس نئے پن میں انھیں آبرومندانہ زندگی جینے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ ان کے ساتھ ظلم

وزیادتی نہ ہو اور ان کو بھی برابر کا شہری سمجھا جائے نہ کہ دوسرے درجے کا شہری۔ وہ اپنے قلم سے اس کی جد و جہد زندگی بھر کرتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بعض فرقہ پرست تقسیم کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر ان پر مظالم کے پہاڑ توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ سیاسی میدان میں کسی ایک پارٹی کی اجارہ داری کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نئے جمہوری ہندوستان میں ایک مضبوط اور طاقتور حزب ۔ اختلاف کے قیام کے حق میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے عوامی بیداری کی ایک تحریک چلائی جس میں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دلتوں کو بھی شامل کیا۔ اس بارے میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ملی اور کئی ترقی پسند لیڈروں نے ان کا ساتھ دیا۔ اس کوشش کے نتیجے میں مغربی اتر پردیش میں شہری مورچہ کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوگئی۔ اس تنظیم میں ٹھاکر یشپال سنگھ، گووند سہائے، مولانا محمد اسحٰق سنبھلی اور مولانا عبدالرؤف شامل تھے۔ اس مورچہ نے اتر پردیش کے میونسپل الیکشن میں حصہ لیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔

مولانا عزم و عمل کے میدان کے ہیرو تھے۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے عوامی جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ وہ پسماندہ طبقات کو سماج میں برابری دینے کے قائل تھے۔ وہ عدم مساوات اور نابرابری کے سخت مخالف تھے۔ مولانا نے پنجابی صوبے کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حالانکہ اس وقت ملک کی تقسیم کے خطرناک نتائج کے پیش نظر کوئی بھی ملک میں ایک اور تقسیم کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن نئی دنیا نے پنجابی صوبے کی تحریک کی حمایت کی اور اس کے حق میں دھواں دھار مضامین لکھے۔ حکومت پنجاب نے نئی دنیا کے مضامین کے خلاف کارروائی کی اور پنجاب میں اس کے داخلے پر پابندی لگادی۔ اس وقت متحدہ پنجاب ہوا کرتا تھا جس میں ہریانہ اور ہماچل پردیش کے علاقے بھی شامل تھے۔ یہ علاقے بعد میں الگ ہوئے۔ دہلی سے متصل ہونے کی وجہ سے پنجاب میں نئی دنیا کے قارئین کی کافی تعداد تھی۔ پابندی کی وجہ سے سرکولیشن متاثر ہوگئی لیکن مولانا نے صوبہ پنجاب کے لیے اپنی تحریریں بند نہیں کیں۔

اسی دوران دہلی میں بھی اہل اقتدار کی نظروں میں نئی دنیا کھٹکنے لگا۔ اس کی سخت نگرانی ہونے لگی۔ حکومت کو محسوس ہوا کہ نئی دنیا کی تحریریں فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے مضر ہیں اور ان سے امن عامہ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کئی مضامین کو قابل مواخذہ سمجھ کر مقدمات کی بھرمار کر دی گئی۔ سرکولیشن میں گراوٹ اور مقدمات کی بھرمار کی وجہ سے مولانا کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے اصولوں اور نظریات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

وہ قومی سیاست میں کوئی بے اعتدالی دیکھتے تو فوراً ان کا قلم تیغ بے نیام ہو جاتا۔ کشمیر میں جب شیخ محمد عبداللہ کو ہٹا کر ان کی جگہ پر بخشی غلام محمد کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا تو انھوں نے اس کارروائی کی کھل کر مخالفت کی۔ انھوں نے نہ صرف شیخ عبداللہ کی قربانیوں کی پرزور حمایت کی بلکہ رائے شماری کے ان کے مطالبے کی بھی تائید کی۔ اس کا نتیجہ یوں نکلا کہ جموں و کشمیر کی نئی حکومت نے ریاست میں نئی دنیا کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اس فیصلے کو بے اثر کرنے کے لیے مولانا نے اخبار کا نام بدل کر اسے جموں و کشمیر میں پہنچایا۔ انھوں نے جو پرچے کشمیر بھیجے ان کا نام ''ہمت اور طاقت'' رکھا تھا۔ انھیں اس اخبار کا ڈکلریشن آسانی سے مل گیا۔

بعد میں کانپور سے نئی دنیا کے نام سے ایک اخبار نکلا جو بخشی غلام محمد کی حمایت کرتا تھا۔ مولانا کے حاسدین نے کہا کہ مولانا عبدالوحید صدیقی کا ہی اخبار ہے۔ لیکن یہ اخبار ایک سال کے بعد بند ہو گیا۔ پھر لوگوں کو احساس ہوا کہ نہیں یہ ان کا اخبار نہیں تھا۔ مولانا نے ''ہمت'' نام سے ایک اخبار انہی دنوں جاری کیا۔ باخبر لوگوں کا خیال ہے کہ بمبئی کے انگریزی بلٹز نے جب 1968 میں اردو بلٹز نکالا تو اس میں ''ہمت'' کے خدوخال کی جھلکیاں دیکھی گئیں۔ 1964 میں نئی دنیا بند ہونے کے بعد انھوں نے ''واقعات'' نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالا۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کو اردو میں ڈائجسٹ نکالنے کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ ہما کی کامیابی کے بعد انھوں نے ہدیٰ نکالا جو اب ان کے بڑے بیٹے مولانا احمد مصطفیٰ صدیقی راہی نکال رہے ہیں۔ ان دونوں ڈائجسٹوں کی نقل کرتے ہوئے کئی لوگوں نے اردو میں ڈائجسٹ نکالے لیکن جانے کیوں دوسرے ڈائجسٹ کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کے خاندان میں ایک اور ڈائجسٹ نکلا جس کا نام ''پاکیزہ آنچل'' ہے اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ان کے ایک اور بیٹے خالد مصطفیٰ صدیقی نکال رہے ہیں۔ پاکیزہ آنچل کی کامیابی کے بعد ہندی میں ''مہکتا آنچل'' بھی نکلا۔ وہ بھی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی ایک قلم کار ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کے یہاں خطابت میں بہت زور تھا اور وہ جو بھی بات کہتے مدلل کہتے۔ ان کا مطالعہ بھی کافی تھا۔ وہ دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات سے بھی باخبر رہتے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں کسی بھی سیاسی زندگی کی پابندی قبول نہیں کی۔ وہ ہمیشہ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کی خاطر آزاد صحافت کا علم ہاتھوں میں لیے

استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ مولانا نے اردو صحافیوں کو یہ درس دیا کہ تم ایک صحافی کی حیثیت سے معاشرے میں جو کچھ بھی دیکھتے ہو اور جو تمھارا مطالعہ ہے اس کو کہنے کے لیے تمھیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے تازندگی صحافت کی آزادی کا علم اٹھائے رکھا اور اسے کبھی بھی جھکنے نہیں دیا۔

◆◆◆

(مولانا) عبدالباقی

صاحب طرز ادیب، صحافی، سخن فہم، مجاہد آزادی اور اہل قلم مولانا عبدالباقی ایم اے پی ایچ ڈی 1902 میں موضع کوات ضلع آرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر عبدالقیوم تھا جو ضلع آرا کے معروف خاندان سے تھے۔ ان کے ذاتی مراسم سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد سے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ہوئی۔ انھوں نے مہاتما گاندھی سمیت متعدد سرکردہ مجاہدین آزادی کی صحبت حاصل کی تھی۔ جب پٹنہ کے صداقت آشرم میں گاندھی جی ٹھہرتے تو عبدالباقی کے والد ان کو لے کر ان کے پاس جاتے۔ اس وقت ان کے ہمراہ ڈاکٹر راجندر پرساد بھی ہوتے۔

عبدالباقی نے دینی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ وہاں ان کی ذہنی پرورش ہوئی اور شیخ الاسلام اسیر مالٹا مولانا سید حسین احمد کی صحبت سے ان کے افکار و خیالات کو جلا حاصل ہوئی۔ وہاں سے فراغت کے بعد انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کے دورانِ طالب علمی ہی میں جلیاں والا باغ کا سانحہ پیش آیا۔ اس کے بعد عبدالباقی پٹنہ واپس چلے گئے۔

مولانا عبدالباقی کی صحافت کا آغاز روزنامہ شہباز لاہور سے ہوا۔ وہ اس کے مدیر مسئول تھے۔ اس دور کے بڑے صحافیوں جیسے مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مہاشہ کرشن، مولانا ظفر علی خاں اور اور شری رنبیر سے مولانا کے قریبی مراسم قائم ہو گئے۔ ان شخصیات سے تعلق نے مولانا کے اندر تحریک آزادی کی روح پھونک دی۔ اس دوران مہاشہ کرشن دہلی آ گئے۔ لیکن دونوں کا رشتہ قائم رہا۔ مہاشہ کرشن عبدالباقی کی تحریروں کے مداح تھے۔ بعد میں وہ بھی دہلی چلے آئے۔

اسی دوران مولانا عبدالوحید صدیقی الجمعیۃ سے، جو کہ وہاں منیجر تھے، الگ ہوگئے اور روزنامہ نئی دنیا شروع کیا۔ انھوں نے مولانا عبدالباقی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ نئی دنیا کے علاوہ ہفت روزہ پیام مشرق، ہفت روزہ پرچم ہند، سہ روزہ زم زم، روزنامہ پیام وطن، زمیندار، روزنامہ آزاد اور اواخر زندگی میں روزنامہ ملک وملت سے وابستہ رہے۔ وہ اختلاج قلب کے مریض تھے اور اس مرض میں بالآخر 23 فروری 1968 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

معروف صحافی ناز انصاری مولانا عبدالباقی سے اپنے تعلقات اور جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالباقی کا نام زبان پر آتے ہی یادوں کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے اور ان کا گمبھیر چہرہ سنجیدگی اور متانت لیے مگر متبسم چہرہ — ان کی ذات اور میری صحافتی زندگی کے واقعات کی ایک فلم پردۂ دماغ پر اس طرح چلنی شروع ہوجاتی ہے جیسے میں وہ سب کچھ پردۂ سیمیں پر دیکھ رہا ہوں۔ رنگ گندمی، لمبا قد، دوہرا بدن، کتابی چہرہ، لمبی اور اونچی ناک جو اردو صحافت کی ناک بھی بن گئی تھی، بڑی بڑی آنکھیں جن کی گہرائی میں بہت سے سرد وگرم پنہاں تھے۔ مہر ومحبت سے بھرپور کشادہ پیشانی، بڑا سر مگر ہلکے ہلکے بال، پیٹ مسلسل اور طویل نشستوں کے باعث بڑھ کر توند بن چکا تھا، لمبے لمبے ہاتھ، لمبی لمبی انگلیاں، چوڑی دار پاجامہ، شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی پہنتے تھے: ”ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے“

مولانا باقی کے ساتھ مجھے سب سے پہلے نئی دنیا (روزنامہ) دلی میں پھر ہفت روزہ پیام مشرق (دلی) میں اور اس کے بعد ہفت روزہ پرچم ہند دلی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن ان سے غائبانہ تعارف اس وقت حاصل ہوا جب سہ روزہ زم زم کے مدیر مولانا عثمان فارقلیط کو ادارہ زم زم نے تفسیر کلام پاک کے کام میں لگایا اور مولانا عبدالباقی نے اس کی زمام ادارت سنبھالی۔

یہ زمانہ مسلم لیگ اور کانگریس کی گھمسان جنگ کا تھا۔ زم زم قوم پرست اور کانگریس کا ہمنوا پرچہ تھا۔ اس وقت بہت سے صحافی مولانا باقی کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے انداز تحریر اور طرز استدلال کو اپنانے کی کوشش کی۔ سچ یہ ہے کہ وہ صاحب طرز صحافی تھے۔ وہ صحافی ہی نہیں ادیب بھی تھے۔ شعر نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم تھے۔ اشعار کی نوک پلک درست کرنے اور ان کو قابل اشاعت اور معیاری بنانے کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تاریخ پر بھی گہری نظر تھی اور بہت سے تاریخی حوالے زبانی یاد تھے جن سے وہ اپنے مقالات کو آراستہ کرتے تھے۔ انھیں افسانے لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی اور ضرورت پڑنے پر افسانے بھی لکھتے تھے۔ دینی مضامین اور قرآن

وحدیث پر مضامین لکھنا ان کا اثاثہ تھا۔

جب 18 جولائی 1951 کو روز نامہ نئی دنیا نکلا تو پہلے ہی دن سے وہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں وہ اس سے علیحدہ ہو گئے اور 1953 کے آخری دنوں میں ہفت روزہ پیام مشرق دلی شروع ہوا تو وہ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1963 میں جب سید انیس الرحمٰن نے ہفت روزہ پرچم ہند دلی شروع کیا تو اس میں بھی پہلے ہی پرچہ سے وہ رہے۔ بعد میں انھوں نے اپنا ہفت روزہ کاروانِ وطن شروع کیا۔ اس سے پہلے انھوں نے نئی دنیا سے الگ ہونے کے بعد روز نامہ پیام وطن شروع کیا تھا جو بعد کو بند ہو گیا۔

مولانا باقی کا مزاج یہ تھا کہ وہ جب کوئی پرچہ شروع کرتے تو اس میں بہت سے عنوانات قائم کیا کرتے تھے اور جنھیں بالعموم وہ تنہا ہی لکھتے تھے۔ بہت سے صحافیوں نے ان کی اس روش کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ایسے کئی صحافی ہیں جو ان عنوانات کو برقرار رکھنے اور ان کا لب ولہجہ اور انداز واسلوب قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

ان کی عادت تھی کہ لکھنے سے پہلے معاونین کے ساتھ ایشوز پر بحث کرتے اور پھر بحث کے نتیجے میں ابھرنے والے دلائل کا اپنے مقالات میں جواب دیا کرتے تھے۔ ان کی عادت یہ بھی تھی کہ وہ پرتاپ اور الجمعیۃ کے اداریوں کے دلائل کی کاٹ بھی کرتے تھے اور جواب بھی دیتے تھے۔ وہ ایک نئے پرچے کو مقبول بنانے کے لیے دوسرے پرچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کیا کرتے تھے۔

ان کی عادت تھی کہ وہ جو کچھ لکھتے کتابت کو دینے سے پہلے اس پر خود نظر ثانی کرتے۔ کتابت کے بعد خود اس کی تصحیح کرتے پروف آتے تو ان کو پڑھتے اور ردوبدل کرتے تھے اور پھر جب اخبار چھپ کر آتا تو ایک بار پھر اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ دوسرے صحافیوں کو ان کے مضامین پڑھ کر مشورے بھی دیتے اور کوئی چیز پسند آتی تو داد بھی دیتے تھے۔ وہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کرتے اور انھیں آگے بڑھانے میں بھی دلچسپی لیتے اور بخل نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کئی نے بعد میں بڑا نام پیدا کیا۔

دلی آنے سے قبل وہ روز نامہ شہباز لاہور کے جو یونینسٹ پارٹی کا اخبار تھا مدیر مسئول بھی رہے اور بعد کو یونینسٹ پارٹی کے زمانہ میں پنجاب میں ڈائرکٹر انفارمیشن بھی رہے۔ زمیندار کے ادارۂ تحریر سے بھی وابستہ رہے اور اس سے الگ ہونے کے بعد زمیندار کے مقابلہ میں جہازی

سائز کا ایک روزنامہ آزاد بھی نکالا تھا جس میں تصویروں کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس پرچہ نے نکلتے ہی دھاک بٹھادی تھی۔ باقی صاحب بہت اچھے ایڈیٹر ضرور تھے مگر اچھے منتظم نہیں تھے اس لیے ان کے اخبارات ناکامی کا شکار ہوتے رہے۔ وہ بہت سے عنوان قائم کر لیتے اور سب کو خود ہی لکھتے تھے۔ اخبار کے انتظام وانصرام کا وقت نہ ملتا تھا اور کوئی اچھا منیجر بھی انھیں میسر نہ آیا جب کہ جن دوسرے اخباروں میں انھوں نے کام کیا وہاں مینجمنٹ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا اس لیے وہ اخبارات چلتے اور پھولتے پھلتے رہے۔

باقی صاحب کو انگریزی میں لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ وہ انگریزی اخبارات میں بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ حکومت ہند کے لیے مسلم اخبارات کے رجحان پر ہفتہ وار انگریزی میں بھی ایک تبصرہ لکھ کر دیتے تھے۔ جس کا منشا مسلمانوں کے مسائل اور ان کی شکایات ومطالبات سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ کسی اخبار سے ان کی آخری وابستگی روزنامہ ملک وملت کے ساتھ تھی جو سید انیس الرحمٰن مرحوم نے نکالا تھا اور ان کے نکلوانے میں بھی باقی صاحب کا ہاتھ تھا۔

ان کے ایک رفیق کار رضی بدایونی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ راقم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہے جنھیں عبدالباقی کی رفاقت وشفقت کا فخر حاصل رہا۔ راقم نے دسمبر 1950 میں ماہنامہ ''آستانہ'' وہفت روزہ ''پیام مشرق'' دہلی کے ادارہ میں شمولیت اختیار کی تھی جس کے مالک درپردہ درگاہ کلیمیؒ کے سجادہ نشین صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی تھے جنھوں نے کچھ عرصہ بعد ماہنامہ ''مولوی'' بھی خرید لیا تھا۔ اس طور سے اس ادارہ سے بیک وقت دو ماہنامے اور ایک ہفت روزہ اور تین جریدے جاری تھے اور اس وقت اس ادارہ کا کل عملہ تقریباً 38 افراد پر مشتمل تھا۔ جن میں مضامین واداریہ اور شذرات نگاروں اور جرائد مرتب کرنے والی ٹیم میں علامہ زاہد القادری، انیس العصر سید مہدی نظمیؔ، الحاج ناز انصاری، اشرف بھوپالی، زاہد رضوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا نظام الدین حیرتؔ رامپوری اور مولانا عبدالباقی صاحبان شامل تھے۔

عبدالباقی کو خاص طور پر اداریے اور شذرات لکھنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی نگاہ دوربیں اور پرواز فکر بہت بلند تھی۔ وہ ترقی پسند تعمیری ذہنیت کے مالک تھے۔ وہ قوم ووطن کے درد سے لبریز حساس دل اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ وہ پائیدار علمی صلاحیت کے حامل تھے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ صحافت درحقیقت تہذیب وتمدن اور ملک وملت کی خدمت کا ایک نہایت مؤثر اور کارگر وسیلہ ہے۔ اگر صحافی کے پاس حیاتِ اجتماعی کا ایک سوچا سمجھا اور منضبط ومرتب نظام ہو تو بیشک وہ

اپنے قارئین کی مثبت اور کامیاب تعمیری رہنمائی ورہبری کر سکتا ہے۔اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ صحافی کا حقیقی فرض عوام وخواص میں سنجیدہ فکر بیدار کرنا اور تعمیری لائحۂ عمل کی تلقین کرنا ہے۔اس موقف ومقصد میں خاطر خواہ تکمیل اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب صحافی واردات ومسائل کو غیر جذباتی انداز میں صدق دلی اور نیک نیتی سے سوچ سمجھ اور اپنے تعمیری افکار قارئین کے روبرو پیش کرے۔وہ اردو کے پُرجوش حامی ومبلّغ، خلوص ومحبت اور مروّت کے دریا اور تہذیب وشرافت کے پیکر تھے۔ان کی ایمانداری، حوصلہ مندی، ادب نوازی اور زورِ قلم کے بھی معترف ہیں، ہمدردی، دلنوازی اور شرکتِ غم جیسی اعلیٰ انسانی صفات ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔اپنے مقاصد کے حصول میں وہ حق گوئی وبیباکی کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔تحریک آزادی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔انھوں نے اپنی فکر انگیز، پُرجوش ومؤثر تحریروں کے ذریعے قوم کے خوابیدہ عناصر کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور نوجوانانِ وطن کے دلوں میں جذبۂ آزادی کی تازہ روح پھونکی، آزادی کا حقیقی مفہوم ان کے ذہن نشین کرایا اور درسِ عمل دے کر کاروانِ آزادی کو منزل مقصود کی طرف سینہ سپر ہوکر آگے بڑھنے کا نیا جوش وجذبہ اور حوصلہ عطا کیا۔

◆◆◆

غفران احمد (ایم اے)

غفران احمد حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے میں دسمبر 1938 میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 16 رنومبر 2012 کو دہلی میں ہوا۔ وہ 1955 میں دہلی آگئے تھے اور یہاں مدرسہ عالیہ فتحپوری سے انھوں نے سند فراغت حاصل کی تھی۔ انھوں نے مدرسہ امینیہ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور 1970 میں روزنامہ الجمعیۃ سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے روزنامہ تیج میں خدمات انجام دیں اور پھر روزنامہ پرتاپ سے منسلک ہوگئے۔ وہ 2000 میں پرتاپ سے چیف سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد بھی ان کی صحافتی خدمات کا سلسلہ جاری رہا اور وہ روزنامہ الیوم اور روزنامہ اخبار مشرق میں لکھا کرتے تھے۔

غفران احمد ایک صاحب طرز مصنف تھے اور مسلم رہنماؤں پر سال میں ایک مجلّہ شائع کرتے تھے۔ انھیں حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود الحسن سے عقیدت تھی۔ انھوں نے مولانا آزاد اسٹڈی سرکل قائم کیا تھا جس کے تحت مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ پرتاپ اخبار میں مزدور یونین کے صدر بھی رہے اور مالکان کے آگے مزدوروں کے حق میں آواز بلند کیا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنے بارے میں ایک انٹرویو میں تفصیلات بتائی ہیں۔ یہ انٹرویو معروف صحافی ظفر انور شکر پوری نے لیا تھا۔ اس انٹرویو کی تفصیلات کے مطابق غفران احمد ابتدائے شباب سے یہ تصور لے کر چلے تھے کہ انسان جو زبان سیکھے اس میں لکھنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہیے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی لکھ سکتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے مطالعے کو

اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے وہ ان زبانوں کے رسائل اور اخبارات دیکھتے رہتے۔

دہلی میں جب یو این آئی اردو سروس شروع ہوئی تو وہ پرتاپ میں نیوز ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے یو این آئی میں انٹرویو دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ انھیں چیف سب ایڈیٹر بنایا جائے لیکن ذمہ داروں نے انھیں سینئر سب ایڈیٹر کی پیش کش کی۔ انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انھوں نے مسلم مجاہدین آزادی کا موضوع اپنے لیے منتخب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میری نگاہ میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ آزاد ہندوستان میں اپنا وجود منوائیں اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے ہم اہل ملک کو اس کی یاد دلائیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو مجاہدین آزادی کو انھوں نے نظرانداز کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں انگریزی، ہندی اور اردو میں یاد کرنے والے بہت ہیں البتہ مسلم مجاہدین آزادی کو یاد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

انھوں نے دہلی میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ نومبر 1955 میں یعنی اسی سال جب دہلی میں آمد ہوئی منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کا امتحان پاس کیا ادھر پنجاب یونیورسٹی سے پہلے میٹرک، بعدازاں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ Only انگلش میٹرک ذاتی مطالعہ سے پاس کیا۔ جب کہ انٹرمیڈیٹ نئی سڑک کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ لے کر مکمل کیا۔ اس کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم کا یہ متوازی سلسلہ رک گیا۔

مدرسہ عالیہ سے 1962 میں عربی درسیات (درسِ نظامی) کی تکمیل کی۔ جب کہ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان 1967 میں دیا۔ اسی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس سے بی اے کیا۔ بی اے بھی نئی سڑک کے ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے کر مکمل کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ پیسے ہوتے تھے تو پڑھنے چلے جاتے تھے اور جس مہینے دیکھتے تھے کہ 15 روپے ماہانہ فیس کا بندوبست نہیں ہوسکتا تو اسکول جانا ناغہ کر دیتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ پشاور کے ایک نیک دل پروفیسر کھنّہ راستے میں مل گئے۔ انھوں نے بڑے پیار سے کہا ارے بھائی تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ اپنی بے بسی کا خیال کر کے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ زندگی بھر نامساعد حالات سے واسطہ پڑتا رہا۔

نئی سڑک پر ایک دفعہ بی اے کا امتحانی فارم لینے کے لیے جانا ہوا۔ بک ڈپو والے سے پوچھا بھائی فارم آگیا ہے اس نے کہاں ہاں آگیا۔ ہاتھ بڑھا کر فارم لینے پر پتہ چلا کہ وہ فارم کی قیمت

دس روپے لے گا جب کہ اس کی قیمت ایک یا دو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ دوکاندار سے کہا بھائی اتنی قیمت کیوں لے رہے ہو۔ اس نے مغرورانہ جواب دیا، لینا ہے تو لے لو ورنہ آگے بڑھو۔ اب اگر ٹھہرتے تو یقین نہیں تھا کہ فارم کل کو مل جائے گا۔ انھوں نے دوکاندار سے کہا بھئی ایک فارم آپ کل تک کے لیے روک سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا نہیں، اس کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ابھی اسی کشمکش میں دوکان کے کاؤنٹر پر کھڑے تھے کہ ایک پنجابی عورت نے جو یہ سب مکالمہ سن رہی تھی دوکاندار سے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ جب ماجرا معلوم ہوا تو اس نے کہا آپ ان کو فارم دے دیجیے اور قیمت اپنے پرس سے نکال کر ادا کر دی۔ غفران صاحب نے ان سے کہا اپنا ایڈریس بتا دیں تا کہ بذریعہ ڈاک آپ کو ادائیگی کر دی جائے۔ عورت نے کہا نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور آگے بڑھ گئی۔

بی اے کے بعد شادی کی اور دیگر جھمیلے ایسے پیش آئے کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شادی کے کافی دن بعد 1970 کے دہے میں دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ وہ جن شخصیتوں سے متاثر تھے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ اسکول کے زمانے میں مولانا آزاد کی کتابیں اور تحریریں پڑھنے کا شوق تھا۔ 'الہلال' تذکرہ اور کچھ علمی مباحث انھوں نے پڑھے۔ علمی معاملات میں مولانا آزاد کا مرتبہ ان کی نگاہ میں مسلّم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں انھیں پیغمبر سیاست سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے اتنا شغف بڑھا کہ مولانا غفران احمد نے ابوالکلام آزاد اسٹڈی سرکل کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کا مقصد صرف مولانا آزاد ہی نہیں بلکہ تمام مسلم بزرگ مجاہدین آزادی کے مشن اور نظریات کو آگے بڑھانا تھا۔ ابوالکلام آزاد اسٹڈی سرکل نے حکیم محمد اجمل خاں اور دیگر مجاہدین پر کتابیں شائع کیں۔ رفتہ رفتہ مولانا آزاد کے یوم وفات اور یوم ولادت پر پروگرام ہونے لگے۔ یہ بہت اچھی شروعات تھی۔ پی آئی بی سے ہر یوم وفات پر انھیں مضمون کا حکم ہوتا تھا اور وہ بڑے ذوق و شوق سے مولانا آزاد پر مضامین لکھتے رہے۔

مولانا غفران احمد کہتے ہیں: ''اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ قوم پرست مجاہدین آزادی پر میرے مشن کو بڑی کامیابی ملی اور میڈیا میں ان پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دیگر قائدین کرام پر مضامین میڈیا میں آتے رہے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ لوگوں نے مجھ سے

پوچھا صرف مسلم مجاہدین ہی کیوں؟ میں نے جواب دیا۔ سوال مسلم اور غیر مسلم کا نہیں ہے بلکہ ہم صرف ان مجاہدین آزادی کو یاد دلانے میں مصروف ہیں جن کو فراموش کر دیا گیا۔ اب فراموشی کی بات سنی ہے تو یہ بتائیے کہ مولانا آزاد پر کوئی کام کیوں نہیں ہوتا۔ میرے دل میں حسرت ہی رہی کہ کاش کوئی انگریزی اخبار مولانا آزاد پر نمبر نکالتا۔ ایک غیر معروف انگریزی اخبار کو اس پر آمادہ بھی کیا کہ اس سلسلے میں سارا مواد میں فراہم کروں گا۔ لیکن افسوس کہ جس نے وعدہ کیا تھا اس نے وفا نہیں کیا''۔

صحافت کو انھوں نے اس لیے اختیار کیا کیونکہ اس میں ان کی قوت تخیل کی سمائی تھی۔ انھوں نے مالی نفع ونقصان کو خاطر میں لائے بغیر اخبار نویسی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ پہلے اخبار نئی دنیا، تیج، دور جدید، (ایڈیٹر مرحوم حافظ علی بہادر خاں) اور دیگر اخبارات کے بعد پرتاپ میں کام کیا۔ یہ ان کی معاشی مجبوری تھی۔ ان اخبارات میں ایسی بڑی شخصیتیں نہیں تھیں جن کو میں اپنی باقی ماندہ زندگی میں یاد کروں۔ ہاں پرتاپ اخبار میں نیوز ایڈیٹر آنجہانی چمن لال آزاد کا نام ضرور لوں گا۔ ان کا مجھ پر احسان رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ پرتاپ کی نوکری میں نے کچھ تو تنخواہ اور کچھ اوور ٹائم کی وجہ سے اپنائی۔ پرتاپ ہمیشہ ہی سے اوور ٹائم آمدنی کا خاص ذریعہ رہا ہے۔

وہ 1970 میں پرتاپ میں پہنچے، 28 برس تک اس اخبار میں سروس کرتے رہے۔ ان پر لوگ طنز کرتے تھے کہ اس متعصب اخبار میں آپ کیوں گئے وہ کہتے کہ خبروں کے لحاظ سے اس وقت اردو اخباروں میں سب سے اونچا اخبار پرتاپ ہے (بعد میں اور اخبارات بھی ابھر آئے) بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ اگر معاشی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ اپنا بھی کوئی اخبار نکال سکتے تھے۔

ان کا کہنا ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو صحافت اس اعلیٰ نقطے پر نہیں پہنچی جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ مثلاً اردو میں صحافت کا کوئی کورس نہیں، آدمی ٹرانسلیشن سے کام شروع کرتا ہے، اردو ایڈیٹر بن جاتا ہے۔ حالانکہ ایڈیٹر بننے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ زبان وخیال پر پوری طرح دسترس ہو۔ میں نے اردو والوں میں جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لیے یہ اعلان کیا کہ کوئی بھی شخص میری تحریر میں املا یا لفظ وبیان کی کوئی غلطی نکال کر لائے اور 50 روپے انعام لے جائے۔ مگر اٹھائیس سالہ ملازمت میں کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔

وہ پرتاپ اخبار کے بارے میں کہتے ہیں کہ پرتاپ اخبار لاہور سے دہلی میں آیا تھا جب تک مہاشہ کرشن حیات رہے یہ شرنارتھیوں اور اہل دہلی میں بہت مقبول رہا۔ پنجابی جہاں جہاں

آباد ہوئے وہ اخبار پرتاپ پڑھنا پسند کرتے تھے۔ مہاشہ جی کی تحریر چبھتی ہوتی۔ ان کا چبھتا ہوا انداز لوگوں کو پسند تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ بڑے بڑے رہنما ان کی تحریر پڑھتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں نشاندہی کی تھی کہ اداکار سے اداکارہ مونث بنانا غلط ہے۔ مرد ہو یا عورت دونوں کو اداکار کہا جانا چاہیے۔ فارسی ترکیب کے لحاظ سے مولانا آزاد کا یہ اعتراض درست تھا۔

مسٹر کے نریندر چیف ایڈیٹر کو اردو پر مہاشہ جی کی طرح دسترس نہیں تھی۔ تحریر کا انداز تیز وتند تھا۔ کبھی زبان جذبات کا ساتھ نہیں دیتی تاہم وہ اس معنی میں ایک مکمل جرنلسٹ تھے کہ مطالعہ بڑا وسیع تھا اور پابندی سے اپنا کام کرتے تھے۔

میرا خاص شوق مطالعہ رہا ہے۔ زندگی سے فرار کا ایک ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مطالعہ کو بنا دیا تھا اسی میں دل لگتا تھا۔ اپنا ہر غم بھول جاتا تھا۔ خواہ یہ غم جاناں ہو یا غم دوراں۔ اس کا ادراک عنفوان شباب میں ہی ہو چکا تھا کہ کتاب زندگی کی بہترین رفیق ہے۔ ایک دفعہ مدرسہ عالیہ کے دور میں کہ دوپہر کے کھانے کا یکسر انتظام نہیں تھا۔ میں دلی پبلک لائبریری میں داخل ہو گیا وہاں ایک طویل ڈائجسٹ پڑھنا شروع کر دیا۔ شام ہونے پر لائبریری سے ایک جگہ گیا شاید کچھ ادھار پانی مل جائے۔ وہاں سے نفی میں جواب ملا، چاروناچار واپس آکر رات میں سو گیا۔ صبح سویرے بھوکے کیا کلاس میں جاتے، روزی کی تلاش میں نکلے۔ اصغر علی عابدی مرحوم ایڈیٹر دعوت کشن گنج میں رہتے تھے۔ اخبار نویسی میں میری حوصلہ افزائی میں ان کا بڑا دخل رہا۔ جب ان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو انھوں نے گھر پر بٹھایا۔ کھانا کھلایا اور چلتے وقت تین روپے دیے۔ یہ دن گزر گیا۔ دوسرے دن اچانک چار بجے میرے کمرہ (مسجد فتح پوری) میں پہنچے اور کہنے لگے آؤ چلتے ہیں۔ ہمدرد دواخانہ کے سامنے ایک ہوٹل تھا جہاں شامی کباب بہت اچھے ملتے تھے وہاں لے گئے ہم دونوں نے کباب کھائے اور ایک ساتھ چائے پی۔

مولانا غفران احمد انتہائی سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ انھیں اپنے علم پر کوئی فخر وغرور نہیں تھا۔ وہ ایک بہت اچھے صحافی تھے اور کام میں جی لگاتے تھے۔ وہ اپنا وقت دفتر کے باہر برباد نہیں کرتے۔ خالی وقت میں کسی نہ کسی کتاب یا اخبار کا مطالعہ کیا کرتے۔ انھیں بہت سے اچھے صحافیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جن میں ناز انصاری کا نام قابل ذکر ہے۔ انھیں عظیم صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط سے بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ایک بار انھوں نے اپنی سبکدوشی کے

بعد انھیں اخبار الجمعیۃ میں بھیجا تھا۔ وہاں ایڈیٹر کے لیے انٹرویو چل رہا تھا۔ لیکن انٹرویو لینے والوں نے انھیں اخبار کے ایڈیٹر کے لائق نہیں سمجھا۔ وہ خوددار اور غیرت مند صحافی تھے۔ انھوں نے پوری زندگی عسرت وتنگ دستی میں گزاری لیکن اپنے صحافتی اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

◆◆◆

فکر تونسوی

طنز ومزاح کی دنیا کی معروف شخصیت فکر تونسوی کی پیدائش 17 کتوبر 1918 کو شجاع آباد ضلع ملتان میں ہوئی اوران کا انتقال 13 ستمبر 1987 کو دہلی میں ہوا۔ان کے والدین غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کے موضع تونسہ سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں شجاع آباد گئے تھے مگر پھر بعد میں واپس تونسہ آگئے اوراسی کی مناسبت سے فکر نے جن کا اصل نام رام لعل نارائن بھاٹیہ تھا،اپنے نام کے ساتھ تونسہ کی نسبت لگالی جوان کی ایک منفرد شناخت بن گیا۔

فکر تونسوی نے 1934 میں بغرض ملازمت تونسہ کو خیرباد کہہ دیااور مختلف مقامات پر چھوٹی موٹی ملازمت کرتے رہے۔ان کا زیادہ تر وقت لاہور میں گزرا۔تقسیم ہند کے وقت وہ ہندوستان چلے آئے۔ان کے والد دوکاندار تھے اوراپنے بیٹے کو بھی دوکاندار بنانا چاہتے تھے لیکن بیٹے کا دل دوکانداری میں نہیں لگا۔اس کو تو طنز ومزاح کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنا تھا۔وہ دوکانداری کرتے تو یہ کام کون کرتا۔ان کے والد طبابت بھی کرتے تھے۔ان کی طبیعت اس جانب بھی مائل نہیں ہوئی۔

فکر تونسوی کے والد ابتدا میں شجاع آباد کے ایک جاگیردار چودھری نارائن سنگھ کے یہاں میر منشی کے طور پر کام کرتے تھے۔بقول فکر تونسوی چودھری نارائن سنگھ نے میرے والد کے ساتھ کچھ بے ایمانی کی جس کی وجہ سے میرے والد شجاع آباد چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں تونسہ میں آکر بس گئے۔یہاں آکر انھوں نے ایک دوکان کھول لی۔چونکہ میرے والد فن طب سے بھی واقف تھے اس لیے وہ دوکان کے ساتھ ساتھ طبابت بھی کرنے لگے۔

فکر تونسوی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کی۔ان کے والد اردو اور

فارسی کا اچھا علم رکھتے تھے۔ پرائمری درجات کی تمام درسی کتابوں کی تعلیم فکر نے اپنے والد سے حاصل کی۔ پرائمری کے بعد آٹھویں جماعت تک کی تعلیم مڈل اسکول میگرڈھ تحصیل تونسہ سے حاصل کی۔ یہاں کے صدر مدرس صالح محمد صاحب نے فکر تونسوی کو کافی متاثر کیا۔ انھوں نے فکر تونسوی میں نہ صرف ادبی ذوق پیدا کیا، بلکہ اس کی تربیت بھی کی۔ فکر تونسوی شروع ہی سے بہت ذہین تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتے تھے۔ مڈل اسکول سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد فکر تونسوی نے گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ میں داخلہ لیا اور یہاں بھی میٹرک میں درجہ میں اول پاس ہوئے۔ فکر تونسوی کی اردو زبان شروع ہی سے بہت اچھی تھی۔ اس زبان سے ان کو کافی دلچسپی بھی تھی۔ گھر پر آنے والے تمام ادبی رسائل کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا کیوں کہ تونسہ میں کوئی انٹر کالج نہیں تھا وہاں صرف ایک سال کی تعلیم حاصل کر پائے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ معاشی حالت پہلے سے خراب تھی والد کے انتقال کے بعد معاشی حالت اور خراب ہوگئی۔ اس وجہ سے انھیں پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی۔ جو کچھ بھی انھوں نے حاصل کی وہ اپنی محنت اور لگن سے حاصل کی۔

صحافت کی دنیا سے فکر تونسوی کا پہلا رابطہ شیخ پورہ کے ڈسٹرک بورڈ کے ہفتہ وار اخبار ''کسان'' سے ہوا۔ اس وقت انھوں نے کتابت سیکھ لی تھی اور اس اخبار میں بطور کاتب لگ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ ملازمت انھوں نے چھوڑ دی اور ایک رنگریز کی دوکان پر ملازمت کرلی۔ لیکن محنت کا صحیح معاوضہ نہ ملنے کی وجہ سے اس نوکری کو بھی ترک کر کے دیواروں پر پینٹنگ اور رائٹنگ کا کام سنبھال لیا۔ ٹیچر کی حیثیت سے آریہ پرائمری اسکول میں ملازمت کی مگر اس سے بھی ان کی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی تھی۔ اس لیے اسے بھی چھوڑ دیا اور خوشبودار تیل کی ایجنسی لے لی۔

غرض کہ انھوں نے معاشی حالت کو بہتر کرنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ لیکن حقیقی معنوں میں وہ ایک ادیب تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب ان کی نظم ''تنہائی'' لاہور کے مشہور ادبی پرچے ''ادب لطیف'' میں چھپی۔ اس کے بعد فکر تونسوی کو حلقۂ ارباب ذوق میں شامل کرلیا گیا۔ ان کی یہ پہلی نظم 1942 کی بہترین نظم تسلیم کی گئی۔ لاہور میں آکر فکر تونسوی کا ادبی ذوق پروان چڑھنے لگا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد فکر تونسوی کو

''ادب لطیف'' جیسے معیاری پرچے کی ادارت کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ اپنی مسلسل کوششوں سے انھوں نے اس پرچے کو وقار بخشا اور اس کے معیار کو بلند کیا۔ چونکہ یہ رسالہ ترقی پسند نظریات کا حامل تھا اس لیے یہیں سے فکر تونسوی کے ذہن میں ترقی پسند نظریات پروان چڑھنے لگے۔ حالانکہ فکر تونسوی خود اپنے آس پاس اور گھریلو ماحول میں استحصال کو دیکھ کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے اور لاہور کے اس حلقے میں بیٹھ کر ایک پختہ کار ترقی پسند کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد لاہور ہی سے انھوں نے مشہور افسانہ نگار ممتاز مفتی کی مدد سے ایک دو ماہی پرچہ ''سویرا'' نکالا۔ اس پرچے کے نکلتے ہی ادبی حلقوں میں ہلچل سی مچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار معیاری ادبی رسالوں میں ہونے لگا۔ اس دور کے مشہور ادیبوں کے مضامین اس پرچے میں باقاعدہ چھپنے لگے۔ ان ادیبوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، فراق گورکھپوری، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور وامق جونپوری کے نام کافی اہم ہیں۔ اس دور کے تمام بڑے ادیبوں کا تعاون اس پرچے کو حاصل تھا خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند۔ اس رسالے کے ساتھ ساتھ خود فکر تونسوی کا ادبی مقام بھی مستحکم ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ انھوں نے ''سویرا'' کو ممتاز مفتی کے حوالے کر کے دوبارہ ''ادب لطیف'' کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فکر تونسوی جس قدر مسلسل ذہنی اور جسمانی مشقت کرتے تھے اس سے ان کی معاشی حالت میں کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا تھا۔

نومبر 1947 میں فکر پاکستان سے ہجرت کر کے ہمیشہ کے لیے ہندوستان آ گئے۔ وہ سب سے پہلے جالندھر پہنچے اور وہیں کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہو گئے۔ اشتراکی ذہنیت کے تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ اس پارٹی سے باقاعدہ جڑ جانے کے بعد ان کی اشتراکی ذہنیت اور پختہ ہو گئی۔ مخمور جالندھری کے ساتھ مل کر انھوں نے ادبی ذوق کی تسکین کی۔ وہ معاش کے لیے جالندھر ریڈیو اسٹیشن سے منسلک ہو کر اس کے لیے اسکرپٹ لکھنے لگے۔ فکر کو جالندھر قیام کے دوران پارٹی کے کام کے سلسلے میں کئی بار دہلی آنے کا اتفاق ہوا۔ دہلی میں ان کو مختلف صحافیوں، ادیبوں اور پارٹی کے ممبران سے ملنے کا موقع بھی ملا۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے ان کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور ایک وقت ایسا آیا جب انھوں نے جالندھر کو خیر باد کہہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

دہلی میں ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ان کا نام صحافتی حلقوں میں پہلے سے متعارف

ہو چکا تھا۔ لہٰذا دہلی میں انھیں روزنامہ ''ملاپ'' میں کالم نویسی کی ذمہ داری سونپی گئی جسے انھوں نے بخوبی انجام دیا اور بہت جلد اردو کے معروف کالم نگاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اس دوران ''ملاپ'' کے علاوہ ''بیسویں صدی'' کے لیے بھی وہ مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ ملاپ میں ان کا کالم ''پیاز کے چھلکے'' کافی مشہور ہوا۔ اسے ہر شخص پڑھتا تھا۔ اس میں ہر شخص کے مسائل پر اور ہر طبقے کے مسائل پر اظہار خیال ہوتا اور فکر کے اپنے انداز میں ہوتا۔ ان کا کالم پڑھنے کے لیے لوگ اخبار کی چھینا جھپٹی بھی کرتے۔ انھوں نے پورے چالیس سال تک ہر خاص و عام کو ادب اور ظرافت کا دو آتشہ جام پلایا۔ یوں تو انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زائد ہے لیکن جو شہرت انھیں پیاز کے چھلکے سے ملی وہ شاید کسی اور سے نہیں ملی۔

ملاپ میں تقریباً 25 برس کام کرنے کے بعد 1978 میں وہ وہاں سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ مختلف اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔ جن میں جالندھر کا پنجاب کیسری اور ممبئی کا انقلاب قابل ذکر ہیں۔ وہ زندگی بھر عسرت اور تنگ دستی سے گزرتے رہے لیکن خوددار اتنے تھے کہ نہ تو کسی کے آگے کبھی دست سوال دراز کیا اور نہ ہی کسی کے رحم و کرم اور عنایات کی جانب کبھی نگاہ اٹھائی۔ ن کے ایک دوست ڈاکٹر جے ٹی بھاٹیہ کے مطابق انھوں نے ایک بار فکر تونسوی سے باتوں باتوں میں پوچھ لیا کہ فکر بھائی آپ نے عمر بھر اخبارات میں سر کھپایا، اردو ادب کے بہت بڑے طنز و مزاح نگار بنے لیکن اس سے آپ کو کیا ملا؟ انھوں نے بلا جھجھک جواب دیا کہ کل ملا کر تین ہزار روپے ماہوار۔ اس پر ان کے دوست حیران و پریشان رہ گئے اور غم و افسوس کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ انھوں نے فکر صاحب کی کچھ مالی مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے سرے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک بار ایک وزیر نے ان کے ادبی شغف سے متاثر ہو کر انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر فکر نے کہلا بھیجا کہ آپ خود ہی کیوں نہیں چلے آتے کہ آپ کے پاس کار بھی ہے اور آپ بیکار بھی ہیں۔ یہ ان کی خودداری اور غیرت مندی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

فکر تونسوی حقیقتاً ادیب تھے۔ اخبار میں کام صرف معاش کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کرتے تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے غزلیں کہیں۔ پھر نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے شاعری کا دامن تنگ نظر آیا اس لیے انھوں نے شاعری ترک کر کے نثر کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اپنی شاعری کے

بارے میں موصوف ایک جگہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں: ''ایک شاعر......؟ مثلاً فکر تونسوی کو ہی لے لیجیے۔ یہ صاحب آج سے چالیس سال پہلے شاعر تھے مگر شاعری کرتے تھے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی اپنی سمجھ میں آنا بھی بند ہوگئی۔ شاعر کو جب کوئی سامنے نہ ملے، اس سے داد نہ ملے۔ حتیٰ کہ کوئی ہوٹ کرنے والا بھی نہ ملے......تو......؟ چنانچہ فکر تونسوی نے شاعری ترک کردی اور شادی کرلی۔ شادی لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ اس لیے فکر تونسوی زندہ رہا تو اس کی شاعری سورگ سدھار گئی''۔

''پیاز کے چھلکے'' کی مقبولیت کو دیکھ کر ماہنامہ ''بیسویں صدی'' نے بھی لکھنے کی پیش کش کی جس کو فکر تونسوی نے بخوشی قبول کرلیا۔ دراصل فکر تونسوی کی آمدنی کا واحد ذریعہ ان کا قلم ہی تھا اس لیے روزگار کے کسی بھی موقع کو وہ آسانی سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اخباروں اور رسالوں کے علاوہ فکر نے مختلف موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی کل تیس کتابیں شائع ہوئیں جن میں اردو اور ہندی دونوں شامل ہیں۔ اردو کتابوں کی تعداد پچیس اور ہندی کی تعداد پانچ ہے۔ ان کی قابل ذکر تصنیفات کے نام ہیولے (شعری مجموعہ)، چھٹا دریا، خدوخال، پیاز کے چھلکے، فکر بانی اور فکر نامہ ہیں۔

◆◆◆

کے نریندر

روزنامہ ''پرتاپ'' کے ایڈیٹر کے نریندر اپریل 1914 میں لاہور میں پیدا ہوئے اور اکتوبر 2010 میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ پرتاپ اخبار ان کے والد مہاشہ کرشن نے 1919 میں لاہور سے شروع کیا تھا۔ مہاشے جی ایک مجاہد آزادی تھے اور اپنی شعلہ بیان تحریروں کی وجہ سے ان کو بارہا جیل جانا پڑا تھا۔ ان کی تمام خصوصیات ان کے بیٹے کے نریندر میں موجود تھیں۔ کے نریندر بھی محبِ وطن تھے اور انھیں بھی جیل یاترا کرنا پڑی تھی۔ انھوں نے 1938 میں پرتاپ اخبار جوائن کیا اور 1947 میں اس میں باضابطہ کام کرنا شروع کیا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ دہلی آگئے اور یہاں سے انھوں نے پرتاپ شروع کیا۔ پہلے اس اخبار کا دفتر آصف علی روڈ پر تھا بعد میں بہادر شاہ ظفر روڈ پر آیا اور اس عمارت سے نکلنا شروع ہوا جس میں آج بھی پرتاپ کا دفتر ہے۔ انھوں نے 1954 میں اسی عمارت سے ہندی میں ویر ارجن نکالا۔

یوں تو پرتاپ ان ہندو شرنارتھیوں کا اخبار رہا ہے جو پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی لیے اس اخبار میں ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کے نریندر کی ذاتی زندگی میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ہاں ان کو اس کا بات شکوہ ضرور تھا کہ انھیں ایک فرقہ پرست سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی نالاں تھے کہ مسلمانوں نے ان کو صحیح طریقے سے نہیں سمجھا۔ ان کے دفتر میں آج بھی مسلم کارکنوں کی خاصی تعداد ہے اور پہلے بھی تھی۔ پرتاپ کی پالیسیوں سے اختلاف کے باوجود اردو صحافت میں اس کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے والد کی مانند وہ بھی ایک بے باک اور نڈر صحافی تھے۔ جس بات کو سچ سمجھتے تھے اسے

لکھنے میں انھیں کوئی خوف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت سی باتوں پر مسلمانوں کو ناراض ہوتے دیکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ حکومت کی غلط پالیسیوں پر بھی نکتہ چینی کرتے اور قطعاً پروا نہیں کرتے کہ اس سے کوئی وزیر یا کوئی افسر ناراض ہو جائے گا۔ پرتاپ اخبار مہارانا پرتاپ کی یاد میں نکلنا شروع ہوا اور ابتدا سے ہی اس کی ایک ہی پالیسی رہی، یعنی ہندوتو کی پالیسی۔ یہ اخبار پہلے بھی ہندو فرقہ کے مفادات کا ترجمان تھا اور آج بھی ہے۔ البتہ کے نریندر کے انتقال کے بعد اس اخبار کی طے شدہ پالیسی کی دھار کند ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں پرتاپ میں مسلمانوں کے خلاف مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور ایک زمانے میں الجمعیۃ اخبار اور پرتاپ میں نوک جھونک چلتی رہی ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ اخبار مہارانا پرتاپ کی یاد میں نکلا اور دوسرے یہ کہ ہر اخبار کی اپنی ایک پالیسی ہوتی ہے لہٰذا اس اخبار کی بھی ایک پالیسی رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ پالیسی مسلمانوں کو سوٹ نہیں کرتی۔ اگر کبھی کوئی ان سے پوچھتا کہ آپ اپنے اخبار کی پالیسی میں ترمیم کیوں نہیں کرتے یا پالیسی کی شدت کم کیوں نہیں کر دیتے تو ان کا الزامی جواب ہوتا کہ مسلم اخبار اپنی پالیسی کیوں نہیں بدلتے۔ گویا ان کی پالیسی کی ایک وجہ مسلم اخباروں کی پالیسی بھی رہی ہے۔

مہاشہ کرشن اور کے نریندر کے زمانے میں اخبار پرتاپ مسلمانوں میں اپنی خبروں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے اداریوں کی وجہ سے موضوع بحث بنا رہتا۔ کے نریندر اداریہ لکھنے میں ماہر تھے۔ بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ پہلے خود لکھا کرتے تھے بعد میں املا کرانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے اداریوں میں ذاتیات کو داخل نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ان کے والد مہاشہ کرشن کی تحریروں کے بارے میں ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا کہ ''ظالم قلم سے نہیں تیشے سے لکھتا ہے''۔ کے نریندر نے بھی اسی تیشے کو قلم بنایا اور اس کی بالکل پروا نہیں کی کہ یہ تیشہ کسی کا سر پھوڑے گا یا بازو قلم کرے گا۔ اسی تیشے سے وہ بھی زندگی بھر لکھتے رہے۔ مہاشہ جی کی مانند وہ بھی اپنے اداریوں میں پنجابی محاورے فٹ کر دیتے۔ انھیں اردو اور فارسی میں اپنے والد کی مانند دسترس حاصل نہیں تھی شاید یہی وجہ ہے ان کے دور میں اخبار میں ہندی کے الفاظ زیادہ لکھے جانے لگے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اداریوں میں اردو اور فارسی کے عالموں اور شاعروں کے اشعار اور مقولے برجستہ استعمال کرتے تھے۔ سنسکرت کی بھی خاصی شد بد رکھتے تھے اور بعض مقامات پر سنسکرت کے الفاظ بھی در آتے تھے۔

کے نریندر اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کی مانند ایک پکے آریہ سماجی تھے۔ وہ جب بھی آریہ سماج کے کسی جلسے میں جاتے تو اپنے والد کی مانند آمد و رفت کا خرچ خود اٹھاتے منتظمین سے اس کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ان کے ایک رفیق کار وشوناتھ سکہ کے مطابق ''کے نریندر کا یہ واضح عقیدہ تھا کہ اخبار کو چلانے کے لیے کسی مخصوص مذہب کی نہیں بلکہ سچائی اور انسانیت پر مبنی اخلاقی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک سیکولرزم کا مطلب ہر مذہب کا احترام اور کسی کو بیجا خوش نہ کرنا ہے۔ اردو زبان کے تعلق سے کے نریندر جی کی یہ رائے تھی کہ اردو پریس کے ایک بڑے طبقے نے اس زبان کو مسلمانوں کی زبان بنا دیا ہے۔ یہ لوگ اردو سے فائدہ اٹھانے کے لیے چند ہندوؤں کے نام ضرور لیتے ہیں لیکن یہ محض ایک دکھاوا ہے۔ عملاً انھوں نے اسے مسلمانوں ہی کی زبان بنا رکھا ہے۔ کے نریندر ہندتو کے پجاری تھے۔ وہ ہندوؤں میں بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ متعصب ہرگز نہیں تھے''۔ پرتاپ کے عملہ میں ہندو، مسلمان سبھی شامل رہے ہیں اور ان لوگوں کے مطابق کے نریندر سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے ناطے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہی رکھتے تھے۔

کے نریندر صرف ایک صحافی نہیں تھے بلکہ ایک منتظم بھی تھے۔ پرتاپ کے انتظامی شعبے کی ذمہ داری بھی وہ آخر تک خود ہی نبھاتے رہے۔ وہ وقت کے بہت پابند تھے۔ مجال کیا کہ نظام الاوقات میں کبھی کوئی تبدیلی کرنی پڑے۔ بقول سکہ ''لوگ ان کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت صحیح کرتے تھے''۔ وہ کام کو اہمیت دیتے تھے آرام کو نہیں۔ انتقال سے تقریباً پندرہ سال قبل دو آپریشن آنکھ اور پیٹ کے کروائے تھے۔ لیکن تیسرے روز ہی دفتر میں جا دھمکے اور کام کرنے لگے۔ ملازموں کے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا کہ جس کو ایک بار رکھ لیا رکھ لیا۔ خود سے نہیں نکالتے تھے ہاں اگر کوئی جانا چاہے تو اس کو روکتے بھی نہیں تھے۔ تنخواہوں کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔ وہ کام کے علاوہ اپنی صحت پر بھی دھیان دیتے تھے۔ آخری عمر میں بھی ورزش کیا کرتے۔ اسی سال کی عمر میں بھی چاق و چوبند تھے۔

پرتاپ ایک دیش بھکت اخبار رہا ہے۔ وہ جہاں ہندوؤں کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتا وہیں انگریزوں کے خلاف بھی جم کر لکھتا جس کی وجہ سے اس اخبار کی ضمانتیں ضبط ہوتی رہتیں۔ خود مہاشہ کرشن اور کے نریندر کو بھی قید و بند کی سزا سے گزرنا پڑا تھا۔ کے نریندر اپنے ایک مضمون

میں لکھتے ہیں" ...... پرتاپ پر دوہری مار ہوتی تھی۔ کانگریس انگریزوں سے برسر جنگ ہوتو پرتاپ اس کے ساتھ ہوتا۔ اس لیے ضمانتوں کی ضبطی کی صورت میں تپ اور تیاگ کی بھٹی سے گزرنا پڑتا۔ لیکن جب کانگریس کی تحریک دب جاتی اور فرقہ وارانہ اختلافات ابھر آتے تھے تو اسے ہندوؤں کی رکھشا کے لیے سربکف ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ پرتاپ کی کئی ضمانتیں جہاں گاندھی جی کا ساتھ دینے کے جرم کی پاداش میں ضبط ہوئیں وہیں کئی ضمانتیں ہندوؤں کی حفاظت کے جرم میں بھی ضبط ہوئیں۔ جب احرار نے جموں وکشمیر پر دھاوا بولا تھا تب بھی پرتاپ کی ضمانت ضبط ہوئی تھی۔ جب 1937 میں پہلی پنجاب اسمبلی بنی تو سرسکندر اس کے پہلے لیڈر اور چیف منسٹر تھے۔ کانگریس نے 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور کرلیا تھا اور وہ یوپی، بہار، اڑیسہ، مدراس اور بمبئی میں برسراقتدار آگئی تھی۔ سرسکندر کے عہد میں پرتاپ کی ضمانتیں کئی بار ضبط ہوئیں"۔

کے نریندر اسی مضمون میں اپنے اور ان کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "...... گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑو کا نعرہ لگا دیا۔ یہ نعرہ ایک بہت بڑی انقلابی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ 6 اگست 1942 کو اس تحریک کی تصدیق کے لیے بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ اور 6 اگست کی رات میں کمیٹی نے متعلقہ پرستاؤ پاس کر دیا۔ دوسری صبح گاندھی جی اور کانگریس کے چھوٹے بڑے سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ ملک بھر میں دھر پکڑ شروع ہوگئی۔ اس روز مہاشہ جی بھی بمبئی میں تھے۔ دوپہر کو ان کو معلوم ہوا کہ لاہور میں نریندر اور ویریندر بھی گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ دوسرے دن مہاشہ جی بمبئی سے لاہور روانہ ہو گئے اور 12 اگست کی شام کو لاہور پہنچ گئے۔ 24 گھنٹے بعد یعنی 13 اگست کو انھیں گرفتار کرلیا گیا اور ایک دن حوالات میں اور ایک دن جیل میں رکھنے کے بعد انھیں بھی کے نریندر اور ویریندر کے پاس کیمپ جیل شاہ پور میں بھیج دیا گیا"۔

پرتاپ اخبار شروع شروع میں شام کو شائع ہوتا تھا۔ مگر غالباً سوامی شردھانند کی موت کے بعد صبح کے وقت شائع ہونے لگا۔ تقسیم وقت سے عین قبل راولپنڈی میں یہ اخبار شام کے وقت فروخت ہوتا تھا۔ وہاں اس کے نامہ نگار مولانا خدا بخش اظہر امرتسری تھے جو کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں وہ مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ پرتاپ اخبار نے غیر ملکی خبر رساں ایجنسی "رائٹر" کی خدمات اس وقت حاصل کی تھیں جب ملک میں صرف دو ار دو اخباروں کو یہ سروس حاصل تھی۔ لاہور میں یہ دوسرا اخبار تھا جس

نے ٹیلی پرنٹر لگوایا۔ پرتاپ نے سب سے پہلے ''سنڈے ایڈیشن'' اور بعد میں ''کنول ایڈیشن'' کے نام سے ہر ماہ افسانوں کا شمارہ شائع کرنا شروع کیا۔ بقول جمنا داس اختر'' اس وقت پنجاب بلکہ تمام ہندوستان میں پرتاپ سب سے زیادہ شائع ہونے والا اردو اخبار تھا''۔

پرتاپ میں چوٹی کے ادیب، شاعر اور افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ مولانا ظفر علی نے کئی بار اس کے کرشن نمبروں کے لیے نظمیں لکھیں۔ منشی پریم چند پرتاپ کے افسانہ ایڈیشنوں کے لیے خاص طور پر افسانے لکھ کر بھیجتے۔ مولانا وقار انبالوی بھارتی کے نام سے پرتاپ میں سیاسی کلام شائع کرواتے۔ ساگر چند گورکھا جو بعد میں آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہوئے پرتاپ میں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ سیف اکبر آبادی پرتاپ کے ایڈیٹوریل ٹیم میں شامل تھے۔

پرتاپ اور مہاشہ کرشن کے بارے میں ''چٹان'' کے ایڈیٹر شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ لاہور میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ہندوؤں کے اردو روزناموں کا زور بندھا ہوا تھا۔ پنجاب سرحد بلکہ کراچی تک ''ٹربیون'' واحد انگریزی روزنامہ تھا جو لاہور سے نکلتا اور ہندوؤں کی ملکیت تھا۔ ان کے مطابق ''یہ اردو تذکرہ نویسوں کا سیاسی تعصب ہے کہ وہ ان روزناموں سے صرف نظر کرتے ہیں۔ محض سرسری ذکر اذکار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان روزناموں نے ملکی خبروں کا مزاج بدلا۔ سہل نویسی کی بنیاد رکھی اور اداریوں کو سیاسی مذاق و میلان تک محدود رکھا''۔

کہنے کو تو لاہور میں ہندوؤں کے بہت سے روزنامے اور ہفتہ وار اخبار تھے لیکن جن اخباروں نے بہت زیادہ نام پیدا کیا اور جن کے ایڈیٹروں کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا ان میں پرتاپ کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن سرفہرست تھے۔ وہ آریہ سماجی تھے اور سوامی دیانند کے پیرو تھے۔ جب انھوں نے پرتاپ جاری کیا تو اس وقت ہندوؤں کا ایک بھی سیاسی روزنامہ نہیں تھا۔ سر مائیکل ایڈوائر پنجاب میں گورنر تھا۔ اس کو سیاسی تحریکوں سے للّہی بغض تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کو حیدر آباد سے اسی کے ایما پر نکلنا پڑا تھا۔ ایک تقریر پر مولانا کو پانچ سال عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تو یہ خبر سب سے پہلے پرتاپ نے ہی شائع کی تھی۔ اس پر ایڈوائر بگڑ گیا اور پرتاپ بند ہو گیا۔ مہاشہ جی کو ڈیڑھ برس کی سزا ہوئی۔ جیل سے باہر آئے تو پھر پرتاپ جاری کیا۔

پرتاپ کے ایک کارکن ابراہیم مفتاحی نے ایک عرصے تک ان سے اداریوں کا ڈکٹیشن لیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنا آخری اداریہ 16 اکتوبر 2010 کو املا کروایا تھا۔ اس دن جب

وہ گئے اور نمسکار کر کے ان کے پاس بیٹھ گئے اور ان سے پوچھا سر آپ کیسے ہیں تو انھوں نے کہا کہ بھئی ٹھیک ہوں لیکن کمزوری ہے اور نیند بہت آرہی ہے۔ پھر انھوں نے اپنی زندگی کا آخری اداریہ لکھوایا جس کا عنوان تھا "چین اور پاکستان تنگ کر سکتے ہیں"۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ نریندر جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پوچھنے پر کہا کہ ہاں ٹھیک نہیں ہے۔ بس اتنا ہی لے جایئے اور خبریں وغیرہ لگوا دیجیے گا۔ بقول ابراہیم مفتاحی میں ایک مسلمان ہوں اور شرعی وضع قطع میں رہتا ہوں لیکن انھوں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا بلکہ میں ان سے بہت سے سوالات کرتا جس کے وہ ضرور جواب دیتے خواہ مثبت ہو یا منفی۔ "آخری چند مہینوں میں جب کبھی مسلم مسائل پر اداریہ لکھواتے تو کہتے کہ بھئی میری زبان سے اگر کوئی ایسا لفظ یا جملہ نکل جائے جو اسلام کے خلاف ہو تو اسے آپ نہ لکھیں۔ انتقال سے ایک دو ماہ قبل اسلامیات میں ان کو خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اکثر مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے حتیٰ کہ ایک روز بڑی سنجیدگی سے کہا کہ میں قرآن شریف کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مجھے ہندی، اردو یا انگریزی میں قرآن لا کر دیجیے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے ایک غیر مسلم ساتھی نے مجھ سے قبل ہی ہندی قرآن لا کر ان کو دے دیا۔ لیکن انھوں نے کہا کہ یہ کافی ضخیم ہے اس عمر میں اس کا پڑھنا میرے لیے مشکل ہے"۔

◆◆◆

گوپال متّل

گوپال متل کی پیدائش 7 جون 1906 کو مالیر کوٹلہ، پنجاب میں ہوئی اور ان کا انتقال 15 اپریل 1993 کو دہلی میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں انھوں نے گریجویشن کیا اور تقسیم ہند تک وہیں رہے۔ انھیں صحافت اور ادب کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب بھی تھے۔ انھیں بہت بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ کام کرنے یا رہنے کا موقع ملا تھا۔ جہاں انھوں نے کئی اخباروں اور رسالوں میں کام کیا وہیں انھوں نے کئی نثری اور شعری مجموعے بھی چھوڑے ہیں۔ انھوں نے گریجویشن کرنے کے بعد خود کو صحافت، سیاست اور ادب کے لیے وقف کر دیا۔ اس سے قبل 1933 میں انھوں نے لدھیانہ سے ''صبح امید'' نام کا ایک رسالہ جاری کیا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ لیکن وہ پہلا شمارہ ہی آخری بھی ثابت ہوا۔ بعض وجوہ سے اس کا دوسرا شمارہ نہیں نکل سکا۔ حالانکہ اگر انھوں نے اسے جاری رکھا ہوتا تو وہ ادبی دنیا میں ایک اہم مقام کا حامل ہوتا۔

''گوپال متل: شخصیت اور فن'' میں شامل ایک مضمون میں انھوں نے جہاں بہت سی باتوں پر اظہار خیال کیا ہے وہیں ''صبح امید'' پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''صبح امید شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کو پسند آیا۔ لاہور سے اختر شیرانی اور دوسرے دوستوں نے اس کے لیے اپنی چیزیں بھیجی تھیں اور اسد ملتانی نے خیر مقدمی رباعی کہی تھی۔ سب سے بڑی داد مجھے اس شمارے کی یہ ملی کہ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اپنے سہ ماہی رسالے ''اردو'' میں اس پر تبصرہ کیا۔ تبصرہ مجموعی طور پر ہمارے حق میں تھا البتہ دو ایک مضامین کے طرز نگارش کو (جو میری یا نظیر کی تصنیف

نہیں تھی) زیادہ شوخ قرار دیا تھا۔ تبصرے میں صبح امید کے اغراض و مقاصد پر بحث تھی۔ پرچے کا اہم مقصد ہم نے اردو زبان کا تحفظ قرار دیا تھا۔ بابائے اردو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس پر مسرت کا اظہار کیا تھا کہ ابھی ایسے ہندو موجود ہیں جو اردو زبان کے تحفظ و ترقی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں اس تبصرے پر بہت خوش تھا لیکن اپنے ہندو ہونے کا ذکر مجھے پسند نہیں آیا کیونکہ زندگی ایسی رہی تھی کہ ان خطوط پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ صبح امید کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ اس کے بعد میں کچھ دنوں تک لدھیانے میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر مالیر کوٹلہ میں چند روزہ قیام کے بعد لاہور کا رخ کیا''۔

اس کے بعد وہ لاہور سے شائع ہونے والے کئی رسالوں اور اخباروں سے وابستہ رہے جن میں روزنامہ 'بھارت ماتا'، 'ملاپ'، 'نیشنل کانگریس'، 'چترا ویکلی'، 'جگت لکشمی'، 'مزدور کی آواز' اور 'تیج' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کے ادبی جریدے ''شاہکار'' اور چودھری برکت علی کے ماہنامے ''ادب لطیف'' میں بھی کام کیا۔ ان دونوں رسالوں نے ان کے اندر پوشیدہ ادبی جوہر کو مہمیز لگائی اور ان کی ادبی و صحافتی صلاحیتیں کھل کر لوگوں کے سامنے آگئیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور سے دہلی چلے آئے اور یہاں انھوں نے ماہنامہ ''تحریک'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ رسالہ پابندی کے ساتھ 1981 تک شائع ہوتا رہا۔ تقسیم ملک سے قبل انھوں نے کچھ دنوں تک روزنامہ ''نوائے وقت'' میں بھی کام کیا تھا۔ حمید نظامی نے انھیں شفٹ انچارج کی ذمہ داری تفویض کی تھی۔ انھوں نے لاہور میں ایک اشاعتی ادارہ نیشنل اکیڈمی کے نام سے قائم کیا تھا۔ وہ جب دہلی آگئے تو یہاں اس کی تجدید ہوئی۔

ماہنامہ ''تحریک'' کے بارے میں جید صحافی حیات اللہ انصاری لکھتے ہیں:

''میں تحریک کا کافی عرصے سے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل میں مستقل قدر پیدا کی وہ ہے ان کا تجزیہ اور استدلال۔ یہ مخالف ہوں یا موافق دونوں حالتوں میں ان کا قلم استدلال کو پیش نظر رکھتا ہے۔ دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت متاثر کیا ہے وہ ہے ان کا تہ دار مشاہدہ جس میں جذبات، تجزیہ اور استدلال سب کی بہت توازن سے آمیزش ہوتی ہے اور پھر اس نسخے سے جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں وہ خوبصورت شاہکار ہوتے ہیں''۔

گوپال متل کا انداز تحریر بہت منجھا ہوا اور جچا تلا ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ سطحیت ہوتی ہے اور نہ ہی ہلکا پن۔ بلکہ وہ جو بات بھی کہتے بہت مؤثر انداز میں اور دلائل کے ساتھ کہتے۔ ہر ایک بات کا تجزیہ گہرائی میں جا کر کرتے اور تجزیہ سے قبل کوئی نتیجہ نہیں نکالتے۔ وہ ترجمہ بھی بہت عمدہ کرتے۔ اس میدان کے وہ زبردست شہسوار تھے۔ انگریزی سے اردو میں بامحاورہ ترجمہ کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ زبان کی نزاکتوں سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھے اور ترجمہ کے وقت ان کا بڑی دیانت داری کے ساتھ استعمال کرتے۔ 'ظلمت نیم روز'، 'پتھر کے دیوتا'، 'سورما کی ہار'، 'ببول کے پیڑ' اور 'کینسر وارڈ' ان کے مترجمہ ناول ہیں۔ آخر الذکر کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ یہ تراجم اس بات کے شاہد ہیں کہ انھیں فکشن سے زبردست لگاؤ تھا۔ انھوں نے اوائل عمر ہی میں ایک کتاب ''انقلابی افسانے'' مرتب کی تھی جس سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا تھا۔

گوپال متل کی ادبی وصحافتی شخصیت کو چمکانے میں لاہور کے ادبی وصحافتی ماحول نے بہت مثبت کردار ادا کیا تھا۔ ماہنامہ ''صبح امید'' اور ماہنامہ ''شاہکار'' سے روزنامہ ''نیشنل کانگریس'' اور پھر متعدد روزناموں میں کام کرنے کے بعد انھوں نے ادبی صحافت کی طرف مراجعت کی۔ اس دوران انھوں نے زندگی سے بہت سے تجربات حاصل کیے۔ زمانے کے سرد و گرم کو چکھا اور حالات کی چکی میں خود کو پیس کر اور دشواریوں کی بھٹی میں خود کو تپا کر ایک جامع انسان، مکمل صحافی اور نباض ادیب کی شکل میں خود اپنی پرورش کی۔ صحافت ان کی زادِ حیات بنی اور ادب ان کے ذوق کی تسکین بنا۔

ان کی ذہنی پرورش مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ''ہمدرد''، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''الہلال'' اور مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' کے صحافتی ماحول میں ہوئی تھی۔ ایسے ماحول میں جبکہ غیر یقینی چھائی ہوئی تھی انھوں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کے رسالہ ''شاہکار'' اور روزنامہ ''نیشنل کانگریس'' سے وابستہ ہو کر اس روایت کو برقرار رکھا جس کی بنا مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے ڈالی تھی۔ مولانا تاجور ایک غیر متعصب انسان تھے جس سے گوپال متل نے خوب استفادہ کیا۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان میں نیاز فتح پوری کا رسالہ ''نگار'' اور مولانا عبد الماجد دریابادی کے ''صدق'' جاری تھے۔ لیکن وہ عوامی نہیں تھے بلکہ ادبی تھے۔ ادھر ادب پر ترقی پسند تحریک نے اپنے اثرات ڈالے جنھیں بہت سے لوگ منفی اثرات کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ترقی

پسند تحریک صحافت پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ اس وقت اردو صحافت پر ایک طرح کا جمود چھایا ہوا تھا۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے ایک طرف جمعیۃ علما کے اخبار ''الجمعیۃ'' نے کام کرنا شروع کیا تو دوسری طرف گوپال متل نے ''تحریک'' کے ذریعے اس جمود کے خلاف لڑائی شروع کی۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی زبردست انداز میں مخالفت کی اور اس کے خلاف ایک طرح سے جنگ کی۔

''تحریک'' کی تقریباً 28 برسوں کی اشاعت کے دوران ان کے قلم نے سیکڑوں شذرات لکھے اور بے شمار مضامین قلمبند کیے۔ وہ اگرچہ ایک صحافی کی حیثیت سے بہت سے مضامین رواروی میں لکھتے لیکن ان میں بھی استدلال، جواز، براہین اور شہادت سے کام لیا جاتا۔ گوپال متل کے موضوعات کا دائرہ بھی کافی وسیع تھا۔ مثلاً انھوں نے اردو تحریک، اردو کا دشمن کون، یہ اردو کے حمایتی، اردو کا مقدمہ: غلط عدالت غلط وکیل، اردو ایک حقیقت پسندانہ جائزہ جیسے متعدد مضامین میں زبان اور لسانیات کے مسائل پر بیباکی کے ساتھ دوٹوک اور غیر جانبدارانہ انداز میں کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ان موضوعات پر ایسے اچھوتے نکتوں پر روشنی ڈالتے جو اس سے قبل چھیڑے نہیں گئے تھے۔ ادب میں جانبداری کا حقیقی مفہوم، ترقی پسندی اور تحریک، ادب میں فحاشی پر احتساب، احیائے ادب کی تحریک، سماجی حقیقت نگاری، اردو ادب میں ہندوستانیت کا فقدان، داخلیت کی اہمیت، ادب اور زندگی، متحدہ ادبی محاذ اور اردو ادب میں جمود کا مسئلہ۔ یہ ایسے مضامین ہیں جن میں ان کی ادبی وتنقیدی بصیرت کھل کر سامنے آئی ہے جو ان کی سخن فہمی اور ادب شناسی کا بھی ثبوت ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کی بقا اور ترقی سے گوپال متل کو گہری دلچسپی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ موجودہ دور میں کوئی زبان صرف اپنی خوبیوں کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے کچھ قانونی تحفظات بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ صرف اس لیے کہ اردو کا ادبی سرمایہ کافی وقیع ہے کم ہی لوگ اسے پڑھنا چاہیں گے۔ لیکن اردو پڑھ کر اپنی عملی زندگی میں وہ اگر کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو پھر ان کے سامنے اردو کی خوبیوں کی دہائی دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لوگ خود ہی اسے پڑھنے لگیں گے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ اردو کی اس حیثیت کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ان تمام صوبوں میں ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے جو اس زبان کے حلقۂ اثر میں شامل ہیں۔

گوپال متل نے رسالہ ''تحریک'' اس وقت جاری کیا تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور ہندوستان کے تمام ادبی مراکز میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' نے مضبوطی کے ساتھ قدم جمار کھے تھے۔ عام طور پر ہر لکھنے والا خواہ وہ کمیونزم اور ترقی پسندی سے کتنا ہی نا آشنا ہو رجعتی اور قدامت پسند ہونے کے الزام سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو ترقی پسندوں میں شمار کرتا تھا۔ ''نقوش''، ''شاہراہ''، ''صبا'' اور فنون جیسے رسالے ترقی پسندی کے علمبردار تھے۔ اچھے لکھنے والے بھی رجعت پسندی کے الزام سے بچنے کے لیے تحریک میں لکھنے سے کتراتے رہے۔ ایسے پر آشوب دور میں گوپال متل کے رسالہ ''تحریک'' نے سینہ تان کر سب کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ 1960 کے آس پاس اچھے لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ''تحریک'' کے ساتھ ہو گیا۔

گوپال متل بہت اچھے تبصرہ نگار بھی تھے۔ وہ ''تحریک'' میں کتابوں پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے تبصروں میں صاف گوئی اور حقیقت نگاری سے کام لیتے رہے ہیں۔ وہ کتابوں پر اظہار خیال کے دوران کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے اور جو بات درست سمجھتے اسے دلائل کے ساتھ پیش کرتے۔ اس حوالے سے انھیں بڑے بڑے لوگوں سے ٹکر بھی لینی پڑتی تھی۔ وہ بڑے نام والے ادیبوں کو بھی نہیں بخشتے اور ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی ضرور کرتے۔ نذیر بنارسی کے شعری مجموعہ ''گنگ وجمن'' پر پروفیسر احتشام حسین نے تعارف لکھا تھا اور فراق گورکھپوری نے دیباچہ۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ ان دونوں شخصیات پر طنز کے تیر چلانا نہیں بھولتے۔ وہ کتاب پر تبصرہ کرتے وقت ان دونوں شخصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان شعروں میں اگر آپ کو وہ خوبیاں نظر نہ آئیں جو پروفیسر احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کو نظر آئی ہیں تو اسے اپنی ہی کوتاہی فہم اور بدذوقی پر محمول کیجیے گا کیونکہ پروفیسر احتشام حسین ساہتیہ اکیڈمی میں اردو کے نمائندے ہیں اور فراق بیک وقت عظیم شاعر اور عظیم نقاد ہیں''۔

گوپال متل کی خودنوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں انھوں نے لاہور کے شب و روز کی اپنی مصروفیات اور اپنے دوستوں اور ادیبوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ ایک شاعر بھی تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام ہیں: دوراہا (1944)، صحرا میں اذان (1970 اور 1979)، شرار نغمہ (1984) اور سچے پھول (1988)۔ ان

کے ان مجموعوں کو کلیات کی شکل میں 1994 میں ان کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔

ان کی دو نثری کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ایک کا ذکر پہلے آ چکا ہے یعنی ''لاہور کا جو ذکر کیا'' اور دوسری کتاب کا نام ہے ''ادب میں ترقی پسندی''۔ اس کے علاوہ انھوں نے کم و بیش پچاس چھوٹی بڑی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جن میں نوبیل انعام یافتہ الیگزنڈر سولنسٹین کا شہرۂ آفاق ناول ''کینسر وارڈ'' بھی شامل ہے۔ چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ناول ترجمہ کم اور اصل تحریر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی ترتیب دی ہیں جن میں ''شیرازہ'' (شاعری کا انتخاب) اور ''آزادی کا ادب'' وغیرہ شامل ہیں۔

◆◆◆

(مولانا) محمد عثمان فارقلیط

آزاد ہندوستان کی ابتدائی چند دہائیوں میں اردو کے جو ممتاز صحافی گزرے ہیں ان میں ایک اہم نام مولانا محمد عثمان فارقلیط کا بھی ہے۔ وہ کم وبیش ایک چوتھائی صدی تک جمعیۃ علماء ہند کے روزنامہ اخبار ''الجمعیۃ'' سے وابستہ رہے اور اپنے اداریوں اور شذرات سے پامال ملت اسلامیہ کو، جو کہ تقسیم ہند کے بعد ایک ہاری ہوئی فوج میں تبدیل ہو چکی تھی، ایک جرأت مند اور باحوصلہ فوج میں بدلنے کا گراں قدر فریضہ انجام دیتے رہے۔ آزادی کے بعد پست حوصلہ مسلمانوں میں زندگی کا نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے اور فسادات کے زخموں سے چور شکست خوردہ ملت اسلامیان ہند کو اٹھا کر کھڑا کرنے میں انھوں نے جو ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط کی پیدائش مئی 1897 میں یوں تو دہلی میں ہوئی تھی اور ان کی تقریباً پوری زندگی دہلی ہی میں گزری لیکن ان کا آبائی وطن اتر پردیش کا مردم خیز قصبہ پلکھوا تھا۔ ان کے والد حاجی محمد احمد کا تعلق وہیں سے تھا۔ یہ قصبہ پہلے میرٹھ ضلع میں آتا تھا اب غازی آباد ضلع میں ہے۔ ان کا انتقال 12 جون 1976 کو دہلی میں ان کے مکان پر ہوا۔ دہلی کی جامع مسجد میں ان کی نماز جنازہ مولانا عبید الرحمٰن رحمانی نے پڑھائی اس کے بعد ان کی خواہش کے مطابق ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی وطن پلکھوا لے جایا گیا اور وہاں ایک بار پھر نماز جنازہ ادا کی گئی اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

وہ دہلی کے چاندنی چوک کے کوچہ استاد داغ میں، جس کا نام آزادی سے پہلے کوچہ نچہ بنداں تھا، پیدا ہوئے تھے۔ اس کوچہ میں ایک نیم والا مکان تھا وہی دراصل مولانا کا مکان تھا۔

مولانا کے والد صنعت کار تھے اور چھوٹے موٹے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو ٹھیکیدار بنانا نہیں چاہتے تھے اسی لیے وہ ان کو ہمیشہ دل لگا کر پڑھنے کی تلقین اور نصیحت کیا کرتے تھے۔ مولانا فارقلیط کا ذوق بھی ٹھیکیداری سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ان کو دنیا میں بڑا کام کرنا تھا اور آزادی کے بعد پژمردہ مسلم قوم میں نیا جوش وولولہ پیدا کر کے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔ انھوں نے اپنے والد کی نصیحت پر عمل کیا اور بچپن سے ہی دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوئی۔ ابتدا سے ہی ان کا رجحان اسلامی تعلیم کی طرف تھا۔

وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی تو تھے ہی، ایک بہترین انسان بھی تھے۔ وہ ایک زبردست مناظر تھے اور ملت اسلامیہ کے ایک سچے اور مخلص خادم بھی تھے۔ وہ انتہائی کامیاب ایڈیٹر ہونے کے باوجود نام ونمود اور شہرت طلبی سے دور تھے اور ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنا کام کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ انتہائی غیر متعصب قسم کے انسان تھے اور اپنے مخالفوں کو جواب دیتے وقت بھی ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن جواب اتنے مدلل انداز میں دیتے تھے کہ مقابل لاجواب ہو جائے۔ ان کی اپنی یادداشتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ باضابطہ طور پر کسی مدرسہ سے ان کی فراغت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں مختلف مدارس میں متعدد عالموں سے ضرور انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اسی لیے کسی بھی موضوع پر ہونے والی بحث میں ان کو شکست دینا آسان نہیں تھا۔ انھوں نے بچپن میں پادریوں، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے اتنے مناظرے دیکھے تھے کہ وہ خود بھی ایک مناظر ہو گئے۔ اس سلسلے میں ان کا مطالعہ ان کے بڑا کام آیا۔ یہاں تک کہ ایک بار نوجوانی ہی میں انھوں نے قادیانیوں کو چیلنج کر دیا تھا اور جب وہ مقابلے پر آئے تو انھیں شکست فاش سے دوچار کر دیا۔

مولانا عثمان فارقلیط نے نصف صدی تک صحافت سے وابستہ رہ کر جس طرح پرورش لوح وقلم کی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کو ہمیشہ ملت اسلامیہ کی امانت سمجھا اور کبھی بھی اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ ان کا قلم ایک مقدس اور پاکیزہ نشتر تھا جس سے وہ مسلمانان ہند کے زخموں کا اندمال کرتے تھے اور ان پر اپنی شیریں بیانی کا پھایا رکھتے تھے۔ ان کی صحافت کا آغاز دراصل 1926 میں کراچی کے سندھی اخبار الوحید سے ہوا۔ اگرچہ وہ اخبار سے وابستہ تھے لیکن ان کا کام عربی اخبار سے مضامین کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا جسے کوئی شخص سندھی میں ترجمہ کر

دیتا اور وہ اخبار میں شائع کیا جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ بہ تقاضائے حالات ان کی سرگرمی دوسری طرف منتقل ہونے لگی۔ یعنی سلجوقی شیخوں کو مرتد ہونے سے بچانا۔ اس وقت شدھی سنگٹھن کے لوگ کافی سرگرم تھے اور وہ مسلمانوں کے شدھی کرن میں مصروف تھے، جس کے نتیجے میں سندھ کے سلجوقی شیخ بھی مرتد ہونے لگے تھے۔ ان کو ارتداد سے روکنے کے لیے مولانا فارقلیط کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ انھیں تار دے کر بلایا جاتا اور وہ اپنے علم کی بنیاد پر ان کو مرتد ہونے سے روکتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے وہاں بہت سے مناظرے بھی کیے اور مخالفین اسلام کو شکست فاش سے دوچار کیا۔

مولانا 1928 کے اوائل میں دہلی واپس آگئے اور اخبار ''الجمعیۃ'' سے وابستہ ہو گئے لیکن 1930 میں کراچی میں جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے اجلاس کی تیاریوں کے سلسلے میں پھر کراچی چلے گئے۔ وہ 1920 سے 1930 تک کراچی میں رہے۔ اسی درمیان جب وہ اخبار الجمعیۃ سے وابستہ ہوئے تو اس وقت اس کے ایڈیٹر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ مولانا فارقلیط ان کے معاون مدیر بن گئے۔ ان کا کام سہ روزہ کے لیے نوٹ لکھنا اور خبریں مرتب کرنا تھا۔ مولانا مودودی ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے اور بقول مولانا فارقلیط '' مولانا مودودی نے کئی بار کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے لکھنے کی اچھی مشق کی ہے۔ اسی طرح لکھتے رہو ایک روز تمھارے قلم کی شہرت ہوگی اور تمھاری تحریروں کو پسند کیا جائے گا اور مشق کروگے تو رنگ اور کھل جائے گا۔ میں نے ان سے ایک بار عرض کیا کہ میں 1918 سے مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار اہلحدیث میں آریوں اور عیسائیوں کے جوابات برابر لکھتا رہا ہوں اس لیے میری مشق خاصی پرانی ہے''۔
مولانا مودودی کے الجمعیۃ سے چلے جانے کے بعد انھیں چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا لیکن بہر حال کسی وجہ سے انھیں اس سے الگ ہو کر مدینہ بجنور جوائن کرنا پڑا۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے کہنے پر پھر الجمعیۃ سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن پلکھوا (اتر پردیش) چلے گئے۔ 1939 میں لاہور سے اخبار زمزم کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش آئی اور وہ لاہور چلے گئے۔ آزادی کے بعد جب اخبار الجمعیۃ دوبارہ شروع ہوا تو بقول سلیمان صابر ان کی توجہ دہانی پر مولانا حفظ الرحمٰن نے مولانا فارقلیط کو الجمعیۃ کے لیے لاہور سے بلا لیا اور پھر 1947 سے لے کر 1973 تک مولانا اسی سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں سلیمان صابر لکھتے ہیں '' مولانا نے 1947 کے آخر میں ایک مرتبہ پھر

ایسے وقت الجمعیۃ کی ادارت سنبھالی جب شاہجہاں کی بسائی دلی کی تہذیب اور دلی کی پرانی قدریں ہچکیاں لیتی نظر آرہی تھیں۔ قوم کی نیا کھینے کا دعویٰ کرنے والے بڑے ممتاز رہنما راہ فرار اختیار کر رہے تھے اور پوری ملت اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔ مولانا کو اپنا مفاد عزیز ہوتا تو واپس (پاکستان) جاسکتے تھے۔ تقریباً نو سال کی غیر حاضری کے بعد الجمعیۃ اس بار 24 دسمبر 1947 کو روزنامہ کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ مولانا نے اپنے پہلے ہی اداریہ میں اعلان کیا کہ وہ خوف ودہشت کے ماحول کو بدلنے میں اپنا رول ادا کریں گے۔ انھوں نے تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں پر چھائے ہوئے خوف ودہشت کو اسلامی نفسیات کا سب سے بڑا حادثہ قرار دیا اور اعلان کیا کہ الجمعیۃ کا اوّلین فریضہ ہوگا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہنی مزاج کو درست کرے اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کی تدابیر عمل میں لائے''۔

مولانا نے آخر دم تک اپنے قلم سے اس فریضے کو ادا کیا اور مسلمانوں کے اندر نہ صرف یہ کہ نیا جوش وولولہ پیدا کیا بلکہ ان کی سوچ کو بھی تعمیری رخ دیا۔ انھوں نے 18 جنوری 1948 کے شمارے میں دہلی کے مسلمانوں کے عنوان سے لکھا کہ ''...... دہلی کے مسلمانوں کا کام یہی نہیں ہے کہ وہ بھاگنے کی باتیں سوچتے رہیں اور یہاں سے تو جانا ہی پڑے گا کی رٹ لگائیں۔ اب ان کا فرض ہے کہ صبر سے کام لیں، دوسروں کو کام کرنے دیں اور نتائج کا انتظار کریں۔ آخر انھیں تھامنے اور سمجھانے کے لیے آسمان سے فرشتے تو نازل نہیں ہوں گے۔ وہ خود بھی اپنے قدموں پر کھڑے ہوں اور اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھیں۔ اگر وہ گرتے ہی رہے تو کوئی کب تک انھیں سنبھالے گا اور کس کو روز روز غرض پڑی ہے کہ مرن برت رکھ کر ان کا ہاتھ پکڑتا رہے گا۔ بس استقامت سے کام لو۔ اپنے آپ کو بے بس نہ سمجھو اور آگے بڑھ کر کچھ کر کے دکھاؤ اور مشکلات سے کہہ دو ہماری راہ سے ہٹ جائیں''۔ اسی طرح 28 دسمبر 1969 کے شمارے میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے عنوان سے انتہائی دلسوزی کے ساتھ اداریہ تحریر کیا۔

مولانا فارقلیط بہت حاضر جواب تھے اور اپنے جملوں سے مخالفین کو چپ کرا دیا کرتے تھے۔ جن دنوں وہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر رہے ان کی چشمک پرتاپ اخبار سے برابر چلتی رہی۔ پرتاپ کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن جو کہ مسلمانوں کو اپنی جارحانہ تحریروں کا نشانہ بناتے، مولانا کے حملوں کی تاب نہیں لا پاتے۔ لیکن اپنی فطرت کے مطابق وہ خاموش بھی نہیں بیٹھتے تھے۔ اخبار بین طبقہ جہاں ایک طرف الجمعیۃ کا مطالعہ کرتا تھا وہیں پرتاپ کو بھی پڑھتا تھا۔ عموماً ہوتا یہ کہ پرتاپ کے

حملوں کا جواب اگلے دن الجمعیۃ میں آجاتا۔ قارئین کو اس بات کا انتظار رہتا کہ آج مہاشہ کیا لکھیں گے اور کل مولانا ان کا کیا جواب دیں گے۔ اس وقت کے لوگوں کا کہنا ہے کہ مہاشہ اور مولانا کے اداریوں اور جوابی کارروائی یا ترکی بہ ترکی حملوں کی وجہ سے قارئین میں یہ دونوں پرچے کافی مقبول ہو گئے تھے اور ان کی سرکولیشن کافی بڑھ گئی تھی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ان کے مطابق ''ایک بار پرتاپ کے ایڈیٹر نے جس کی روزی ہی اللہ نے مسلم دشمنی میں مقدر کر دی تھی، یہ لکھا کہ مسلمان وطن دوست نہیں ہو سکتا، وہ مذہب کو وطن سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ مولانا فارقلیط نے اس کا جواب لکھا اور یہ بات بار بار لکھتے رہے کہ اگر مہاشہ وطن کو مذہب پر مقدم سمجھتے ہیں تو وہ پاکستان سے بھاگ کر کیوں آگئے انھیں وہیں رہنا تھا۔ اس کا مہاشہ جی کوئی جواب نہ دے سکے''۔

ایسے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن میں مولانا کی حاضر جوابی نے ایسا رنگ جمایا ہے کہ مخالفین چت ہو گئے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ لوگ ان کی تحریریں بڑی دلچسپی اور محبت سے پڑھا کرتے تھے بلکہ ان کا اثر بھی لیتے تھے اور بعد میں ان پر اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتے تھے اور خطوط لکھ کر مولانا کی ستائش کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کے عاشقوں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایسے بھی واقعات سننے میں آئے ہیں کہ بعض لوگوں نے ان سے عقیدت کی بنیاد پر اپنے نام کے ساتھ فارقلیط لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اخبار الجمعیۃ اور فارقلیط ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ دراصل آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو جن حالات کا سامنا تھا ان کا خاصا ادراک اخبار الجمعیۃ کو تھا اور اس کی وجہ مولانا فارقلیط کی فکر تھی۔ یہ اخبار تقریباً پورے ملک میں یا کم از کم شمالی ہند میں ہر جگہ پڑھا جاتا تھا اور بے حد مقبول تھا۔ کوئی دوسرا ایسا اخبار اس وقت موجود نہیں تھا جو کھل کر مسلمانوں کے بارے میں اس طرح لکھتا رہا ہو جیسا کہ مولانا کی ادارت میں الجمعیۃ لکھتا رہا ہے۔ انھوں نے کبھی آزاد ہندوستان کی حکومت کو بھی نہیں بخشا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مسائل پر حکومت کے خلاف لکھنے کی وجہ سے ان کو گرفتار بھی کیا گیا۔ جبکہ یہ اخبار جمعیۃ علماء کا تھا اور جمعیۃ کانگریس کے دوش بہ دوش تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فارقلیط کا قلم کیسا رہا ہوگا۔ وہ ملت اسلامیہ کے تعلق سے کوئی بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ کسی جماعت یا گروہ کے حاشیہ بردار نہیں تھے اگر تھے تو صرف ملت اسلامیہ کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی لوگ ان کا نام بہت عقیدت و احترام سے لیتے ہیں اور ان کی خدمات کو یاد کر کے

انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد اگر مولانا فارقلیط کا قلم مسلمانوں کو اخلاقی سہارا نہ دیتا تو مسلمانان ہند اتنی جلد اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو پاتے۔

یوں تو وہ زیادہ تر مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرتے رہے ہیں اور ان کے خلاف مختلف سطحوں پر ہونے والی ناانصافیوں کے معاملات کو اپنے قلم کے ذریعہ ایوان اقتدار تک پہنچاتے رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی فرقہ پرست قسم کے شخص تھے۔ وہ ایک بے حد سیکولر مزاج رکھتے تھے اور ایک طرف جہاں غیر مسلموں کے بعض حلقوں میں پائی جانے والی فرقہ پرستی کے مخالف تھے وہیں وہ مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو بھی ان کے حق میں بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان دونوں قسم کی فرقہ واریت پر اپنے قلم سے تیشہ چلاتے رہتے تھے اور ان کو اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ چونکہ وہ ایک سیکولر مزاج کے مالک تھے اس لیے قومی یگانگت کے بھی علمبردار تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی بات کی کبھی بھی ان کے مابین تفریق یا اختلاف کو ہوا نہیں دی۔ وہ صدق دل سے چاہتے تھے کہ اس ملک میں امن وامان رہے اور ملک ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ اس کے لیے ایک پر امن ماحول اور پرسکون فضا چاہیے۔ پر امن ماحول اور پرسکون فضا اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے یا رہ سکتی ہے جب ملک کے ان دونوں سب سے بڑے فرقوں کے مابین جنھیں اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کہا جاتا ہے، اتفاق واتحاد رہے۔ وہ ان دونوں فرقوں میں دوستی کے طرفدار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ملک فرقہ وارانہ فسادات کی بھٹی میں جلے اور انسانی لاشوں کی فصل کاٹی جائے۔ وہ فسادات کے خلاف کھل کر لکھتے رہے ہیں اور ان کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا کی وکالت بھی کرتے رہے ہیں۔ مولانا فارقلیط نے فسادات میں جہاں مسلمانوں کی مظلومیت کو بہ آواز بلند اٹھایا ہے وہیں اس پر بھی زور دیا ہے کہ فسادات دراصل انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی بے قصور اگر مارا جاتا ہے تو وہ انسانیت کا ہی نقصان ہے۔ انھوں نے اپنے متعدد اداریوں میں ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی پر زور دیا ہے اور کھل کر لکھا ہے کہ ان دونوں فرقوں کی دوستی اور اتحاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مولانا فارقلیط نے اپنے ایک اداریے میں مسلمانوں کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا مسئلہ ٹکراؤ سے نہیں میل جول سے حل ہوگا۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ ان کے حق میں کیا چیز بہتر ہے اور کیا بدتر۔ ''سوچنے اور سمجھنے کا وقت'' کے زیر عنوان 26 مئی 1950 کو لکھا گیا یہ اداریہ

پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اس وقت ضرورت ہے کہ بار بار مسلمانوں کو سمجھائیں کہ وہ اپنے دلوں کو تھامیں اور اپنے قدموں کو مضبوط کریں۔ وہ ایسی راہ اختیار کریں جو ان کے حق میں بھی مفید ہو اور حکومت کے حق میں بھی کارآمد ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی کچھ مشکلات ہیں مگر کوئی مشکل نہیں جس کا حل موجود نہ ہو اور کوئی انسان نہیں جسے مشکلات سے نجات نہ مل سکے...... ہمارے مسائل اس طریقہ سے حل ہوں گے کہ ہم یہاں اکثریت سے بدگمان نہ ہوں اور حکومت کی جمہوری اسپرٹ اور سیکولرزم کو ترقی کرنے اور نمو پانے کا موقع دیں اور اپنے حالات کے آپ خالق بنیں۔ کیونکہ خدا کسی کی کوشش اور نیک خواہش کو ضائع نہیں کرتا اور حالات کے بدلنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی''۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تقسیم ملک کے بعد ملک کے حالات ناگفتہ بہ تھے اور فسادات کا طویل سلسلہ جاری تھا۔ ایسے میں وہ مسلمانوں کو ایک طرف تلقین کرتے ہیں کہ وہ معاملات اور مسائل کو سمجھیں اور دوسری طرف ان کو یہ نصیحت بھی کر رہے ہیں کہ وہ ملک کی اکثریت کے ساتھ اتحاد و یکجہتی قائم کریں اور سیکولرزم کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیکولرزم ہی اس ملک میں انصاف کے قیام کا واحد اور طاقتور ذریعہ ہے۔ اگر یہ ملک سیکولر نہ ہوتا ہندو ملک بنا ہوتا یا کوئی اور نظام رائج ہوا ہوتا تو وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔ لہٰذا وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان سیکولرزم کی نشو ونما میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ کیونکہ اگر ان کی خواہشیں نیک اور جائز ہیں تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور پوری ہوں گی۔

مولانا فارقلیط آزادی کے بہت بعد بھی امن واتحاد اور فرقہ وارانہ یکجہتی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس بات پر زور دیتے رہے کہ اتحاد کے بغیر ملک ترقی نہیں کر سکتا اور اگر اتحاد نہیں ہوگا تو ملک میں سلامتی کی صورت حال خراب رہے گی۔ سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ اتحاد و یگانگت سے کام لیا جائے اور جو طاقتیں ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی کوشش کریں ان کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ انھیں اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ ملک کا ماحول خراب کر سکیں۔

''سلامتی کی راہ'' کے عنوان سے ایک اداریہ میں جو کہ 2 فروری 1972 کے الجمعیۃ میں شائع ہوا مولانا لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی بقا اور ترقی کے لیے امن، اتحاد اور یکجہتی کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہماری گاڑی دور تک نہیں چل سکتی۔

آزادی کے بعد ملک میں سنسکرت کو فروغ دینے کی کوششیں مختلف سطحوں پر کی جاتی رہی ہیں۔ حکومت بھی اس زبان کو پھیلانے اور اس کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن مصروف رہی ہے۔

اسی سلسلے میں 1972 میں دہلی میں عالمی سنسکرت کانفرنس منعقد کی گئی۔ ملک کے ایک معروف انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اس کانفرنس پر اداریہ لکھا اور بتایا کہ قدیم زمانہ میں سنسکرت کو عوام کی زبان ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایک خاص طبقہ تک محدود رہی۔ شودروں کو سنسکرت بولنے اور پڑھنے کی سخت ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر انھیں سزادی جاتی تھی۔ عورتوں کو سنسکرت میں بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی اور برہمنوں کے سوا اس زبان کا چلن ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ مولانا فارقلیط اس اداریے کے اقتباسات نقل کرنے کے بعد اپنا تبصرہ لکھتے ہیں جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کا مقصد پوشیدہ ہے۔ مولانا 14 اپریل 1972 کے الجمعیۃ کے اداریے میں ''خدمت اور رواداری'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں ''اب حکومت کی مہربانی سے سنسکرت کے لیے عالمی کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ پرانا تعصب ختم ہو رہا ہے اور ایک ایسی زبان پر توجہ دی جارہی ہے جس میں ہندو دھرم کے تمام ذخیرے محفوظ ہیں''۔ اس کے بعد وہ مسلم عالموں اور ادیبوں کی ان خدمات کو یاد کرتے ہیں جو سنسکرت سے وابستہ ہیں۔ ان کے مطابق ''مسلمانوں کی رواداری اور علم دوستی پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی حکمرانی کے دور میں جب کہ ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا گیتا اور اپنشد کے فارسی ترجمے کیے اور ہندو دھرم کی معلومات کو عام کیا۔ حکمرانی کے بعد بھی وہ غافل نہیں رہے اور گیتا کو اردو میں منظوم اور منثور شکل میں منتقل کیا۔ آج بھی گیتا کے 34 ترجمے دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ پھر بلگرامی خاندان میں سنسکرت کے بڑے بڑے عالم ہوئے۔ سید علی بلگرامی تو سنسکرت زبان کے ممتحن قرار پائے۔ قاری محمد بشیر الدین پنڈت کی سنسکرت دانی اور اس سلسلے میں ان کی تصنیفات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ غرض مسلمانوں نے کبھی سنسکرت زبان کے بارے میں تعصب سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس کی ایسی خدمت کی کہ نہ صرف سنسکرت کا لٹریچر دوسری زبانوں میں منتقل کیا بلکہ بیرونی دنیا میں ہندوستان کو متعارف ہونے کا موقع دیا۔ حیرت ہے کہ آج تک سنسکرت، عالم ویدوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں پیش نہ کرسکے...... سنسکرت کے کسی ہندو عالم نے قرآن کریم کو نہ سنسکرت میں منتقل کیا اور نہ عیسائیوں کی بائبل کو سنسکرت کا جامہ پہنایا۔ یہ خدمت بھی یکطرفہ ہوتی رہی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ہمیشہ علم دوست رہے ہیں اور انھوں نے ہر زبان کو اپنی زبان سمجھا۔ جب انھوں نے ہندی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تو عبدالرحیم خانخاناں اور امیر خسرو پیدا ہوئے اور ہندی شاعری میں سب سے آگے نکل گئے اور جب وہ سنسکرت کی طرف آئے تو ان کی مذہبی کتابوں کے فارسی

ترجمے کر ڈالے اور پھر اردو والے بھی پیچھے نہ رہے۔ افسوس کہ سنسکرت والوں نے آج بھی وسعت نظری پیدا نہ کی''۔

اتحاد اور یکجہتی کسی ایک خاص قسم کی نہیں ہوتی۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ انہی میں ایک شکل لسانی یکجہتی بھی ہے۔ اگر ایک زبان کے بولنے اور پڑھنے والے دوسری زبان کو بھی اہمیت دیں گے اور اس کے ادب کو اپنی زبان میں یا دنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل کریں گے تو یہ کام یقیناً لسانی یکجہتی کو فروغ دینے کا باعث بنے گا۔ لیکن اگر ہم لسانی تنگ نظری سے کام لیں گے اور دوسری زبانوں کے لٹریچر کو اپنی زبان میں یا دوسری زبانوں میں منتقل نہیں کریں گے تو اس سے زبان کی سطح پر تنگ نظری پیدا ہوگی اور اتحاد و یگانگت کا ایک گوشہ کمزور پڑ جائے گا۔ جس طرح مسلمانوں نے سنسکرت زبان کے ادب اور مذہبی سرمائے کو فارسی اور اردو میں منتقل کیا اگر سنسکرت کے عالم بھی ویسا کریں یا ویسا کرتے تو اس سے ایک اچھی فضا قائم ہوتی اور لسانی عصبیت کا خاتمہ ہوتا اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین اتحاد کی صورت پیدا ہوتی۔ مولانا فارقلیط نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد بین السطور میں یہی ہے کہ مختلف زبانوں کے عالموں کو دوسری زبانوں کا نہ صرف احترام کرنا چاہیے بلکہ ان کے ادب کو اپنی زبان میں منتقل بھی کرنا چاہیے۔ یقیناً یہ ایک نیک اور گراں قدر مشورہ ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس ملک میں لسانی سطح پر ایک ایسا اتحاد قائم ہوگا جو مثالی ہوگا اور جس سے دوسرے اختلافات بھی فرو ہو جائیں گے۔

اتحاد اور تنظیم کی ضرورت پر زور ڈالنے والا ایک اور اداریہ پڑھنے کے قابل ہے جو 4 جون 1960 کو لکھا گیا ہے۔ مولانا نے یہ اداریہ رکن پارلیمنٹ پرکاش ویر شاستری کی اس تقریر کے جواب میں لکھا ہے جو انھوں نے آریہ سماج حیدر آباد کے جلسے میں کی تھی اور جس میں انھوں نے مسلمانوں کو ''حکم'' دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں یا تو ٹھیک سے رہیں ورنہ پاکستان چلے جائیں۔ انھوں نے یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے ایجنٹ ہیں اور ان کے گھروں میں ٹرانسمیٹر ہیں جن کے ذریعہ وہ پاکستان کو خبریں مہیا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا فارقلیط نے لکھا کہ شاستری جی کی معلومات اس سلسلے میں ناقص ہیں ٹرانسمیٹر ہی نہیں ہر مسلمان کے گھر میں ایک راکٹ بھی بحفاظت رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے اداریے میں مزید لکھتے ہیں ''آج ہمیں ہندوستان کا اتحاد سب سے زیادہ عزیز ہے اور ہم اس جماعت کو سب سے زیادہ وطن دشمن سمجھتے ہیں جو ہمارے اتحاد کو تارپیڈو کرے اور یہاں کے لوگوں کو آپس میں لڑائے۔ اگر آج

ہندوستان متحد نہیں ہوسکا تو پھر کبھی متحد نہیں ہوگا۔ قدرت نے چینی جارحیت کی وجہ سے ہمارے لیے متحد اور منظم ہونے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ہمارا ملک ماضی میں متحد نہ ہوسکا، حال اور مستقبل میں بھی متحد ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ مگر اسے متحد کرنے کے لیے ایک بہترین موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اگر ہندوستان خود متحد نہیں ہوسکتا تو اسے چینی جارحیت کے پیش نظر متحد ہوجانا چاہیے...... ہندوستان کے باشندے آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں اور گھر کے اختلافات کو فراموش کردیں۔ زبان اور صوبوں کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیں، فرقہ پرستی کو خیرباد کہہ دیں۔ وطن کی حفاظت کے لیے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی یک جان و یک قالب بن جائیں اور سب مل کر مشترک دشمن کے مقابلے پر آجائیں''۔ اتحاد کا درس دینے والی ایسی تحریر وہی شخص لکھ سکتا ہے جو سیکولر ہو اور جس کو فرقہ پرستی اور بغض وعناد سے نفرت ہو۔ جو وطن کی حفاظت اور اس کے لیے اپنی جان تک دے دینے کا جذبہ رکھتا ہو۔ مولانا عثمان فارقلیط ایسے ہی ایک وطن دوست شہری تھے جو وطن پر آنے والی معمولی سی آنچ کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے اس ملک کے شہری ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیار و محبت سے رہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی سیسہ پلائی دیوار کا تاثر پیدا ہو۔ کیونکہ اگر ان میں اتحاد پیدا نہیں ہوا تو اس سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستان کا ہوگا اس کے باشندوں کا ہوگا۔ یہ اور ایسی جانے کتنی تحریریں ہیں جو اہل وطن کو محبت اور خلوص کا درس دیتی ہیں۔ ان کو اپنے دلوں سے نفرت و کدورت کو نکال دینے کی تحریک دیتی ہیں اور آپس میں مل جل کر رہنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ ایسی تحریریں مولانا فارقلیط جیسا صحافی ہی لکھ سکتا تھا جو اپنی پوری صحافتی زندگی میں اتحاد و یکجہتی کی ہی وکالت کرتا رہا ہے اور اتحاد کے مخالفین کو ہمیشہ اپنے قلم سے نشانہ بناتا رہا ہے۔ مولانا فارقلیط نے ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا اور ان لوگوں پر زوردار وار کیا جو ملک میں فرقہ واریت پھیلانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور جو اتحاد و یکجہتی کے دشمن ہیں۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط ایڈیٹر اور ان کے ساتھ حکیم عبدالجلیل صاحب پرنٹر پبلشر الجمعیۃ کے خلاف جو مقدمات چل رہے تھے ان میں سے تین میں چھ چھ ماہ کی سزا ماتحت عدالت سے ملی۔ مجسٹریٹ نے یہ حکم اگرچہ 25 جنوری دوپہر کو سنایا تھا لیکن اس کی نقل شام تک نہ مل سکی، جس کی وجہ سے درخواست ضمانت داخل نہ کی جاسکی۔ دوسرے روز یوم جمہوریہ (26 جنوری) کی تعطیل تھی۔ اس لیے دونوں حضرات کو تہاڑ جیل بھیج دیا گیا، اس پر پورا اردو پریس چیخ پڑا اور اس نے غم

وغصہ کا اظہار کیا۔ مدینہ بجنور نے اسے ''یوم جمہوریہ کا تحفہ'' قرار دیا اور لکھا کہ'' قومی زندگی میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب انسان کو اس قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے، حضرت مولانا کمزور و لاغر سہی لیکن بڑے پختہ عزم وارادہ کے مالک ہیں اور ایسا ہی پختہ کیریکٹر حکیم عبدالجلیل صاحب کا ہے۔ ہر دو اصحاب سے ہمیں یقین ہے کہ اپنے عزم وارادہ کی اس پختگی سے نامساعد حالات کو برداشت کر سکیں گے''۔ جمیل مہدی نے ندائے ملت میں لکھا کہ حکومت سے احتجاج کرنے کی عادت نہیں، اس احتجاج سے کوئی فائدہ بھی نہیں، ہمیں تو مولانا فارقلیط کی اوّلیت پر رشک آرہا ہے جو انھوں نے اس معاملہ میں حاصل کر لی ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے جس تندہی اور محنت کے ساتھ ''ندائے ملت'' کے خلاف تحقیقات اور سرگرمیوں کا مظاہرہ دیکھنے میں آرہا تھا اس کے پیش نظر تو ہمیں پوری امید تھی کہ مسلمانوں کی ملی خدمات اور تحفظ ودفاع کے جرم کی پاداش میں تعزیر وسزا کی عزت کے مستحق سب سے پہلے ہم ہی قرار پائیں گے، لیکن اس کا تو کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ عزت مولانا فارقلیط کے لیے مقدر کی جاچکی تھی۔ اسی طرح دیگر صحافیوں اور اخباروں نے بھی مولانا کی گرفتاری کی مذمت ومخالفت کی۔

◆◆◆

محمد عتیق صدیقی

اپنی صحافتی خدمات اور تصنیفات کے سبب پوری صحافتی دنیا میں مشہور عتیق صدیقی گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ ایک صحافی کے ساتھ ساتھ ایک ادیب بھی تھے۔ ان کی پیدائش اتر پردیش کے قصبہ ردولوی میں 11 نومبر 1910 کو ہوئی تھی۔ ان کا انتقال 7 فروری 1982 کو دہلی میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی البتہ کچھ تعلیمی سرگرمیاں بہار کے گیا میں بھی جاری رہیں۔ وہاں سے انھوں نے ہائی اسکول کیا تھا۔ گیا سے وہ لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں ان کی ملاقات رسالہ ''نگار'' کے ایڈیٹر علامہ نیاز فتح پوری سے ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی صحبت نے انھیں مضمون نگار بنا دیا تھا۔ وہاں انھوں نے درجنوں مضامین لکھے۔ نگار سے ان کی وابستگی برسوں تک قائم رہی اور وہیں ان کے اندر ادبی ذوق وشوق پروان چڑھا اور ان کے اندر تحقیق کا مزاج پیدا ہوا۔

عتیق صدیقی کو سیاست سے بھی گہرا شغف رہا اور وہ سیاسی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں۔ جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ کسی فوجی اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے عراق، شام اور مصر گئے جہاں سے انھوں نے رپورٹنگ کی۔ ان کو غیر ملکی اسفار کا بہت شوق تھا لہٰذا اپریل 1945 میں، جب وہ ہندوستانی فوج کے شعبۂ رابطہ عامہ میں تھے تو وہ صحافی اور ریڈیو پروگرامر کی حیثیت سے بغداد، تہران اور قاہرہ گئے۔ انھوں نے غیر ممالک میں ''وطن'' اور ''ہندوستان'' جیسے اخباروں کی ادارت کی۔ حیات اللہ انصاری نے جب اپنا اخبار ''سب ساتھ'' نکالا تو عتیق صدیقی نے اس میں بھی کام کیا۔ انھوں نے 1979 میں دہلی میں انجمن ترقی اردو میں ملازمت اختیار کی۔ انھیں انجمن کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور نے رسالہ ''ہماری زبان'' کے ادارتی عملہ میں شامل کیا تھا۔ اس سے قبل کچھ دنوں تک وہ غالباً 1969 میں غالب

اکیڈمی میں میں بھی ملازم رہے۔

عتیق صدیقی کا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف میں گزرتا تھا۔ ان کی پہلی کتاب 1957 میں منظر عام پر آئی اور اس پہلی کتاب نے ہی انھیں ایک مستند صحافی کی حیثیت سے مشہور کر دیا۔ اس کتاب کا نام تھا ''ہندوستانی صحافت کمپنی کے عہد میں''۔ اس کتاب کو جو کہ پانچ سو صفحات سے اوپر ہے، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے دسمبر 1975 میں شائع کیا تھا۔ اس موضوع پر وہ پہلی اور واحد کتاب تھی۔ ان کی دوسری کتاب ''صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' ہے جو کہ 1962 میں شائع ہوئی۔ ان کی ایک بہت مشہور کتاب ''اٹھارہ سو ستاون: اخبار اور دستاویزیں'' ہے جسے مکتبہ شاہراہ نے شائع کیا تھا۔ 447 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 1857 سے متعلق خبریں اور دستاویزیں جمع کر دی گئی ہیں جو سیکڑوں فائلوں کی ورق گردانی کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ ایک اور کتاب ''گلکرسٹ اور اس کا عہد'' ہے جو کہ 1969 میں لکھی گئی۔ ان کی دوسری کتابوں کی تفصیل آگے آئے گی۔

عتیق صدیقی ایک سیدھے سادے قلندرانہ مزاج والے شخص تھے۔ اپنے لباس اور اطوار کے معاملے میں وہ صوفی منش قسم کے آدمی تھے۔ لیکن ان کی علمیت اور قابلیت کی وجہ سے بہت بڑے بڑے لوگ ان کی قدر کرتے تھے اور ان کے گرویدہ تھے۔ ایسے لوگوں میں نیاز فتح پوری، فیض احمد فیض، رفیع احمد قدوائی، پروفیسر آل احمد سرور، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور حیات اللہ انصاری قابل ذکر ہیں۔ عتیق صدیقی کی اردو صحافت پر بہت گہری نظر تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ہندوستان سے شائع ہونے والے بے شمار اخبارات ورسائل کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ اگر چہ بہت وسیع نہیں تھا لیکن اس چھوٹے سے حلقے میں سروجنی نائیڈو، غلام محمد صادق اور میر قاسم جیسی شخصیات شامل تھیں۔

غالباً کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے ایما پر ایک ادارہ ''نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ڈیموکریٹک سوشلزم'' قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے لیے عتیق صدیقی نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب ''باپ کے خط بیٹی کے نام'' کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی ادارے سے پنڈت نہرو کی پہلی تصنیف 1929 میں ''سوویت روس'' کے نام سے چھپی تھی۔ غلام محمد صادق نے اس کا از سر نو اردو ترجمہ عتیق صدیقی سے کروایا تھا۔ ان کے کاموں میں ایک مجموعۂ مقالات ''آئینہ ابوالکلام آزاد'' بھی شامل ہے۔ اس کا پیش لفظ اس وقت کے صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد نے لکھا تھا۔ انھوں نے ہی

19 جنوری 1977 کو راشٹر پتی بھون میں اس کا اجرا کیا تھا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سید عبد اللہ، مولانا عبد الماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی اور ریاض الرحمٰن خاں شیروانی جیسی شخصیات کے بھی مضامین ہیں۔ اس میں خود مولانا آزاد کی دو تحریریں شامل ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب ''شیخ عبد اللہ کشمیر اور ہم'' ہے۔ اس کے علاوہ غالب اور ابوالکلام آزاد، بنگلہ دیش میں بارہ دن، یادوں کے سائے، اقبال جادوگر ہندی نژاد، بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، حسرت موہانی قید فرنگ میں، خان بابا (خان عبد الغفار خاں)، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، اور یجن آف ماڈرن ہندوستانی لٹریچر، شابا شیخ فرید، قدیم ہندوستان، ٹیپو سلطان اور نگارشات ہیں۔

محمد عتیق صدیقی اردو صحافت کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اردو صحافت کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے ان کی صحافتی تصنیفات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہوگا۔ لیکن ان کی علمی کاوشوں کو صحافت کے دائرے تک محدود کر دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ وہ صرف ایک صحافی ہی نہیں بلکہ ایک ادیب بھی تھے، ایک دانشور بھی تھے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور انھیں اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

صحافت پر عتیق صدیقی کی کم از کم چار معرکۃ الآرا کتابیں ہیں، جن کے نام ''ہندوستانی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں''، ''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات''، ''1857 کے اخبار اور دستاویزیں'' اور ''ہندوستانی صحافت'' ہیں۔ ان تصنیفات کا سنہ اشاعت علی الترتیب 1957، 1962، 1966 اور 2011 ہے۔ 1857 کے اخباروں اور دستاویزوں سے متعلق کتابوں کو ترتیب دینے میں مرحوم نے بے حد جاں فشانی سے کام لیا تھا۔ اسے مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں ''ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ کا یہ افسوسناک باب ہے کہ 1857 کے کسی فارسی یا اردو اخبار کی مکمل فائل شاید کہیں بھی محفوظ نہیں ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو اب تک کسی کو اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ورنہ ان کی مدد سے 1857 کی بغاوت کی پوری تاریخ مکمل کی جا سکتی تھی۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں دہلی کے تین اخبارات ''سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار اور صادق الاخبار'' کے جستہ جستہ 1857 کے شمارے منتشر حالت میں محفوظ ہیں۔ یہی حال دستاویزوں کا ہے جو ان گنت ہیں۔ پیش نظر مجموعہ نیشنل آرکائیوز کے ان ہی منتشر ذخیروں سے مرتب کیا گیا ہے، یہ مختلف بنڈلوں میں پھیلا پڑا ہے''۔ اس کتاب میں

انھوں نے ''پس منظر'' کے تحت 1857 کی جنگ سے قبل کے مختلف شہروں کے حالات اس زمانے کے اخبارات کی روشنی میں لکھے ہیں۔ اس کے بعد مذکورہ تینوں اخبارات کی خبروں کے تراشے ان کی اہمیت کے پیش نظر شامل کیے گئے ہیں اور آخر میں 1857 کی دستاویزات کی نقول اوران کی تفاصیل ہیں۔ 447 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس وقت کے حالات کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ برسبیل تذکرہ حال ہی میں انگریزی میں آئی ایک کتاب کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو اس زمانے کے اردو اور فارسی اخبارات کی خبروں کے ترجمے اور تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام BESIEGED:VOICES FROM DELHI-1857 ہے اور اسے پینگوئین نے شائع کیا ہے۔ 458 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مرتب و مترجم محمود فاروقی ہیں۔ انھوں نے خبروں کا تجزیہ کرتے وقت جزئیات پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے شکستہ اردو کے مواد کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے اخبارات کی کیا اہمیت ہوگی اور عتیق صدیقی کی مذکورہ کتاب کی کتنی معنویت ہوگی۔

عتیق صدیقی کی مذکورہ کتاب جہاں اردو اخبارات کے حوالے سے حقائق کا جائزہ لیتی ہے وہیں کمپنی کے عہد میں اخبار نویسی اور صوبہ شمالی و مغربی کے اخباروں اور مطبوعات پر بھر پور روشنی ڈالتی ہے۔ ''ہندوستانی صحافت'' بھی اپنے آپ میں ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ایک مضمون ''کمپنی کے عہد میں اردو اخباروں'' پر بھی ہے۔ اس کے علاوہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں اور بیسویں صدی میں ہندوستانی صحافت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ''ہندوستانی صحافت کے دو سو سال'' کے عنوان سے ایک بے حد معلوماتی مضمون بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ بغاوت کے دور کے اخبارات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

عتیق صدیقی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ہندی صحافت اردو صحافت کے چار سال بعد وجود میں آئی۔ وہ لکھتے ہیں '' کلکتہ سے 1780 میں ہندوستان کے پہلے دو اخباروں کا یکے بعد دیگرے اجرا ہوا تھا۔ پہلا اخبار جو اپنے مالک اور ایڈیٹر مسٹر ہکّی کے نام کی مناسبت سے ہکّیز گزٹ کے نام سے مشہور ہوا، اس کا دوسرا نام کلکتہ جرنل ایڈورٹائزر بھی تھا...... '' انھوں نے مسٹر ہکّی کو ہندوستانی اخبار نویسی کا باوا آدم بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں '' ہکّیز کے اجرا کے پورے نو ماہ بعد نومبر 1780 میں ہندوستان کا دوسرا اخبار انڈیا گزٹ کے نام سے کلکتہ ہی سے نمودار ہوا...... بعض تاریخی

شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپریل 1822 میں (اردو جام جہاں نما) اور (فارسی مرأۃ الاخبار) کا چند روز کے تفاوت سے ایک ساتھ اجرا ہوا...... ان دونوں کے اجرا کے چار سال بعد کلکتہ ہی سے دیوناگری رسم الخط کے پہلے اخبار کا بھی اجرا ہوا۔ اس کا نام ''اودنت مارتنڈ'' تھا۔ ایڈیٹر منو ٹھا کر اور مالک جگل کشور شکلا تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 31 مئی 1826 کو شائع ہوا''۔

عتیق صدیقی نے صرف ہندوستان ہی میں مختلف اخبارات کی ادارت نہیں سنبھالی بلکہ بغداد اور قاہرہ میں بھی صحافت کے فرائض انجام دیے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے عتیق صدیقی صرف صحافی ہی نہیں بلکہ ایک ادیب اور دانشور بھی تھے اور ان کی ادبی تصنیفات بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ 1969 میں شائع ان کی کتاب گلکرسٹ اور اس کا عہد خاصی مشہور اور مقبول ہوئی، جس میں انھوں نے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب ''اقبال جادوگر ہندی نژاد'' کو بھی کافی شہرت ملی۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ غالبیات، اقبالیات، حسرتیات، آزادیات، جوہریات وغیرہ کے بھی ماہر تھے۔ اس کے علاوہ انھیں تاریخ سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔ وہ سیاسی طور پر بھی کافی بیدار ذہن رکھتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی ان کی شمولیت تھی۔ ان کے سیاسی اور تاریخی مضامین اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کا قلم اور دماغ کسی ایک ہی سمت میں چلنے کو تیار نہیں تھے بلکہ وہ ہر فن مولا تھے اور جب اور جس موضوع پر لکھنے کی ضرورت ہوتی تھی ان کا قلم بے ساختہ اٹھ جاتا تھا۔ جہاں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی فہرست بہت طویل ہے وہیں ان کی تصنیفات و تالیفات کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔ دراصل انھوں نے بہت زیادہ غیر ملکی اسفار بھی کیے تھے اس لیے ان کا وژن بہت کشادہ تھا اور ان کی سوچ میں کافی گہرائی تھی۔ وہ کوئی بھی بات بغیر ثبوت کے نہیں لکھتے تھے اور محنت و مشقت سے ان کی بڑی گہری شناسائی تھی۔

عتیق صدیقی جامعہ نگر کے بٹلہ ہاؤس کی ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک ڈھائی کمرے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اپنا کمرہ، ڈرائنگ روم، اسٹڈی روم اور خواب گاہ بھی تھا۔ ایک طرف ایک تخت بچھا رہتا تھا جس پر گاؤ تکیہ ہوتا تھا اور سامنے کتابیں اور اخبارات الماری میں آراستہ ہوتیں۔ اسی معمولی سے مکان سے انھوں نے متعدد گراں قدر کتابیں لکھیں۔ انتہائی چھوٹے اور غیر کشادہ مکان میں رہنے والے عتیق صدیقی کا ذہن کافی کشادہ تھا جس کی وجہ سے بڑی بڑی شخصیات ان کی قدر کرتی تھیں۔ آزادی کی لڑائی میں شریک ہونے والے مگر خود کو مجاہدین آزادی

کی فہرست میں شامل نہ کروانے والے عتیق صدیقی ایک ایسا خواب دیکھتے رہے ہیں جس کی تعبیر یہ تھی کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کے حق سے محروم نہ رکھا جائے۔ ''ہندوستان کے صنعتی مزدور'' ان کا ایک ایسا مضمون ہے جو ان کی خواہشوں اور تمناؤں کا بیانیہ ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ان تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے کہ کیسے عہد قدیم سے ہی ہندوستانی مصنوعات یونان، مصر اور روم وغیرہ پہنچتی رہی ہیں۔ اس دوران ہندوستانی جہاز راں خلیج بنگال کے راستے سے چین اور جاپان اور خلیج فارس کے راستے سے عرب و ایران اور یوروپ میں اپنی تجارتی اشیا فروخت کرتے تھے۔

◆◆◆

محمد مسلم

اخبار دعوت کے ایڈیٹر محمد مسلم 20 ستمبر 1920 کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 3 جولائی 1968 کو پرانی دہلی میں کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں ہوا۔ تدفین مہندیان کے تاریخی قبرستان میں ہوئی۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جب کہ والدہ کا انتقال اس سے نو ماہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس وقت بڑے بھائی غیور حسن صاحب کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے نانا عبدالمتین صاحب ''متین'' نے کی، جو عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور سنسکرت کے ماہر اور سائنس و فلسفہ پر کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ عبدالمتین صاحب ریاست بھوپال میں تحصیلدار مقرر ہوئے بعد میں ترقی دے کر انھیں 'کامدار' بنایا گیا۔ عبدالمتین صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نکاح مستقیم الدین ابن قمرالدین ابن مفتی یقین الدین کے ساتھ ہوا۔ جن سے دو بیٹے محمد غیور حسن اور محمد مسلم پیدا ہوئے۔ جب کہ دوسری بیٹی کا نکاح محمد شفیع سے ہوا، جن سے محمد شکیل پیدا ہوئے۔

محمد مسلم صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا جان سے حاصل کی بعد میں مقامی اسکول میں داخل ہوئے۔ جہاں انھوں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد باضابطہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن گھر پر عربی، فارسی اور انگریزی کی درس و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور انھوں نے ان تینوں زبانوں پر دسترس حاصل کر لی۔ محمد مسلم کے اجداد ریواڑی (ہریانہ) کے رہنے والے تھے۔ (بتایا جاتا ہے کہ ریواڑی کے مفتی محلہ میں اس خاندان کا آبائی مکان اب بھی موجود ہے)۔ مسلم صاحب کا سلسلۂ نسب سالار مسعود غازی سے ملتا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی پاداش میں اس خاندان کے انیس (19) افراد کو پھانسی دی

گئی تھی۔

محمد مسلم صاحب نے 1938 میں اخبار ''ندیم'' میں اعزازی سب ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور کچھ ہی دنوں بعد خاکسار تحریک سے وابستہ ہو گئے اور آگے چل کر اس کے مغربی کمان کے کمانڈر مقرر ہو گئے۔ 1946 میں پہلی مرتبہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔ مہینوں تک مقدمہ چلا جس کی پیروی انھوں نے خود کی اور سرکاری وکیل کا ناطقہ بند کر دیا۔ عدالت نے انھیں باعزت بری کر دیا۔ 1947 میں ندیم اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔ 948 میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور چند مہینوں کے بعد رہا کر دیے گئے۔ 1950 میں تین ماہ کے لیے ایک بار پھر نظر بند کیے گئے۔

وہ 1952 میں بھوپال سے دہلی آئے۔ جماعت اسلامی ہند کے اولین امیر مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کی خواہش پر اکتوبر 1953 میں دعوت ہفت روزہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ جو اس وقت معروف صحافی اصغر علی عابدی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اصغر علی عابدی صاحب کی سبکدوشی کے بعد 1965 میں دعوت کے باضابطہ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس سے ایک برس قبل 1955 سے ہی دعوت سہ روزہ شائع ہونے لگا تھا۔ 1960 میں اس کا روزنامہ ایڈیشن بھی شروع ہوا جب کہ 1979 سے ٹیبلائڈ کی شکل میں دعوت ہفت روزہ بھی نکلنے لگا۔ 1980 کی دہائی کے اوائل میں دماغ کے ٹیومر کا آپریشن ناکام ہو جانے کے بعد گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر مسلم صاحب 1982 میں دعوت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کی سبکدوشی کے ساتھ ہی دعوت کا روزنامہ اور ہفت روزہ رنگین ایڈیشن بند ہو گیا۔ دعوت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان پر پانچ مقدمات حکومت نے دائر کیے۔ تین میں جرمانہ ہوا اور دو میں بری ہوئے۔ 1964 میں تیرہ دنوں تک تہاڑ جیل میں نظر بند کیے گئے۔ 1971 میں ہند و پاک کی جنگ کے دوران 42 دنوں تک جیل میں نظر بند کیے گئے جب کہ 1975 میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی اور انبالہ کی جیلوں میں 21 مہینے تک نظر بند رہے۔

سید محمود الحسینی نے اپنی کتاب 'شخصیات' (مطبوعہ: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال) میں محمد مسلم صاحب کی شخصیت کا عکسی خاکہ کچھ یوں کھینچا ہے۔ ''درمیانہ متوسط بدن، کھلا رنگ، چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے نشان، کشادہ پیشانی، کھڑی ناک، بڑا سر جس پر لاپروائی کے شکار بڑے بڑے بال، آنکھیں بڑی لیکن بار بار بھیگنے والی اور مستقل چمکنے والی، داڑھی چھوٹی مگر پورے

ناپ کی داڑھیوں پر بھاری، داڑھی کے منتشر بالوں کا احتجاج، چہرے کی متانت اور وقار کو بڑھانے والا۔ ایک شخص مصافحہ کی گرم جوشی سے یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ اس جسم کی رگوں میں خون کے ساتھ جذبۂ ایثار و خلوص دوڑ رہا ہے۔ ناگوار بات پر ہنس دینا اور جس کو خدمت کی ضرورت ہو اس کی بھی اور جس کو ضرورت نہ ہو اس کی بھی خدمت کرنا آپ کا خاص ذوق ہے''۔

بقول جی ڈی چندن مسلم صاحب Genius تھے۔ 'ندیم' کی ادارت سنبھالتے ہی ان کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے اداریے شہر میں گفتگو کا موضوع رہا کرتے تھے۔ ان کی تحریریں بڑی توجہ سے پڑھی جاتی تھیں اور میرے خیال میں کسی چھوٹے شہر سے شائع ہونے والا شاید ہی کوئی دوسرا اخبار ہوگا جسے 'ندیم' جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ چونکہ مسلم صاحب اپنے خیالات اور نظریات کو پوری بے باکی کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے اس لیے اکثر و بیشتر ارباب اقتدار کی بھویں تن جاتی تھیں۔ دراصل مسلم صاحب 'اینگری ینگ مین' کی طرح کام کرتے تھے۔ مسلم صاحب نے اردو صحافت کو ایک نئی سوچ اور نئی جہت بخشی۔ ان کی زبان بہت سادہ تھی۔ وہ منطقی دلائل کے ساتھ اپنی بات کہنے کے عادی تھے۔ انھوں نے جو اداریے تحریر کیے ہیں وہ صحافتی تکنیک کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں نہ تو سنسنی خیزی ہوتی تھی اور نہ ہی جذبات کو بھڑکانے والی کوئی بات۔ اپنی تحریروں کو خوبصورت بنانے کے لیے وہ اشعار کا بھی بھرپور استعمال کرتے تھے جو اردو صحافت میں ایک عام روش ہے۔ کوئی لمبا چوڑا پیراگراف لکھنے کے بجائے وہ صرف ایک یا دو شعر لکھ کر اپنی پوری بات قارئین تک پہنچا دیتے تھے۔

انھوں نے خود کو پوری ایمانداری کے ساتھ ہمیشہ ایک صحافی ہی سمجھا۔ وہ بلاشبہ اپنی تحریروں کو باوزن بنانے کے لیے اسلام کے بنیادی مآخذ سے استفادہ کرتے تھے لیکن انھوں نے اکثر و بیشتر دوسرے ذرائع کو بھی ترجیح دی۔ اس زمانے میں جب مسلم صاحب دعوت کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے، دعوت میں انسانی تصویروں کی اشاعت 'شجر ممنوعہ' تھی۔ لیکن ایمرجنسی کے دوران ہونے والی زیادتیوں کو جب اجاگر کرنے کا معاملہ آیا تو دعوت نے ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جس میں بہت ساری تصویریں بھی شامل ہیں۔ دراصل مسلم صاحب کسی لگے بندھے ڈھرے پر چلنے والے صحافی نہیں تھے۔ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ تصویروں کے ذریعہ زیادہ موثر انداز میں بات لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ مسلم صاحب نے اپنی تحریروں میں ایمرجنسی کی پرزور مخالفت کی تھی۔ جس کا خمیازہ بھی انھیں بھگتنا پڑا اور وہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک جیل میں

رہے۔

1947 میں باقاعدگی کے ساتھ ''ندیم'' اخبار کی ایڈیٹری کی ذمہ داری سنبھالی۔ اخبار میں جو لوگ کام کرتے تھے اخبار ان کی ملکیت میں آگیا تھا۔ مسلم صاحب بھی اخبار کے مالکوں میں ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد مسلم صاحب ندیم اخبار سے علیحدہ ہوگئے غالبًا 1948 میں نواب صاحب کے آخری دور میں گرفتار ہوئے لیکن چند مہینوں کے بعد رہا کردیے گئے۔ اخبار دعوت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پانچ مقدمات حکومت نے دائر کیے تین مقدموں میں جرمانہ ہوا اور دو میں بری ہوئے۔ انھوں نے صحافتی زندگی آزادانہ طور پر گزاری۔ ان کے اداریوں میں عوامی جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی ان کا قلم کبھی خوشامدی نہیں رہا ایک لفظ بھی خوشامد میں نہیں لکھا۔ ان کا قلم بڑا خوددار اور حق گو رہا۔ مقدمات سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے، بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ پیروی کی۔ 1964 میں ہندوستان میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر آئے تو تیرہ دن تہاڑ جیل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کیے گئے۔ 1971 میں ہندوستان و پاکستان کی جنگ میں 42 دن نظر بند کیے گئے، تیسری مرتبہ 1975 میں ایمرجنسی کے زمانہ میں نظر بند ہوئے۔ دہلی کی تہاڑ جیل اور انبالہ جیل میں 21 مہینے گزارے۔

مسلم صاحب مزاج کے اعتبار سے ضرور ایک صحافی تھے مگر طبیعت کے لحاظ سے صلح پسند اور عملی طور پر ایک محنتی کارکن تھے۔ ان تینوں پہلوؤں سے مل کر ان کی جو شخصیت تشکیل پائی تھی اس میں اردو کے صحافی کی حیثیت اور باعمل تحریک کار ہونے کی حیثیت میں ایک ایسا توازن پیدا ہوگیا تھا کہ ان کی تحریروں کو ان کی مقصدیت سے اور ان کی مقصدیت کو ان کی تحریروں سے علاحدہ کرکے دیکھا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے جو رقم کیا اسے پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ یعنی ان کی بیشتر تحریریں اپنی جگہ مکمل ہوا کرتی تھیں۔

مسلم صاحب کے دور ادارت میں ''دعوت'' نے خبروں اور تبصروں کے بارے میں معروضیت سے دست کشی کبھی اختیار نہیں کی اور صحافت کے اس زریں اصول پر اخبار ہمیشہ کاربند رہا کہ خبر مقدس اور اس کا تجزیہ امانت ہے، جس میں شعوری چھیڑ چھاڑ نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں تک اختلاف اور تنقید کا سوال ہے تو وہ ضرور ہونا چاہیے لیکن پوری شائستگی کے ساتھ۔ وہ نظریاتی تعصب و تنگ نظری کے خلاف تھے۔ انھوں نے اخبار کو نام و نمود کا وسیلہ کبھی نہیں بنایا۔ اس کے بجائے مضامین و مراسلوں کے ذریعہ مختلف نقطۂ نظر کے درمیان توازن قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش

کی۔

محمد مسلم کا ایک امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے صرف ملی مسائل کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر مدبرانہ رائے کا اظہار کیا۔ ان کی ایک عادت یہ تھی کہ اہم معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کر کے خاموش نہیں بیٹھ جاتے تھے بلکہ اس پر دیگر ممتاز صحافیوں، سیاستدانوں اور سماجی کارکنوں کو ہموار کرنے اور اپنی بات کو مؤثر طریقہ سے ارباب حکومت تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ ان کو ملت جتنی عزیز تھی اتنی ہی یہ فکر بھی رہتی کہ ملک کی خودمختاری، علاقائی سالمیت اور اس کی غیر جانبداری پر آنچ نہ آنے پائے۔ چنانچہ اپنے ہم عصر متعدد ممتاز صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں کے وہ برابر رابطہ میں رہتے۔

وہ ایک آفاقی سوچ کے حامل تھے۔ کسی بھی معاملے میں انسانی نقطۂ نظر سے سوچتے اور غیر جانبداری کے ساتھ تبصرہ و تجزیہ کرتے ہوئے حق و انصاف کا ساتھ دیتے۔ جو صحافی مذہبی، مسلکی، گروہی، لسانی اور دیگر تعصبات کا شکار نہیں ہوگا وہ انہی خصوصیات کا حامل ہوگا۔ اسی لیے مولانا مسلم کا قلم کسی ایک فرقہ یا طبقہ کا نمائندہ نہیں تھا بلکہ پورے عالم انسانیت کا نمائندہ تھا۔ وہ صحافت میں اسلامی اصولوں کو برت کر صحافت کو ایک بلند مقام تک پہنچانے کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی زور دیتے رہے ہیں کہ صحافت کے ذریعے اسلام کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ 1981 میں حیدرآباد میں جماعت اسلامی ہند کا ایک کل ہند اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں ایک ''اسلامی صحافتی کمیٹی'' بھی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے لیے مولانا محمد مسلم نے اصولوں کا ایک چارٹر مرتب کیا تھا جس میں مختلف نکات بیان کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ سوال بنیادی اہمیت کا ہے کہ صحافت کو اسلام کے فروغ کے لیے کیسے استعمال کیا جائے، اسلامی فکر کو عام کرنے میں وہ کیا کردار ادا کرے اور یہ بھی کہ صحافت مسلمانوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے مکمل وابستگی کو کس طرح مستحکم کرے؟ زبانیں مختلف ہوسکتی ہیں، انداز جداگانہ ہوسکتے ہیں اور طرزِ تحریر بھی علیحدہ ہوسکتی ہے۔ لیکن جہاں تک فکر و نظر کا سوال ہے وہ اگر واضح ہے اور اس کے نتیجہ میں اخذ کیے گئے مقاصد بھی سامنے ہیں تو منزل کے حصول کا انحصار موزوں اور مناسب حکمت عملی پر مبنی ہوگا۔ انھوں نے اس بات پر اظہار تشویش کیا تھا کہ مسلمانوں کے 95 فیصد اخبارات اسلام اور مسلمانوں کی خدمات کے دعوے کے ساتھ آگے بڑھے تھے لیکن وہ سب اپنی راہ سے بھٹک گئے۔ انھوں نے اٹھارہ نکات پر مشتمل جو چارٹر تیار کیا تھا اس پر اگر عمل کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ صحافت

کے ذریعے اسلام کی خدمت ہوسکتی ہے بلکہ سچائی یہ ہے کہ اس سے ملک میں معیاری صحافت کو عروج حاصل ہوسکتا ہے اور صحافیوں کے وقار اور اعتبار میں بے پناہ اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔

مولانا محمد مسلم اہم معاملات میں صرف ایک آفاقی نظریہ ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ بین الاقوامی امور پر تبصروں میں ان کا یہ نظریہ پوری طرح آشکارا بھی ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک اداریے میں اقوام متحدہ کے اجلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں" ذرا بین الاقوامی سطح پر سوچ یے تو اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت سب قوموں کی مساوات کا اصول مسلمہ ہے لیکن بہر حال بڑے بڑے ہیں اور چھوٹے چھوٹے، ہاتھی اور گلہری کو اگر مساوات کا درجہ عطا کر دیا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہاتھی ہاتھی ہے اور گلہری گلہری ہے۔ اور ہاتھی جانتا ہے کہ وہ ہاتھی ہے اور بے چاری گلہری بھی اچھی طرح آگاہ ہوتی ہے کہ وہ محض گلہری ہے۔ اس کے باوجود اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں گلہری اور اس کی برادری کے دوسرے افراد ہاتھی کو للکار سکتے ہیں۔ چنانچہ جنرل اسمبلی میں جو قراردادیں منظور ہوتی ہیں ان کے کیا کہنے؟ یہ قراردادیں الفاظ کے خالی خولی مجموعے ہی ہوتے ہیں اور ہوتا وہی ہے جو ہاتھی چاہتے ہیں"۔

مسلم کا قلم بہت بے باک تھا اور کسی بھی معاملے پر نہ تو خوف وہراس میں مبتلا ہوتا تھا اور نہ ہی کسی بات کے اظہار میں کسی جھجک کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مولانا مسلم جو بات صحیح سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ان کو یہ خوف نہیں ہوتا تھا کہ ان کی بات سے کسی کی پیشانی شکن آلود ہو جائے گی یا وہ بات کسی کو ناگوار گزرے گی۔ اردو زبان کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ آزادی کے بعد یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں" اس وقت مرکز میں اندرا کانگریس کی حکومت قائم ہے اور وہ اس موقف میں ہے کہ دفعہ 347 کے تحت صدر جمہوریہ سے ہدایت جاری کرا کے اپنے انتخابی وعدے کو عملی جامہ پہنا دے لیکن اس کے طرز عمل سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں نہ صرف یہ کہ مخلص نہیں ہے بلکہ وہ اردو کے مسئلہ کا سیاسی استحصال بھی کرنا چاہتی ہے۔ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ پہلے ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیاب بناؤ پھر ہم اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنائیں گے اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیابی حاصل ہوگئی تو یہ کہا جائے گا کہ ہمیں میونسپلٹیوں اور پنچایتوں میں اکثریت دلوائی جائے گی تب ہی ہم اپنے وعدے پورے کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر کوئی نیا عذر پیش کر دیا جائے گا۔ اردو کے ساتھ یہ بے رحمانہ سلوک کوئی نئی بات نہیں ہے، کانگریس شروع ہی سے

اس پالیسی پر عمل کرتی رہی ہے کہ ایک طرف تو اردو کی تعریف وتوصیف کے ذریعہ اردو بولنے والوں کو خوش رکھا جائے، دوسری طرف عملاً اس کی بیخ کنی کی جائے''۔ حالانکہ دعوت اخبار کو سیاسی حلقوں میں بھی بڑی توجہ سے پڑھا جاتا تھا اور نہ صرف اس کی سطور سے مطلب نکالا جاتا تھا بلکہ بین السطور سے بھی مطالب نکالنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود مولانا مسلم اپنی بات کہنے میں کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔

محمد مسلم کی تحریروں کی ایک بہت خاص خوبی یہ تھی کہ وہ قارئین کے دلوں کے بے حد قریب ہوتی تھیں اور ان کو پڑھنے والے ایسا محسوس کرتے تھے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ خود کو ان تحریروں سے بالکل ہم آہنگ کر لیتے تھے۔ ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک صحافی خود کو عوام کا نمائندہ سمجھے اور اس بات کو محسوس کرے کہ وہ بھی انہی کروڑوں لوگوں کے ہجوم کا ایک حصہ ہے جنھیں پر تعیش زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملتا اور سچ بات یہ ہے کہ ایک صحافی کو عوام کے اسی طبقے کا نمائندہ ہونا چاہیے نہ کہ ان چند لوگوں کا نمائندہ جو اپنی شرائط پر عوام کی بہت بڑی اکثریت کو زندہ رکھنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا مسلم عوام کے اسی طبقے کے نمائندہ تھے اور ان کے مسائل کو اٹھاتے بھی تھے اور ان کے حل کے طریقے بھی بجھاتے تھے۔

دراصل مدیر دعوت انسانیت کے نمائندہ تھے اور انسانی اقدار میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے بے شمار مسائل پر اپنے نظریات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔ خواہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہو یا بے روزگاری کا۔ تعلیم کا مسئلہ ہو یا ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کا۔ انھوں نے کسی بھی مسئلے کو صرف مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے اپنی متعدد تحریروں میں فرقہ وارانہ یکجہتی پر زور دیا ہے اور اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہوتا کہ ملک میں امن وامان قائم کیا جا سکے۔

وہ جب فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف خامہ فرسائی کرتے تھے تو صرف یہ نہیں دیکھتے تھے کہ فسادات میں مسلمانوں کا ہی نقصان ہوا ہے بلکہ وہ فسادات کو انسانیت کا ایک بڑا خسارہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے ایک اداریہ ''کرنے کے کام'' میں لکھتے ہیں ''وزیر اعظم نے سری نگر میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات پر جو کچھ کہا ہے کہ یہ فساد ایک دو جگہوں پر ہوا یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ مراد آباد کا فساد تو بہت بڑا تھا اگر اس ملک کے ایک فرد کو بھی ظلم کا شکار ہونا پڑے تو وزیر اعظم بھی اس کے لیے ذمہ دار ہیں تاہم یہ اپنا اپنا تصور ہے۔ سرکاری رہائش گاہوں میں رہتے

رہتے ان لوگوں کو کیا پتہ کہ غریبوں پر کیا گزرتی ہے۔ گاندھی جی عوام میں رہتے تھے تو ان کو معلوم ہوتا تھا کہ غریب عوام پر کیا گزرتی ہے''۔ اس اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مسلم نے صرف مسلمانوں کی بات نہیں کی بلکہ انسانوں کی بات اٹھائی ہے۔ انھوں نے غریبوں کی بات کی ہے اور فسادات کے لیے حکومت کے ذمہ داروں کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ یہ بات درست بھی ہے کہ اگر ملک میں فسادات ہورہے ہوں یا کسی طبقے پر ظلم ہورہا ہو تو اس کی براہ راست ذمہ داری ارباب حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

آزادی کے فوراً بعد ایک کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی گئی تھی۔ ''ریلیجس لیڈر'' نام کی اس کتاب کا دیباچہ مسٹر کے ایم منشی نے لکھا تھا۔ اس پر ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں فطری طور پر ایک بے چینی پیدا ہوئی تھی اور اس بے چینی نے تشدد کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی خواہش تھی کہ ایک تحقیقی کتاب کا جواب تحقیقی انداز میں دیا جائے تاکہ مضمون لکھنے والے نے اگر غلط فہمی کی بنا پر وہ مضمون لکھا ہے تو وہ غلط فہمی دور ہوسکے اور اگر اس میں اس کی بدنیتی شامل ہے تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آسکے۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد مسلم لکھتے ہیں'' اب سے بہت پہلے کی بات ہے ایک مستشرق نے اسلام کے سلسلے میں بے سروپا الزامات لگائے تھے اور ان ہی الزامات کو برطانوی انسائیکلوپیڈیا نے بھی قبول کرلیا تھا۔ سرسید احمد خاں مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے مغربی عوام کے ذہن کو سدھارنے کے لیے لندن کا سفر کیا اور سیرت و مذہب پر مضامین لکھے۔ خود انسائیکلوپیڈیا کے ذمہ داروں کو خط لکھا اور انھوں نے بھی آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کا اعلان کیا۔ جواہر لعل بھی اسی ماحول میں پڑھے اور بڑھے تھے اس لیے وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ کوئی تحقیق اگر غلط ہے تو اسے دلائل کے ساتھ رد کیا جائے۔ جذبات واحساسات کس میں نہیں ہیں اور اگر کوئی دل اس سے عاری ہو تو وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ البتہ سوال یہ ہے کہ جن عوام تک ایسی کوئی غلط بات پہنچی ہے ان کی غلط فہمیوں کو کیسے دور کیا جائے۔ امریکہ کے سماج میں کتابیں شائع کرنے کا ایک خاص رواج ہے۔ ایک نے اگر دوسروں کے بارے میں غلط کتاب لکھ دی تو چند دن کے بعد ہی اس کی تردید میں دوسری کتاب شائع ہوجاتی ہے اور وہ بھی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے''۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں'' اس طرح علمی و تحقیقی امور کا معاملہ صرف اصحاب مطالعہ تک محدود رہتا ہے تاہم اس کے بعد بھی کوئی اپنی غلطی پر مصر ہو تو اس کے خلاف تحریک چلائی جانا ضروری ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کی باگ ڈور بھی اہل علم

کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارے عوام میں بلاشبہ حمیت دینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن اس کے اظہار کے طریقے میں سنجیدگی اور متانت کے بجائے ایسے مظاہرے ہونے لگیں جن سے خود ہمارے دینی مقام کو ٹھیس لگے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی"۔ قابل ذکر ہے کہ آج بھی تقریباً یہی صورت حال ہے اور مسلمان اپنی دینی حمیت وغیرت کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ہی دینی وقار کو ٹھیس لگ رہی ہے۔

انھوں نے اخبار دعوت میں جہاں مختلف موضوعات پر اداریے قلم بند کیے ہیں وہیں وہ مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کیا تھا جس میں کسی پرانے واقعہ کا ذکر ہوتا اور اس کے حوالے سے وہ بیتی ہوئی باتوں کو تازہ کرتے اور یادوں کے چراغ روشن کرتے۔ اس سلسلے وار کالم کے تحت انھوں نے بہت سے سبق آموز واقعات بیان کیے ہیں۔ ایک واقعہ خود ان کا اپنا ہے۔ انھوں نے ایک بے روزگار شخص کو لکڑی کاٹنے کا مشورہ دیا۔ اس شخص نے کہا کہ کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔ یہ بات مولانا مسلم کے دل کو لگ گئی۔ اچانک ایک روز انھوں نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور جنگل کی راہ لی۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹیں اور انھیں فروخت کر کے اس سے ملنے والی رقم مذکورہ شخص کے حوالے کر دی۔ ایک مضمون میں انھوں نے آگرہ کے ایک مکتب کے مدرس کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس مدرس کی خاکساری وانکساری اور خدا ترسی کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ کاش آج بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں۔ انھوں نے "خبر ونظر" کے نام سے ایک سلسلے وار کالم شروع کیا تھا۔ وہ بھی بے حد مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے بعد جو بھی دعوت کا ایڈیٹر ہوا اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ آج بھی خبر ونظر کا کالم پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ان کی صحافت کی اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جن پر کھل کر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے اور ان کی تحریروں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ ان کے اداریے آج کے صحافیوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اگر وہ ان کا مطالعہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنے صحافتی نظریات طے کریں تو موجودہ صحافت کو بہت سی برائیوں سے بچایا جا سکتا ہے اور صحافت کے وقار اور اعتبار میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "کچھ یادیں کچھ باتیں" مستقل کالم کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس عنوان کے تحت وہ ماضی کے جھروکے میں جھانک کر دیکھتے تھے اور اس عہد کی پوری تصویر قارئین کے سامنے لا رکھتے تھے۔

سابق مرکزی وزیر اور بعد میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے والے اندر کمار گجرال

محمد مسلم کوذاتی طور پر بے حد پسند کرتے تھے۔ایک بار جماعت اسلامی کے جنرل سکریٹری جناب افضل حسین نے اندر کمار گجرال اور محمد مسلم کے تعلق سے ایک واقعہ لوگوں کو بتایا جس کے مطابق جس محکمہ کے اندر کمار گجرال صاحب وزیر تھے، اس محکمہ کے ایک غلط فیصلے سے عوام کو بیحد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔محمد مسلم صاحب نے اندر کمار گجرال صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اس فیصلے کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے آخر میں یہ لکھا کہ'' گجرال صاحب...... یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ہر انسان کو اپنے رب سے ملنا ہے اتنے سارے لوگوں کا بوجھ آپ وہاں کیسے اٹھا پائیں گے، جبکہ وہاں آپ کی مدد کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا''۔اندر کمار گجرال صاحب نے خط کے جواب میں محمد مسلم صاحب کو لکھا کہ'' میں نے آپ کا خط پڑھا، بیوی بچوں کو سنایا، میری بیوی خط سن کر لرزنے لگی اور پھر زرد پڑ گئی۔آپ کی دل کو چھو لینے والی بات نے ہم لوگوں کو کافی متاثر کیا۔آپ نے جن خامیوں کی طرف نشاندہی کی ہے، میں اس پر ازسرِنو غور کروں گا''۔

آپ کی تحریر نے لوگوں کے دلوں پر کتنا اثر چھوڑا، اس کا اندازہ اردو بلٹز کی تحریروں سے بخوبی کر سکتے ہیں۔ 12 جولائی 1986 کے شمارہ میں ادارہ کی طرف سے مسلم صاحب کے انتقال کے تعلق سے اردو بلٹز میں'' زمیں کھا گئی......'' کے عنوان سے خبر چھاپی تھی اور لکھا تھا'' ......مولانا محمد مسلم ایڈیٹر دعوت کا انتقال اردو صحافت کے لیے نا قابل تلافی نقصان ہے، مرحوم کے قلم نے ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی اور حق ادا کیا۔دعوت کے اداریوں نے خصوصاً اردو دنیا میں اپنی شناخت بنالی تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ اداریہ نویس یا ایڈیٹر کی ہر بات سے اتفاق کیا جائے اور یہی معاملہ مولانا محمد مسلم صاحب کے ساتھ بھی تھا۔لیکن پھر بھی انھوں نے جن مسائل پر قلم اٹھایا اس موضوع کے ہر پہلو کا مکمل جائزہ لیا۔اگرچہ ان کی تحریروں میں ان کے فکر وعقیدہ کی بڑی پکی اور مضبوط گانٹھ تھی، تاہم انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے جو لکھا اپنے فکر وعقیدہ کا سودا کیے بغیر لکھا، اور جس نے پڑھا وہ اس سے متفق ہو یا نہ ہو لیکن اس کو اس بات سے اتفاق کرنا ہی پڑا کہ مولانا کی رائے بھی ایک رائے ہے اور اس رائے کو مسترد نہیں کیا جا سکتا''۔

◆◆◆

محفوظ الرحمٰن

محفوظ الرحمٰن 4 جنوری 1938 کو موضع نو ناری، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور 6 فروری 2010 کو دہلی میں واقع رہائش گاہ پر ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تدفین دہلی گیٹ کے قبرستان میں ہوئی۔

آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا، اس کے بعد آپ کا صحافتی سفر شروع ہوا۔ آپ کے اظہار خیال کی زبان اردو، ہندی اور انگریزی تھی۔ وہ 44 برسوں تک صحافت کے خاردار جنگل میں اپنے اصولوں کی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے سرگرم سفر رہے۔ زمانہ سازی کے فن سے نا آشنا اور کسی بھی قیمت پر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کے عزم پر قائم رہنے کے سبب وہ منزل ان سے ہمیشہ دور رہی جسے اہل خرد ''منزل مراد'' کا نام دیتے ہیں۔ انھیں قلم کی حرمت اور فکر ونظر کی آزادی ہمیشہ عزیز رہی۔ روز نامہ ''قائد'' (لکھنؤ) اور اخبار ''دعوت'' دہلی کے چیف ایڈیٹر رہے۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان جدید کی اداراتی ذمہ داری سنبھالی۔ آخر الذکر دونوں پرچے انھوں نے خود شروع کیے تھے۔ وہ چار سال کے لیے آل انڈیا مجلس مشاورت کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں دو سال پولینڈ کے سفارت خانے میں ہندی مترجم کی ذمہ داری سنبھالی اور 1977 میں تقریباً تین سال تک سوویت انفارمیشن سینٹر کے اردو جریدہ سوویت جائزہ سے وابستہ رہے۔

یونیورسٹی سے فراغت کے بعد سے آخر وقت تک لکھنے لکھانے کا کام جاری رہا۔ وہ انتہائی نامساعد، حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات کے باوجود ملک وملت سے وفاداری پر قائم رہے۔ انھوں نے ملک کے ارباب سیاست وقیادت کے علاوہ عالم اسلام کی متعدد اہم شخصیتوں کے انٹرویوز

لیے جن میں سب سے اہم اخوان المسلمین کے سربراہ ڈاکٹر عمر تلمسانی کی تھی۔ ان کے علاوہ اس فہرست میں ڈاکٹر حسن ترابی، ڈاکٹر فیض المہدی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، ڈاکٹر سالم عزام سکریٹری جنرل اسلامی کونسل آف یورپ، پروفیسر عبدالرب سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، جنرل ضیاء الحق، فواد صادق مفتی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ذوالفقار اللہ، مولانا ابواللیث، چودھری چرن سنگھ، وی پی سنگھ، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ انٹرویو قائد، دعوت، جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان وغیرہ کے علاوہ ملک کے دوسرے بہت سے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے تھے۔

آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں جن میں فیصل اعظم: حیات اور کارنامے، سرخ یلغار، کویت پر عراق کا قبضہ غاصبانہ: حقائق اور مضمرات، کسان کا بیٹا سب کا دوست، معاہدہ عمرانی، بھٹو: دوست یا دشمن اور جدید سیاسی اصلاحات قابل ذکر ہیں۔

محفوظ الرحمٰن اردو صحافیوں کی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ اب رفتہ رفتہ اٹھتی جارہی ہے۔ ان کو صحافتی قدریں عزیز ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ان پر اپنی جان بھی چھڑکتے تھے۔ اس مزاج کے صحافی اپنے پیچھے ایک پوری نسل چھوڑ جاتے ہیں اور بلاشبہ محفوظ الرحمٰن نے بھی ایک ایسی نسل چھوڑی ہے جو ان کی قلمی پرورش کے زیر سایہ جوان ہوئی ہے اور توقع ہے کہ یہ ان کے نظریات اور ان کی ملی فکر کو پروان چڑھائے گی اور اس طرح انھیں خراج عقیدت پیش کرتی رہے گی۔

محفوظ الرحمٰن میں جو صحافتی خوبیاں تھیں وہ بہت کم لوگوں میں ملتی ہیں اور آج کے مادّہ پرست دور میں تو ویسے صحافی خال خال ہی ہیں۔ انتہائی خوددار اور غیرت مند، قلم کی آبرو کے ایسے محافظ کہ خود پر آنچ آجائے مگر قلم کی حرمت پر حرف نہ آنے پائے۔ راقم نے ان سے ذاتی تعلق کے پورے عرصے میں، جو کہ کم وبیش 23 سالوں پر محیط ہے، ان کی ایک بھی ایسی تحریر نہیں دیکھی جس میں انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیا ہو، اپنی خودداری کا سودا کیا ہو یا قلم کی حرمت کو پامال کیا ہو۔ جس بات کو سچ سمجھتے تھے اسے ڈنکے کی چوٹ پر لکھتے تھے۔ خواہ کوئی ناراض ہو یا خوش اور جس بات کو غلط سمجھتے تھے اسے قطعاً تسلیم نہیں کرتے تھے اور اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے اغیار کی پیشانیوں پر تو بل پڑ ہی جاتے بعض اوقات اپنے بھی خفا سے ہوجاتے تھے۔ لیکن ان کی حق گوئی، صحافتی دیانت داری اور جرأت مندی وبے باکی میں ذرا بھی لغزش نہیں آتی تھی۔ اسی لیے ان کے مخالفین بھی ان کے نظریات سے اتفاق نہ رکھنے کے

باوجود ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے ادا کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

ان کی شخصیت کی ایک عجیب دھاک تھی، ایک عجیب دبدبہ تھا اور اس میں ایک عجیب سی کشش بھی تھی۔ جس نے ایک بار ملاقات کرلی زندگی بھر کے لیے ان کا گرویدہ ہوگیا۔ یہ ان کی شخصیت اور ان کے قلم کی جادوگری ہی تھی کہ ان کے آستانے پر اپنے بھی حاضری دیتے تھے اور غیر بھی، دوست احباب بھی اور مخالفین بھی۔ ان کے ارادت مندوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے ان کا نظریاتی اختلاف رہا کرتا تھا۔ ان کے حلقۂ یاراں میں ہر مکتب فکر اور ہر طبقۂ خیال کے لوگ موجود تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سب ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے ارادت مندوں میں ہندی اور انگریزی صحافیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ متعصب اور تنگ نظر علما کے سخت خلاف تھے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایسے علما کی بھی خاصی تعداد ان کی معتقد تھی جو ان کی دلچسپ اور تعمیری تنقید کو نہ صرف صبر و شکر کے ساتھ سنتی تھی بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔

بقول اظہر ندوی محفوظ الرحمٰن مرحوم کی شخصیت میں ایک خاص جاذبیت و دلنوازی تھی، جہاں بھی ہوتے بہت جلد گھل مل جاتے اور مقبولیت بھی حاصل کر لیتے، اپنی نرم گفتاری، کشادہ روئی اور خوش اخلاقی سے وہ مشرقی تہذیب کے نمائندہ معلوم ہوتے تھے۔ چالیس برس سے زیادہ عرصہ تک ان سے تعلقات رہے لیکن میں نے انھیں کبھی غصے میں یا رکیک زبان استعمال کرتے نہیں پایا۔

محفوظ الرحمٰن قلندرانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی مال و دولت یا جاہ و منصب کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کے سامنے جتنے مواقع آئے اتنے شاید ہی اردو کے کسی صحافی کے سامنے آئے ہوں اور کوئی دوسرا ہوتا تو ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر کروڑوں روپے کما سکتا تھا لیکن ان کی قلندری نے کبھی اس طرف تاکنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور پوری زندگی بڑی حد تک فاقہ مستی ہی میں گزار دی۔

محفوظ الرحمٰن کے ایک قریبی رفیق، صحافی اور معروف خطاط جلال الدین اسلم کہتے ہیں کہ محفوظ الرحمٰن ہندستانی مسلمانوں کے ایسے مخلص اور ایسے بے باک صحافی تھے جن کی کوئی دوسری مثال ڈھونڈنے پر بھی شاید ہی مل سکے، وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ان تمام خوبیوں سے مزین تھے

جو ایک اچھے اور منجھے صحافی بلکہ ایک بہت اچھے انسان کو دوسرے تمام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تعلیم وتربیت نے ان کی سوچ کو نکھارا تھا اور ان کے مزاج اور ان کی فطرت کو اس طرح صیقل کیا تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور کہیں زیادہ لائق تعظیم وتکریم نظر آتے تھے۔ سنہ ستر کے سیاسی، سماجی اور انقلابی دور میں ملک کے قد آور سیاستدانوں وی پی سنگھ، چندر شیکھر، چرن سنگھ وغیرہ سے بہت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، لیکن مفادات کی سیاست و صحافت سے، اس کی پیدا کردہ رعونت وعفونت سے کوسوں دور رہے، وہ چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر لیتے لیکن ان کی صحافت چونکہ ملت کے لیے تھی اس لیے ملی خدمت کے جذبۂ بے پناہ میں ہی ڈوبی رہی۔ انھوں نے زندگی کی آخری دہائیوں میں اپنی رہائش گاہ کو دانش گاہ میں بدل دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور ''چشمۂ رحمانیہ'' سے فیضیاب ہوتے، دوستوں نے ان کی رہائش گاہ کو مذاقاً ''خانقاہ'' کے نام سے موسوم کر دیا تھا، ان کا ''لنچ ٹائم'' احباب کے لیے دعوت عام تھی جسے کچھ ساتھی لنگر خانہ کہتے اور کچھ لوگوں نے محفوظ صاحب کی ''دعوت شیراز'' کا نام دے رکھا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محفوظ بھائی کی دعوت شیراز سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی۔ چشمۂ رحمانیہ کے ہم مشرب لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو ان کے بہت سے معاملات وخیالات سے اتفاق تو نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے اعلام علم تلے ہی چین واطمینان بھی حاصل کرتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ محترم محفوظ الرحمٰن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جن صحافتی اقدار کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا ان کا محور ومرکز حقیقی معنوں میں وہ حدیث مبارک ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے، وہ ساری زندگی ملت کی زبوں حالی پر روتے رہے۔ اس کے غم میں ڈوبے رہے، اس کی تعمیر وترقی کے لیے قلمی جہاد کرتے رہے۔ وہ میدان صحافت کے ایسے بطل جلیل تھے جنھیں وقت کا نہ کوئی حکمراں اور نہ ہی کوئی اور اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکا، انھوں نے اپنی دانست میں جو بھی سچ جانا، سمجھا اسے بلا جھجک لکھا اور کہا۔ وہ اپنی تنقید میں بھی لوگوں کو صراط مستقیم دکھانے کا ہی فریضہ انجام دیتے رہے۔ ایسے بے لوث صحافیوں کی تعداد اب نا کے برابر ہے، انھی بے لوث وبے غرض لوگوں میں مرحوم کا نام نامی بھی سرفہرست ہے۔

جس کے اندر خودداری ہوتی ہے عام طور پر وہ قناعت پسند بھی ہوتا ہے اور یہ خوبی ان میں بھی تھی۔ ان کے اندر قلندرانہ اوصاف بھی تھے۔ اسی لیے پچاس سال سے زائد کا عملی صحافتی تجربہ رکھنے کے باوجود وہ انعام واکرام اور اعزاز وایوارڈ کی حصولیابی کی کوششوں سے کوسوں دور تھے۔

ان کے سامنے بالشتیے صحافیوں نے کہاں سے کہاں تک کی چھلانگ لگالی لیکن وہ مادی اعتبار سے وہیں کے وہیں رہے۔ البتہ ان کا انسانی اور صحافتی قد بلند سے بلندتر ہوتا گیا اور وہ صحافت کے قطب مینار میں تبدیل ہو گئے۔ عموماً اگر کوئی دو ایک ماہ کے لیے ہی گوشہ نشین ہو جائے تو زمانے سے کٹ جاتا ہے۔ محفوظ الرحمٰن کم وبیش ایک دہائی تک گوشہ نشین رہے اس کے باوجود وہ صحافتی اور سیاسی مین اسٹریم میں ہمیشہ موجود رہے۔ ملی معاملات ہوں یا قومی، ملکی صورت حال ہو یا غیر ملکی، سیاسی تجزیہ ہو یا غیر سیاسی، ان کی گرفت ہر مسئلے پر تھی اور ان کی نظر معاملات کے تمام پہلوؤں پر ہوتی تھی۔ وہ اپنے مضامین میں کسی بھی معاملے کے تجزیے کے دوران تمام جزئیات پر گہری نظر ڈالتے تھے اور ایک ایک نکتے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں رہتا تھا۔

محفوظ الرحمٰن کے ایک شاگرد اور سرکردہ صحافی ظفر زاہدی کے خیال میں قلندر صفت، یار باش، وضعدار، روپے پیسے کے تعلق سے لاپروا، صحافت اوڑھنا بچھونا، جیسے اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی لیے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ بڑے بڑے مذہبی وسیاسی لیڈران کے مشورے کے خواہاں، سیاسی امور ومسائل پر صائب رائے رکھتے تھے اور اس کا برملا اظہار کرنے میں کوئی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ نو واردان صحافت سے لے کر بڑے بڑے قابل صحافی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ قلم کے بادشاہ، آخری بیس پچیس برسوں میں لکھنے کے بجائے بے تکلف بول کر مضمون لکھواتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے الفاظ صف باندھے کھڑے ہیں، تحریر رواں دواں، شستہ وشگفتہ، رعنائی ودلکشی سے معمور ولبریز، آج سے چالیس برس پہلے جو زبان لکھتے تھے اسے سہل کرتے جا رہے تھے، کہتے تھے اب اتنی گاڑھی اردو سمجھنے والے کتنے لوگ رہ گئے ہیں، خشک سے خشک موضوع میں ایسی دلآویزی ودر کشش پیدا کر دیتے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ گفتگو اتنی شیریں جیسے زبان سے پھول جھڑ رہے ہوں 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' ان سے لڑ کر بھی مزا آتا تھا۔ گزشتہ پینتیس، چالیس برسوں میں بہت سے لوگوں سے ملا 'مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی'۔

ان کے طرز تحریر کی ایک قابل ذکر خوبی یہ تھی کہ ان کے نظریات پر ملی فکر حاوی رہتی تھی اور وہ کسی ایسے فیصلے یا معاملے کی حمایت نہیں کرتے تھے جس سے مسلم مخالفت یا اسلام دشمنی کی بو آتی ہو۔ ملی فکر ان کی صحافت کی اساس تھی۔ وہ یوں تو ایک مکمل صحافی تھے اور قومی وسیاسی امور پر ان کی

زبردست گرفت تھی۔ ملک و بیرون ملک کا کوئی بھی مسئلہ ان کی دور اندیش نگاہوں اور ان کی صحافتی لیاقت سے پرے نہیں تھا۔ وہ ملکی و عالمی حالات وواقعات کا انتہائی گہرائی اور جزرسی کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے تھے۔ لیکن ان کا قلم اس وقت بہت کاٹ دار اور دھاردار ہو جاتا تھا جب وہ کسی ملی مسئلے پر نظر ڈالتے تھے یا کسی ملی مسئلے کا پوسٹ مارٹم کرتے تھے۔ وہ ایسے مواقع پر کسی بھی مذہبی شخصیت سے خواہ اس کا عوامی قد کتنا ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو اور اس کو ملی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی کیوں نہ حاصل ہو مرعوب نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی بھی مذہبی شخصیت سے کوئی چوک ہوئی ہے تو ان کا قلم اسے بخشنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے اور ان کے قلم کے وار سے کوئی بھی نہیں بچتا۔ وہ جب کسی اخبار یا رسالے کے مدیر رہے تب بھی اور نہیں رہے تب بھی اپنے اصولوں کی ڈگر پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہے۔ چونکہ کسی سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اس لیے ان کے قلم کا ترازو کسی بھی جانب جھکتا نہیں تھا۔ وہ اپنے قلمی ترازو کے ایک پلڑے پر ملت کو رکھتے تھے اور دوسرے پر ملی شخصیت کو۔ اور پھر ملی مفاد کی روشنی میں گہرا جائزہ لیتے تھے۔

محفوظ الرحمٰن مسلم مطلقہ خواتین بل کے، جس انداز اور جس شکل میں وہ پاس ہوا ہے، سخت مخالف تھے۔ وہ پہلے دن سے ہی یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ بل اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہے اور عدالتیں طلاق اور نان ونفقہ کے مقدمات میں اس قانون کے تحت فیصلہ سنائیں گی اور وہ تمام فیصلے عائلی قوانین کے خلاف جائیں گے۔ یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی اور ملک کی زیریں عدالتوں سے لے کر عدالت عظمٰی تک متعدد مقدمات میں جو فیصلے سنائے گئے ہیں اور سنائے جا رہے ہیں وہ شریعت کے عائلی قوانین کے خلاف ہیں۔ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اس سلسلے میں جو دوسرے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں ان میں بھی ایسے ہی فیصلے سنائے جائیں گے۔ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو بھی آڑے ہاتھوں لینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور انتقال سے چند روز قبل لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں منظور شدہ قراردادوں اور فیصلوں پر انھوں نے سخت تنقید کی تھی اور اس بارے میں ان کا مضمون روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوا تھا۔ پرسنل لا بورڈ کے فیصلوں سے متعلق ان کا وہ آخری مضمون تھا۔ وہ ناعاقبت اندیش، خودغرض اور مصلحت کوش مسلم لیڈروں اور سیاست دانوں کے ان فیصلوں کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے جو مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کا سبب بننے کے امکانات رکھتے ہوں۔

ان کی صحافتی اور انسانی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیٹر ''جدید خبر'' معصوم مرادآبادی کہتے ہیں کہ راقم الحروف کو محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضری کے بے شمار مواقع ملے اور ہر بار ان سے کچھ سیکھنے، سمجھنے اور انگیز کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے پرانی دہلی کی گنجان گلیوں میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کسی نمود ونمائش اور شوق شہرت کے بغیر خاموشی سے بسر کیا۔ انھیں دیکھ کر گزرے زمانے کے ان لوگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی جو دنیا میں رہنے کے باوجود اس سے ایک فاصلہ بنا کر رکھتے ہیں ایسا ہی فاصلہ جیسا کہ آتش پرست آگ سے رکھتا ہے۔ انھوں نے دنیا سے محض ایک رسمی رشتہ ہی رکھا اور کبھی خود کو اس کی رنگینیوں، رعنائیوں اور بوقلمونیوں میں گم نہیں ہونے دیا۔ نہ کبھی ذاتی مکان خریدا، نہ گاڑی، نہ گھوڑا اور نہ مصاحب۔ ہمیشہ کرائے کے مکان میں ایک مسافر کی طرح رہے اور کسی مالی بوجھ کے بغیر آخرت کا سفر اختیار کیا۔ قناعت کا عالم یہ تھا کہ انھیں پیسوں کی طلب اپنی ضروریات زندگی سے بھی کم تھی۔ اس لیے اکثر تنگ دستی کا شکار رہتے تھے لیکن اس معاشی تنگدستی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے موجودہ زمانے کا ایسا کوئی حربہ استعمال نہیں کیا جس سے ان کے ضمیر یا قلم پر ضرب پڑتی۔ وہ ایک بیباک حقیقت پسند صحافی تھے۔ ان کا خمیر جہاں سے اٹھا تھا وہاں ذاتی مفادات اور انسانی خواہشوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ ملت کے مایہ ناز قائد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے لے کر مایہ ناز صحافیوں محمد مسلم اور مولانا عثمان فارقلیط جیسے جید صحافیوں سے اکتساب فیض کرنے والے محفوظ الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انھوں نے زندگی میں کبھی اپنے نظریات اور بنیادی عقائد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہر چند کہ اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت مختلف اور متضاد اداروں سے وابستگی اختیار کی لیکن اس کے باوجود اپنے بنیادی مشرب کو ترک نہیں کیا۔ راہ کی کوئی رکاوٹ، مشکل یا مصیبت ان کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا نہیں کر سکی اور انھوں نے تمام زندگی سرخرو ہو کر گزاری۔ محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں ہر حاضری کے وقت ادب اور احترام کے جذبات انگڑائیاں لیتے تھے۔ لیکن وہ اسے تکلف گردانتے تھے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی پوری طرح گھل مل کر اور اپنی بزرگی اور بے پناہ تجربات کا کوئی رعب ڈالے بغیر دوستی اور شفقت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جب گفتگو کرتے تھے تو طبیعت بڑی سیراب ہوتی تھی۔ محفوظ الرحمٰن صاحب نے ایک ایسے وقت میں آنکھیں موندی ہیں جب وسیع تجربہ، زبان دانی، تحریر کے حسن اور تسلسل کے علاوہ مقصد سے وابستگی رکھنے والے صحافیوں کا اردو میں زبردست قحط پیدا ہو گیا ہے۔ آج اردو صحافت ذہن، ضمیر اور زبان کے پیچیدہ

مسائل سے دوچار ہے اوران موذی امراض کا علاج ڈھونڈنے کی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے۔ اردو صحافت کے افق پر ایسے مجہول اور گمراہ عناصر اپنا تسلط قائم کرر ہے ہیں جنھیں دیکھ کر بعض اوقات اردوصحافت کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔

محفوظ الرحمٰن کی علمیت، ان کی صحافیانہ صلاحیت اوران کی قابلیت ہی کی یہ دلیل ہے کہ مجھ سمیت صحافت کے بے شمار طالبان علم کسی اہم موضوع پر کچھ لکھنے سے قبل ان سے ضرور مشورہ کرتے تھے اور پھر ان کی گفتگو کی بنیاد پر یا بات چیت کے دوران ان کی زبان سے ادا ہوجانے والے چند جملوں کی بنیاد پر مضمون کی پوری عمارت کھڑی ہو جاتی تھی۔ ہندی یا انگریزی کے صحافیوں کو مسلم معاملات پر کوئی اسٹوری کرنی ہوتو وہ انہی کے آستانے پر حاضری دیتے تھے اوران کے چند جملے ایکسکلیوسیو اسٹوری کی بنیاد بن جایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی انویسٹی گیٹیو اسٹوری کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی صحافتی زندگی میں انھوں نے اس کی بے شمار مثالیں بھی پیش کی تھیں۔ وہ واقعہ تو کوئی فراموش ہی نہیں کر سکتا جب انھوں نے میرٹھ اور ملیانہ کے متاثرین کے سلسلے میں جمع کی گئی رقم کے فکسڈ ڈیپازٹ اور سود کی رقم سے دفتر چلانے کے معاملے کا انکشاف کیا تھا اور ''اپنا ہفت روزہ'' کا ''خیانت نمبر'' شائع کر کے ملی وصحافتی حلقوں میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ صحافت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کے معیار کو بھی ذہن میں رکھتے تھے اور ایسی شستہ زبان لکھتے تھے کہ پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ اکثر بات چیت کے دوران آج کے اخباروں میں زبان کے گرتے معیار پر اظہار افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موجودہ صحافیوں کو معیاری زبان کی ٹریننگ کا بھی انتظام کیا جانا چاہیے۔ ان کے اندر معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے تجزیاتی مضامین میں کوئی جھول نہیں ہوتا تھا، کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔

وہ نوجوان صحافیوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے اوران کی خامیوں کو نظر انداز کرتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے تھے کہ بعد میں خود بخود یہ احساس ہوجاتا تھا کہ ہم نے کہیں غلطی کی ہے۔ لیکن وہ براہ راست اس کی نشاندہی نہیں کرتے تھے کہ کہیں اس سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ان کی قلمی سرپرستی میں اردو صحافیوں کی پوری ایک نسل جوان ہوئی ہے۔ اس نسل نے ان کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا ہے اور صحافت کے اصولوں سے روشناسی کے ساتھ ساتھ دیانت داری اور خودداری کی اہمیت کو سمجھا ہے۔ صحافت کے

پیشے میں اب بلیک میلنگ کا دور آ گیا ہے لیکن محفوظ الرحمٰن اس گر سے واقف ہی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کی گاڑی بس ایک ہی پٹری پر دوڑتی رہی۔ انھوں نے اس عیش و عشرت کو نہیں دیکھا جس کی حصولیابی موجودہ دور کے صحافیوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکی ہے۔ ان کے طرز زندگی اور انداز رہائش میں کبھی کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے گھر جانے والے کسی بھی شخص کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے حالات کیسے ہیں۔ ابتر حالات میں بھی ان کے چہرے پر شکن نہیں آتی تھی۔

محفوظ الرحمٰن کا صحافتی سفر بہت طویل تھا۔ انھوں نے زمانے کے سرد و گرم کو جھیلا تھا اور ان کو وقت کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے انگریزی میں بھی صحافت کی تھی اور ہندی میں بھی۔ لیکن ان کی اصل شناخت اردو صحافت ہی تھی۔ انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا اور پھر صحافت کی لائن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے سرکردہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی مسلمانوں کو عزت و وقار کے ساتھ جینے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے 70 کی دہائی میں مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی تو ان کے ایک معاون کی حیثیت سے محفوظ الرحمٰن ان کے ساتھ تھے اور پھر انھوں نے جب لکھنؤ سے روزنامہ قائد شروع کیا تو ان کی نظر انتخاب انھی پر جا کر رکی اور انھوں نے ان کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔ وہ جماعت اسلامی کے آرگن سہ روزہ دعوت کے بھی ایک عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ پہلے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے بہت دنوں تک کام کیا اس کے بعد ایڈیٹر کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ ان کا مزاج اس قسم کا تھا کہ وہ کسی کی علمیت یا عہدہ و منصب سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے طویل ذاتی تعلق کے دور میں یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف تین شخصیات سے متاثر تھے اور ان کے عقیدت مند تھے۔ ایک ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، دوسرے مولانا محمد مسلم اور تیسرے مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ باقی کسی کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ جب بھی ان دونوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو بے حد جذباتی ہو جاتے اور گھنٹوں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ وہ صحافیوں میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے بڑے قدردان تھے اور ان کے بارے میں جب بھی گفتگو کرتے تو جذباتی ہو جاتے۔ ان کے حکم پر ہی یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مولانا فارقلیط کے نام پر ایک صحافتی ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

انھوں نے درمیان میں سوویت انفارمیشن سینٹر میں بھی ملازمت کی تھی لیکن اس ملازمت

سے وہ مطمئن نہیں تھے اسی لیے موقع ملتے ہی اسے خیر باد کہہ دیا۔ ایک بار راقم الحروف سے کہنے لگے کہ سوویت انفارمیشن سینٹر میں ملازمت پر مجھ کو بہت افسوس تھا جس کا بعد میں میں نے کفارہ ادا کر دیا۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح تو انھوں نے کہا کہ افغانستان پر روسی حملے کے خلاف ایک کتاب لکھ کر۔ (اس کتاب کا نام ''سرخ یلغار'' ہے اور اس میں نہ صرف روسی حملے کی دلخراش تفصیلات ہیں بلکہ افغانستان کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔) محفوظ الرحمٰن نے ایک انتہائی مقبول ہفت روزہ ''اخبار جمعہ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے تھے اور ''اپنا ہفت روزہ'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اور ''بادبان'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی نکالا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے ''اپنا ہفت روزہ'' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور سعودی عرب پر بھی کتاب لکھی تھی اور کویت پر عراق کے حملے کے خلاف بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ غیر ملکی شخصیات میں جنرل ضیاء الحق سمیت متعدد سیاست دانوں سے انٹرویو کیے تھے جبکہ ہندوستانی سیاست دانوں سے انٹرویو کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سابق نائب وزیر اعظم چودھری دیوی لال اور سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ سے ان کے ذاتی مراسم تھے لیکن انھوں نے ان سے کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھایا۔

وہ اس ناچیز کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی تحریک پر ہی میں نے میڈیا کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی رہنمائی میں میڈیا کے موضوع پر تین کتابیں تصنیف کیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ترغیب و تحریک نے میرے اندر میڈیا کے گہرے مطالعے کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم کوشش کرو کہ سال میں ایک کتاب ضرور شائع ہو جائے مرنے کے بعد یہی کتابیں زندہ رکھیں گی۔ جب میری کتاب ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' شائع ہونے جا رہی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ یا تو اس کتاب پر مقدمہ لکھ دیں ورنہ میں اس کا انتساب آپ کے نام کر دوں گا۔ مقدمہ لکھنے سے انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ اب مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ ہفتہ واری کالم بہت مشکل سے لکھتا ہوں۔ بہر حال میں نے ان کے نام کتاب منسوب کر دی اور جب ان کو بتایا تو کہنے لگے کہ میرے نام منسوب کرنے کے بجائے اپنے بزرگوں کے نام کیوں نہیں کرتے۔ میری زبان سے نکل گیا کہ میں اپنے بزرگ ہی کے نام کر رہا ہوں۔ ایک لمحے کو خاموش رہے پھر جذباتی ہو گئے اور کہنے لگے کہ ٹھیک ہے جو سمجھ میں آئے کر دو۔ جب میں 2006 میں حج کر کے واپس آیا تو انھوں نے اصرار کر کر کے سفر نامہ لکھوایا جو روزنامہ قومی آواز میں بالاقساط

شائع ہوا تھا۔ اس سے بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ اس آگ کو بجھنے مت دینا۔ اس سے قبل کہ یہ بجھے مکمل سفرنامہ لکھ ڈالو۔ ان کے اصرار اور ان کی ہدایت پر میں نے پورا سفرنامہ لکھا جو "پھر سوئے حرم لے چل" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس طرح میرے اوپر ان کی بڑی نوازشیں رہی ہیں جن کی یادیں ہی اب میرا سرمایہ ہیں۔

محفوظ الرحمٰن جیسے صحافی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نشان راہ چھوڑ جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے زیر تربیت پروان چڑھنے والی صحافیوں کی نوجوان نسل ان کے اصولوں کو حرز جاں بنا کر انھیں خراج عقیدت پیش کرے گی اور ان کی صحافتی دیانت داری کے چراغ کو بجھنے نہیں دے گی۔

◆◆◆

میر مشتاق

سماجی کارکن اور صحافی میر مشتاق احمد 25 اپریل 1915 کو شملہ میں پیدا ہوئے تھے اور 19 جون 2001 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ معروف مجاہد آزادی میر عبدالستار کے آنگن میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے دادا کا نام میر محمد اسماعیل تھا۔ ان کے جدِ امجد سولہویں صدی کے وسط میں کشمیر سے لدھیانہ چلے آئے تھے۔ 1910 میں ان کے بیٹے اور میر صاحب کے والد محترم میر عبدالستار کی شادی جگراؤں کے ایک خاندان میں رحمت بی بی سے ہوئی۔ عبدالستار شادی کے بعد بسلسلہ کاروبار شملہ قیام پذیر ہوئے۔ ان کی اولادوں میں سب سے بڑے لڑکے کا نام میر غلام محمد تھا جو 1935 میں انتقال کر گئے۔ چھوٹے لڑکے کا نام میر مشتاق احمد تھا جو اپنے والد کے انتقال کے وقت چھ سال کے تھے اور محض چھ ماہ کی عمر میں اپنی والدہ کی آغوش سے بھی محروم ہو گئے۔ ان کی پرورش ان کی ہمشیرہ نے کی۔ دوران تعلیم انھوں نے ٹیوشن پڑھا کر اسکول کا خرچ اٹھایا تاکہ بہن اور بہنوئی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ 1932 میں تعلیم کی غرض سے دہلی آئے۔ 1934 میں ہائی اسکول اور یہاں کی دو سو سالہ قدیم درسگاہ اینگلو عربک کالج سے بی۔ اے کیا۔

بی۔ اے کے بعد نیشنل آرکائیوز میں ملازمت مل گئی جہاں فارسی ریکارڈ کا انگریزی میں ترجمہ کرنا میر صاحب کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ لیکن اس دوران ان کا رابطہ کانگریس اور مجاہدین آزادی سے قائم ہوا۔ ترجمہ کے دوران انھیں یہ معلوم ہوا کہ مجاہدین آزادی پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے گئے اور کس کس کو پھانسی دی گئی۔ اس سے انھیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب ملی اور انھوں نے آزادی کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

وہ ایک زبردست سیاست داں اور عوامی خدمت گار تھے۔ انھوں نے 1951 میں اپنا ہفت

روزہ اخبار ''ایشیا'' جاری کیا تھا جو کئی برسوں تک نکلتا رہا۔ وہ اپنے بے لاگ تبصروں اور بے باک مضامین کی وجہ سے کافی مشہور تھا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''مضامین میر'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ وہ ذہنی طور پر فخر الدین علی احمد، بابو جگجیون رام، رام منوہر لوہیا، ارونا آصف علی اور سبھدرا جوشی وغیرہ کے قریب تھے۔ وہ اپنے اخبار میں بڑی پرکشش سرخیاں لگاتے تھے۔ ان کی تحریریں پختہ، غیر مبہم اور دوٹوک ہوتی تھیں۔ وہ دہلی میں کوآپریٹو تحریک کے روحِ رواں تھے وہ ایک بہت اچھے شاعر اور مقرر بھی تھے۔ 1992 میں میر صاحب کو پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

میر صاحب کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ اردو اکادمی دہلی کا قیام ہے۔ میر صاحب نے سید شریف الحسن نقوی کے ساتھ اس کے قیام کے لیے بہت زیادہ کوششیں کیں اور اسے دفتری فائلوں سے نکال کر اردو برادری کے خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا۔ اسی طرح دہلی وقف بورڈ، دلی حج کمیٹی کے قیام میں ان کے تعاون کو کسی بھی شکل میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مسلم تعلیمی اداروں جیسے اینگلو عربک اسکول، فتح پوری اسکول کے وہ برسہا برس تک منیجر رہے۔ مرکزی حکومت کے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ابتدائی شکل ترقی اردو بورڈ کے قیام میں بھی میر صاحب نے بہت اہم رول ادا کیا۔

وہ علم، صداقت، شرافت، نیکی، انصاف پسندی، عاجزی، سیکولرزم، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی، خدمت انسانیت اور بلند آدرشوں کی آبیاری میں ساری عمر کوشاں رہے۔ 1982 کے بعد میر صاحب نے بدلتی زوال پذیر سیاسی قدروں کے باعث سیاسی جلسوں، محفلوں اور ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔

میر صاحب کی حیات و خدمات پر ایک اہم کتاب ناز صاحب نے لکھ کر ان کے معتمد خاص شری ہری نرائن شرما کی خدمت میں پیش کی تھی کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق اسے شائع کروالیں۔ کچھ عرصہ بعد ناز صاحب کا انتقال دورانِ حج مکہ معظمہ میں ہوگیا اور اس کے کچھ ماہ بعد ہی شری ہری نرائن بھی چل بسے۔ اس لیے کتاب نہیں چھپ سکی اور وہ مسودہ بھی کہیں کھوگیا۔

ناز انصاری صاحب اور ہری نرائن جی میر صاحب کے دو بازو تھے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد میر صاحب کی صحت بہت تیزی سے گرنے لگی اور وہ بالکل گوشہ نشین ہوگئے۔ پہلے بستی حضرت نظام الدین میں رہتے تھے پھر ہری نرائن جی کے بچوں کے ساتھ ساکیت میں قیام پذیر ہوگئے۔

میر صاحب سیدزادے تھے، بزرگان دین سے عقیدت رکھتے تھے اور اللہ والوں سے محبت بھی کرتے تھے ان کے یہاں تعصب وتنگ نظری کسی بھی شکل میں موجود نہیں تھی۔ وہ شیخ و برہمن کی بحث میں بھی نہیں الجھتے تھے۔ ان کے پاس آنے والوں میں ہر طبقہ اور برادری کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں برہمن بھی ہوتے اور دلت بھی، سرمایہ دار بھی ہوتے اور مزدور بھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں میں گداگری کرنے والے مفلوک الحال لوگ بھی ہوتے تھے اور شاعر وادیب بھی اور سیاست داں ودانشور بھی۔ وہ ایک انجمن ''انجمن تعمیر اردو'' کے روح رواں بھی تھے۔ جس کے کرتادھرتا گلزار دہلوی صاحب تھے۔ اس کی ماہانہ نشستوں میں فراقؔ اور جوشؔ جیسے شعرا شرکت کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن جیسے جید علما کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

1956 میں میر صاحب نے جنتا کوآپریٹیو بینک کی بنیاد جامع مسجد علاقہ میں رکھی تاکہ علاقہ کے چھوٹے موٹے کاروباری اور بے روزگار لوگ بینک سے قرض لے کر اپنے روزگار میں اضافہ کرسکیں۔ ان کا لگایا ہوا ننھا سا پودا آج تناور درخت بن چکا ہے۔ اس بینک کی جمع رقم 35 کروڑ تک پہنچ چکی ہے اور اس کے ممبران کی تعداد بھی دس ہزار سے زائد ہے۔ تقسیم ملک کے دوران میر صاحب نے سماجی کارکن کے طور پر ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ دہلی انتظامیہ کی جانب سے انھیں اسپیشل مجسٹریٹ بنایا گیا تھا۔ وہ گلے میں ریوالور لٹکائے علاقے میں امن وامان قائم کرنے، ہجرت کرنے والوں کو روکنے اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو بسانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ انھوں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور لٹے پٹے لوگوں کی ڈھارس بندھائی اور انھیں ہر ممکن مدد پہنچانے کی کوشش کی۔ جب ملک آزاد ہوا اس وقت میر صاحب کی عمر 32 سال تھی۔ یہ عمر کچھ کرنے اور کر دکھانے کی تو ضرور ہوتی ہے۔ اس عمر میں امنگیں جوان اور ولولے نقطۂ عروج پر ہوتے ہیں لیکن میر صاحب نے قوم کے غم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ کناٹ پلیس کی رہائش کو ترک کرکے جامع مسجد کے سامنے اردو ناہال کے ایک کمرہ میں قیام پذیر ہوگئے اور دوسروں کا گھر بساتے بساتے اپنا گھر بسانا ہی بھول گئے۔ اہم سرکاری عہدوں پر رہنے کے باوجود کبھی سرکاری رہائش لینا پسند نہیں کی۔

1947 کے پرآشوب دور میں میر صاحب نے بڑے مدبرانہ ڈھنگ سے پہلے تو فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر متاثرین کو کیمپوں میں منتقل کیا۔ جب حالات سنبھلنے لگے تو

انھیں خالی گھروں میں آباد کرنے کی ابتدا کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس کے بعد سب سے کٹھن مرحلہ شروع ہوا مسلمان عورتوں کو شرپسندوں کے چنگل سے چھڑانے کا۔ اس کام میں بڑے بڑے لیڈروں کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس موقع پر میر صاحب کا ساتھ دینے والوں میں نامور صحافی جمناداس اختر سب سے آگے تھے۔ ان حضرات نے مل کر اور مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر معصوم بچیوں اور عورتوں کو چھڑانے کا سلسلہ شروع کیا۔ بالاخانوں سے بھی بہت سی عورتوں کو چھڑا کر ان کا گھر بسانے کی کوشش کی۔

◆◆◆

موہن چراغی

موہن چراغی 3 مارچ 1939 کو جموں وکشمیر کے سری نگر میں ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال یکم فروری 2010 کو کلکتہ میں ہوا۔ ان کے والد اپنے اصولوں کے پکے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انھی کی طرح بااصول بنے۔ اس کے لیے وہ ان پر سختیاں بھی کرتے اور بقول موہن چراغی یہ سختیاں بعض اوقات جسمانی سزا میں بھی تبدیل ہو جاتیں۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ایک بڑا آدمی بنے یا نہ بنے لیکن بڑا انسان ضرور بنے۔ اسی لیے وہ اپنے اصولوں کے سانچے میں موہن چراغی کو ڈھالنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ اصول پسندی ان کو پسند نہیں تھی اور والد کی سختیاں ان کو گراں گزرتیں۔ جس کا نتیجہ اس شکل میں نکلا کہ موہن چراغی کے بقول ''مزاج پر آوارہ پن حاوی ہو گیا''۔ اس آوارہ پن نے انھیں در در بھٹکایا۔ انھوں نے کبھی کوئی نظریہ اختیار کیا تو کبھی کوئی۔ کبھی کوئی کام کیا تو کبھی کوئی۔ انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ کہیں ان کے مزاج کا ''آوارہ پن'' خاندان کی عزت کی لٹیا نہ ڈبو دے۔

موہن چراغی نے 1996 میں جموں وکشمیر کی سیاست پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے ''برف میں آگ''۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے ''میں ایک سیدھا سادہ کشمیری، جو ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں سونے کا چمچہ لیے پیدا ہوا۔ بچپن آرام سے کٹا لیکن خاندان کی لمبی ناک کو اور لمبا کرنے کی خواہش میں والد نے ایسے ڈسپلن میں جکڑ دیا کہ مزاج پر آوارہ پن حاوی ہو گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ناستک (دہریہ) بن گیا اور یہیں سے شروع ہوئی میری بغاوت۔ آہنی ڈسپلن، خاندانی روایت، مذہبی رسومات اور فرسودہ خیالات کے خلاف''۔

اس بغاوت نے ان کے مزاج میں بڑے پیمانے پر تبدیلی پیدا کر دی۔ انھیں سرمایہ داری سے نفرت ہوگئی۔ سماج میں غیر مساوات اور نابرابری نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ کسی ایسے راستے پر چلنے کے لیے بے تاب تھے جہاں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہو اور جہاں نابرابری کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس تعلق سے جب انھوں نے غور کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ کمیونزم ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو سماج سے نابرابری ختم کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کمیونسٹ ہو گئے۔ وہ اس بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جوانی پر نکھار آیا یا نہیں یاد نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور یاد ہے کہ جوانی میں قدم رکھا تو غربت، بھوک، بیماری منہ کھولے نگلنے کو تیار تھی۔ مایوسی اور یاسیت کے گھیرے میں قید کئی بار فرار کا راستہ اختیار کیا لیکن ہر بار پکڑا گیا۔ سیاسی اور ادبی محفلوں میں ذہنی عیاشی کا ایسا روگ لگ گیا کہ کمیونسٹ بن گیا۔ پرولتار کے لیے سڑکوں پر اخبار فروخت کرتا رہا۔ ڈی کلاس ہونے کے لیے گندی نالیوں پر خارش زدہ چھابڑی فروشوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتا رہا۔ غریبوں کے غم میں کئی کئی روز کپڑے نہ بدلنا، ناخن لمبے، گندے بال۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گھر گھر جا کر بڑے لوگوں کے صاحبزادوں کو پڑھانا۔ اپنی آوارگی میں مست۔ مستی کا خمار اترا تو لوگ کافی آگے نکل چکے تھے...... برسوں کے بعد گھر پر نظر پڑی تو آدھا مکان بک چکا تھا۔ اجنبی لوگ مکان کے گوشوں پر قابض ہو گئے تھے...... گھر کا ایک حصہ خالی، بالکل ننگ۔ برتن، فرنیچر اور دیگر سامان سب کچھ بک چکا تھا۔ ایک اندھیرے کونے میں ننگے فرش پر پڑی تھی بیوہ والدہ''۔

ان واقعات نے موہن چراغی کی زندگی پر منفی اثر ڈالا جس کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی بھر دہشت گردی اور ظلم و زیادتی کے خلاف لکھتے رہے۔ جموں و کشمیر میں جب دہشت گردی کو عروج حاصل ہوا تو موہن چراغی بھی اس کی زد میں آگئے اور ان کا تین منزلہ مکان خاکستر ہو گیا، لائبریری جلا دی گئی اور انھوں نے بھی دوسرے کشمیری پنڈتوں کی مانند اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ دیا اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔

اخبار میں کام کرنے سے قبل انھوں نے سری نگر میں کمیونسٹ پارٹی کی کتابوں کی دوکان پر ملازمت کی اور کتابیں بیچنے لگے۔ لیکن یہ نوکری زیادہ دن برقرار نہیں رہ سکی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ

کچھ کمیونسٹوں نے جو حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی کمیونسٹ تھے، دوکان پر قبضہ کرلیا اور اس میں شراب خانہ کھول دیا۔ جن الماریوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، غالب اور سرلا دیوی کی کتابیں سجا کرتی تھیں ان میں شراب کی بوتلیں سجائی جانے لگیں۔ اس صورت حال نے موہن چراغی کو بری طرح متاثر کیا۔ انھوں نے کانگریس پارٹی میں بھی کام کیا اور متعدد بڑے لیڈروں کو قریب سے دیکھنے کا انھیں موقع ملا۔ اسی دوران انھوں نے نئی دہلی سے شائع ہونے والے کانگریس کے انگریزی اخبار روزنامہ ''نیشنل ہیرالڈ'' کے لیے سری نگر سے رپورٹنگ شروع کردی اور پھر انھیں وہاں نیشنل ہیرالڈ کا نمائندہ مقرر کردیا گیا۔

1980 میں جب اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے دہلی سے اردو روزنامہ قومی آواز کا اجرا کیا تو چونکہ وہ اردو جانتے تھے اور انھیں اردو اخبار میں کام کرنے کا بہت اشتیاق تھا اس لیے وہ نئی دہلی آگئے۔ پھر کمپنی کے چیئرمین یشپال کپور نے انھیں روزنامہ قومی آواز کی ایڈیٹوریل ٹیم میں شامل کردیا۔ انھوں نے 1980 سے 1987 تک قومی آواز میں بطور رپورٹر کام کیا۔ اس وقت عشرت علی صدیقی ایڈیٹر تھے۔ اسی دوران انھوں نے موہن چراغی کو قومی آواز دہلی کا اور عثمان غنی کو لکھنؤ ایڈیشن کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ہڑتال ہوگئی اور دہلی سے روزنامہ انقلاب جاری ہوا تو قومی آواز کی تقریباً پوری ٹیم وہاں چلی گئی۔ اس کی ایڈیٹر نور جہاں ثروت تھیں۔ جو اس سے قبل قومی آواز کے ہفت روزہ ایڈیشن کی ادارتی انچارج تھیں۔

14 ماہ کی ہڑتال کے بعد جب قومی آواز دوبارہ شروع ہوا تو اس کی تقریباً پوری ٹیم اس میں واپس آگئی البتہ نور جہاں ثروت واپس نہیں آئیں۔ وہ تادم آخر انقلاب کی دہلی میں ریزیڈنٹ ایڈیٹر رہیں۔ اس دوران چراغی صاحب سری نگر چلے گئے تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ اخبار پھر نکل رہا ہے اور نور جہاں ثروت کو بحیثیت ایڈیٹر واپس لانے کی کوشش کی جارہی ہے تو وہ دہلی چلے آئے۔ نور جہاں ثروت کے واپس نہ آنے کی وجہ سے انھیں قومی آواز کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ دو تین سال کے بعد وہ ریٹائر ہوگئے مگر کمپنی نے انھیں بحال رکھا اور گریڈ کے بغیر ایک مقررہ تنخواہ پر انھیں کام کرنے کو کہا۔ اس وقت سے لے کر 30 مارچ 2008 کو اخبار کے بند ہونے تک وہ ایڈیٹر رہے۔

موہن چراغی کشمیر کے باشندہ تھے اور کشمیر میں اردو اخبارات پہلے بھی بڑی تعداد میں نکلتے رہے ہیں اور اب بھی نکلتے ہیں۔ انھیں ان اخباروں کو دیکھ کر لالچ ہوتا کہ کاش وہ بھی کسی اردو اخبار

میں کام کرتے۔ بالآخر قومی آواز نے انھیں ایک پلیٹ فارم دے دیا۔ نہ صرف پلیٹ فارم دیا بلکہ ایک شناخت بھی عطا کی۔

پہلے لکھنؤ اور پھر دہلی سے قومی آواز کی کامیاب اشاعت کے بعد دوسرے شہروں سے بھی اس کے ایڈیشن نکلے۔ جن میں سری نگر ایڈیشن بھی شامل ہے۔ بہت سے لوگ سری نگر سے اخبار نکالنے کے خلاف تھے۔ لیکن موہن چراغی اس کے زبردست حامی تھے کہ سری نگر سے بھی قومی آواز کا ایڈیشن نکلنا چاہیے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے دوست، رفیق کار اور قومی آواز کے ہیڈ کاتب اور خطاط جناب جلال الدین اسلم کے ساتھ مل کر سری نگر ایڈیشن کے خدوخال طے کیے اور پھر وہاں سے اخبار نکل آیا۔ جلال الدین اسلم نے سب ایڈیٹروں اور کاتبوں کی تقرری میں اہم رول ادا کیا۔ اس کی ذمہ داری انہی پر تھی۔ وہ ایک ماہ تک وہاں رہے۔ جب اس کا ڈھانچہ تیار ہو گیا اور اخبار نکلنے لگا تو واپس آ گئے۔

سری نگر میں بقول چراغی صاحب پیسے کے بغیر نہ تو خبر چھپتی تھی اور نہ ہی مراسلہ۔ انھوں نے اس روایت کو توڑنے کی کوشش کی اور اعلان کر دیا کہ قومی آواز میں بغیر پیسے کے خبروں اور مراسلات کی اشاعت ہوگی۔ لیکن یہ اعلان کسی کے گلے نہیں اتر رہا تھا اور لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کیسا اخبار ہے جس کو پیسے کی ضرورت نہیں یا جو پیسے کے بغیر ہی خبریں اور مراسلات چھاپتا ہے۔

موہن چراغی نے اپنی کتاب "برف میں آگ" میں اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں " 1989 میں قومی آواز کا سری نگر ایڈیشن خدمت بلڈنگ سے شروع کیا گیا۔ قومی آواز کا سری نگر ایڈیشن شروع کرنے میں کئی طرح کی رکاوٹیں ڈالی گئیں...... ریاست کی صحافتی زندگی میں قومی آواز کا آجانا ایک صحت مند تبدیلی تھی...... قومی آواز نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اعلان کیا کہ مراسلوں، عوامی شکایات اور خبروں کو بغیر اجرت کے شائع کیا جائے گا۔ اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ کئی روز تک قومی آواز کے دفتر کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا۔ کیونکہ ہر ایک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ جو اخبار بغیر اجرت کے خبریں شائع کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس میں خبریں شائع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب یہ بات عام ہو گئی تو قومی آواز کی اشاعت پانچ سو کاپیوں سے بڑھ کر دس ہزار یومیہ ہو گئی"۔ یوں تو چراغی صاحب پیسوں کے معاملے میں بہت سخت تھے اور دہلی میں بھی وہ ایسے لوگوں کو دفتر میں آنے نہیں دیتے جو لالچ دکھا کر خبریں چھپوانے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کو قریب سے جاننے والے ہمیشہ اس شبہے میں مبتلا رہے کہ اس معاملے میں

چراغی صاحب کا رویہ وہ نہیں ہے جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔ انھوں نے زندگی بھر ایک اردو اخبار میں کام کیا لیکن زندگی بھر وہ اردو صحافت سے شاکی رہے۔ بعض اوقات اردو صحافت اور اردو زبان سے متعلق ان کی گفتگو سے ایسا لگتا جیسے وہ اردو دشمن ہیں۔ بہت سے لوگ ان کو یہی مانتے رہے۔ وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ موہن چراغی اردو کے آدمی ہیں یا اردو کے معاملے میں سنجیدہ ہیں۔ حالانکہ چراغی صاحب اس کا دعویٰ کرتے رہے کہ اردو سے انھیں پیار ہے۔ انھوں نے 2006 میں شائع ہونے والی میری کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' میں لکھے گئے اپنے مضمون میں تحریر کیا تھا:

''میں جب انگریزی زبان کی صحافت سے بھٹک کر اردو صحافت میں 25 برس پہلے آیا تھا تو میرے ذہن میں اردو صحافت کے بارے میں ایک خاص خاکہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان سے میں ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ حالانکہ میرے پاس اردو زبان کی کوئی ڈگری نہیں ہے نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی ادیب، البتہ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے اندر کے جذبات کو اردو زبان کے ذریعہ باہر لاسکتا ہوں۔ میں جب اردو صحافت کی جنت سے باہر تھا تو ہر وقت مجھے یہ خواہش ستاتی رہتی تھی کہ اس جنت میں کیسے داخلہ ملے گا اور جب اس جنت میں داخل ہونے کا موقع ملا تو مجھے مرحوم ییش پال کپور جیسے نڈر اور باصلاحیت سرپرست اور عشرت علی صدیقی جیسے عظیم اردو صحافی کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہ وہ یگ تھا جب قومی آواز کا طوطی بولتا تھا اور اس میں کام کرنے والے بھی ساتھی میری طرح بے چہرہ اور بے نام تھے۔ لیکن قومی آواز ہماری پہچان بن گیا۔ اور ہم بے نام ہو کر بھی نیک نام بن گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب تاجر پیشہ اور کاروباری ذہنیت کے لوگوں نے اردو صحافت کی طرف رُخ کیا اور سیاستدانوں نے اردو صحافت کو اپنے ووٹ بینک کا بیئرر چیک بنا دیا تو اردو صحافت جو کہ پہلے ہی Developed صحافت نہیں تھی عرش سے فرش پر آگئی اور مجھ جیسا اردو صحافی بھی محسوس کرنے لگا کہ اس جنت میں داخل ہونے کی خواہش خودکشی تھی۔ 25 برسوں کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو صحافت ابھی تک اپنے وجود کو منوا نہیں سکی ہے اور نہ ہی تنگ و تاریک حلقوں سے آزاد ہو کر مثبت رول ہی ادا کر پا رہی ہے''۔

وہ مزید لکھتے ہیں: ''اردو صحافت کا المیہ یہ ہے کہ خود اردو والوں اور سیکولر سیاست کا اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے بے سُرا ہارمونیم بجانے والوں نے اردو زبان کو قومی دھارے سے دور رکھا۔ اردو زبان کو مسلمان بنایا گیا اور اس طرح اردو صحافت سماج کے ایک حلقہ کی ترجمان بن گئی۔ اگر اس بے معنی اور بے مقصد دلیل کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اردو اقلیت کی زبان ہے تو اردو صحافت بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا احاطہ کرنے اور ان کی رہبری کرنے میں مکمل طور سے ناکام رہی ہے۔ اردو صحافت نے ہمیشہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور احساس کمتری میں مبتلا رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے مسلمانوں کی خود اعتمادی کو توڑ کر انھیں اپنے وجود سے مایوس کیا ہے۔ اردو صحافت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اردو کو ووٹ بینک کی سیاست نے ترقی کے زینے طے کرنے کا ایک اہم میڈیم بنا دیا ہے۔ اردو صحافت میں ایک ایسا مفاد خصوصی رکھنے والا گروپ حاوی ہے جو اپنے نجی مفادات کے لیے اردو میڈیا کو ووٹ بینک کی سیاست سے جوڑے رکھنے پر بضد ہے''۔

موہن چراغی نے قومی آواز میں آنے کے بعد پھر انگریزی صحافت کی جانب مڑ کر نہیں دیکھا۔ شاید اب وہاں ان کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ قومی آواز اس وقت مقبولیت کے عروج پر تھا اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کو جو عزت اور مقام و مرتبہ حاصل تھا وہ کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔ اگر چراغی صاحب انگریزی صحافت میں واپس جاتے تو ممکن ہے کہ وہ مالی اعتبار سے زیادہ مستحکم ہوجاتے لیکن شہرت و مقبولیت ان کے مقدر میں نہ آتی۔

موہن چراغی کو بہت سے قارئین اور کئی سرکردہ مسلمان بھی ہندو نہیں بلکہ مسلمان سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار کسی شخص نے موہن چراغی سے کہا کہ انھوں نے حج کے لیے درخواست دی ہے اگر وہ سفارش کردیں تو درخواست منظور ہوجائے گی۔ انھوں نے متعلقہ شخص سے سفارش کی اور درخواست منظور ہوگئی۔ مگر ''مولانا مومن چراغی'' کے نام سے منظور ہوئی۔ مذکورہ ذمہ دار نے سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں، مولانا ہیں اور اپنے لیے سفارش کررہے ہیں۔ لہٰذا بغیر درخواست کے ہی ان کی حج درخواست منظور ہوگئی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ چراغی صاحب نے بتایا تھا کہ کسی جگہ مسلمانوں کے ایک گروپ میں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی مذہبی مسئلے پر بحث ہورہی تھی۔ جب کوئی حل نکلتا نظر نہیں آیا تو ایک شخص نے جو کہ شریک بحث تھا چراغی صاحب سے کہا کہ اچھا جناب آپ بھی مسلمان ہیں، اللہ والے ہیں، آپ بتایئے اس معاملے میں آپ کی کیا

رائے ہے؟

بہر حال موہن چراغی کو قومی آواز کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ ایک اچھے صحافی تھے۔ البتہ چونکہ کشمیر سے لٹ پٹ کر آئے تھے اس لیے ان کی تحریروں میں ایک خلش تھی، ایک چبھن تھی اور وہ جتنی شدت سے ہندو اکثریت کے تعصب کی مذمت کرتے اسی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے مسلم اقلیت کے تعصب کی بھی مذمت کرتے۔ وہ مسلمانوں کی جذباتیت کی شکایت اکثر و بیشتر کرتے رہتے لیکن خود ان کی تحریریں بڑی جذباتی ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشرت علی صدیقی کے زمانے میں ایک بار ان کی تحریروں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

وہ ایک ایسے ایڈیٹر تھے جو سب ایڈیٹروں سے بھی زیادہ کام کرتے تھے۔ خاص مواقع پر وہ صفحہ اول پر ایک باٹم اسٹوری لکھتے اور جب وہ اسٹوری ان کے نام چھپتی تو وہ اس کی سرخی کسی مصرع سے اور خاص طور پر فیض احمد فیض کے مصرع سے لگاتے۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ شاعروں سے بری طرح خار کھاتے تھے۔ لیکن قومی آواز میں کام کرنے والے ایک بہت اچھے شاعر فرحت احساس سے ان کی دوستی تھی۔ دفتر میں اگر کوئی شخص غزل یا نظم لے کر آتا تو اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے اور کہتے کہ یہ اخبار شاعری چھاپنے کے لیے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ عشرت علی صدیقی کا ایک واقعہ اکثر سناتے کہ ایک بار ایک شیروانی پوش نوجوان دفتر میں آیا اور اس نے کہا کہ جناب میں اخبار میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ عشرت صاحب نے پوچھا کہ آپ ترجمہ وغیرہ کر لیں گے؟ انھوں نے، جن کا منہ پان سے بھرا ہوا تھا، کہا کہ اماں ہم تو شاعر ہیں شاعری کرتے ہیں۔ اس پر عشرت صاحب نے کہا کہ جناب یہاں آپ کا کوئی کام نہیں ہے کیونکہ ہمیں شاعر نہیں مترجم چاہیے۔

موہن چراغی اظہار خیال کی آزادی کے طرفدار تھے لیکن مسئلہ کشمیر پر اتنے سخت گیر واقع ہوئے تھے کہ اپنے موقف اور نظریے کے خلاف ایک لفظ بھی سننا یا چھاپنا گوارہ نہیں کرتے۔ ان کے قلم میں اتنی شدت تھی کہ بہت سے لوگ ان کو مسلم دشمن سمجھتے۔

جب 2 فروری 2010 کو یہ خبر ملی کہ موہن چراغی کا انتقال ہو گیا تو ایک دھچکہ سا لگا۔ حالانکہ ان کی گرتی ہوئی صحت اور ہفتے میں تین بار ڈائلیسس کے پیش نظر یہ اندیشہ تو تھا کہ اب ان کی عمر کے دن زیادہ نہیں بچے ہیں۔ لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ وہ ابھی چلے جائیں گے۔ انتقال سے تقریباً پندرہ روز قبل میرے پاس ان کا فون آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کلکتہ جا رہے ہیں جہاں کسی

ڈاکٹر سے اپنے مرض کے بارے میں سکنڈ اوپینین لیں گے۔ انھوں نے مجھے ایک ذمہ داری سونپی اور کہا کہ وہ واپس آکر اس سلسلے میں مزید بات کریں گے۔ حالانکہ ان کے لہجے کی غیر یقینی یہ چغلی کھا رہی تھی کہ انھیں خود پتہ نہیں ہے کہ وہ واپس آسکیں گے یا نہیں۔ تاہم انھوں نے واپسی پر ملاقات کی بات کہہ کر اپنی خود اعتمادی کے اظہار کی کوشش کی۔

قومی آواز بند ہونے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ جنوبی دہلی کے سریتا وہار میں اپنی بڑی بیٹی کے فلیٹ میں رہتے تھے جہاں ہم چند لوگوں کے علاوہ شاید اور کوئی ملنے جلنے والا نہیں تھا۔ وہ چونکہ بہت کم آمیز تھے اس لیے سریتا وہار میں دوست احباب بھی نہیں بن سکے تھے۔ قومی آواز کے دنوں میں ان کا زیادہ تر وقت دفتر ہی میں گزرتا تھا اور صبح کو جلد آجانا اور شام کو دیر سے جانا ان کا معمول تھا۔ اس پر ہم لوگ کہتے تھے کہ قومی آواز ان کی زندگی بلکہ ان کی سانس ہے۔ جس دن یہ سانس ٹوٹی وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تاہم وہ بہت سخت جان نکلے اور قومی آواز کے مرحوم ہو جانے کے بعد بھی تقریباً دو سال تک زندہ رہے۔ ان کو اس کا بڑا ملال تھا کہ اخبار بند ہونے کے بعد وہ تمام لوگ منظر سے غائب ہو گئے جن کو وہ اپنے دست و بازو سمجھتے تھے۔ اخبار بند ہونے کے بعد جن لوگوں نے ان سے جلد ملاقات کی ان کو تو انھوں نے کچھ نہیں کہا لیکن جنھوں نے بہت دیر سے ان کو یاد کیا انھیں بالکل اسی انداز میں ڈانٹ سننی پڑی جیسی کہ دفتر میں کسی غلطی پر سننی پڑتی تھی۔ جب ڈانٹ کر تھک جاتے تھے تو پھر اسی اپنائیت سے بات کرنے لگتے تھے جو کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ کہتے بھی تھے کہ یہ تو غصے کا جھاگ تھا جو بلبلے کی مانند اٹھا اور پھوٹ کر ختم ہو گیا۔

موہن چراغی کے مزاج میں صحافیانہ خو بو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ جو قومی آواز اور موہن چراغی کے معاملات سے واقف نہیں وہ قومی آواز کے بند ہونے کا الزام ان کے سر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چراغی نے قومی آواز کو ڈبو دیا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ موہن چراغی شروع کے دنوں میں ضرور نیشنل ہیرالڈ میں ایک طاقتور کردار کے مالک تھے لیکن رفتہ رفتہ حالات اتنے بدتر ہوتے گئے کہ ان پر کسی کا کوئی کنٹرول ہی نہیں رہا۔ نہ چراغی صاحب کا، نہ کارکنوں کا، نہ مینجمنٹ کا اور نہ ہی کمپنی کے چیئرمین کا۔ سب وقت اور حالات کے دھارے پر بہے جا رہے تھے۔ اس دھارے کا رخ موڑنے کی کسی میں سکت تھی اور نہ ہی خواہش۔ موہن چراغی بھی دوسرے کارکنوں کی مانند اس دھارے میں ایک تنکے کی حیثیت رکھتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہاں کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں ضرور طاقت تھی اور وہ بھی اتنی کہ وہ کارکنوں کو

معقول معاوضہ دے کر کمپنی بند کر دے۔ سواس نے وہی کیا۔

اپنے آخری دنوں میں قومی آواز بھی انتہائی غیر معیاری اور خراب اخبار بن کر رہ گیا تھا اور نیشنل ہیرالڈ بھی۔ ہیرالڈ تو بہت پہلے سے ہی غیر معیاری ہونے کا طعنہ جھیل رہا تھا اور اسے سفید ہاتھی کہا جاتا تھا۔ بعد میں قومی آواز بھی سفید ہاتھی ہو گیا۔ موہن چراغی بھی اگر چاہتے تو وہ قومی آواز کو نئی زندگی نہیں دے سکتے تھے اور کوئی دوسرا ایڈیٹر آتا تو وہ بھی اسے نیا جنم دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ البتہ اگر مینجمنٹ میں قوت ارادی ہوتی تو یہ کارنامہ کوئی معمولی سا سب ایڈیٹر بھی سرانجام دے دیتا۔ اس لیے یہ کہنا کہ موہن چراغی نے قومی آواز کو ڈبو دیا ان کے ساتھ ناانصافی ہے اور حالات و معاملات سے یکسر ناواقفیت کی دلیل بھی ہے۔ ان کے انتقال سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل ایک نوجوان اردو صحافی نے، جو کہ صحافت کے موضوع پر ریسرچ کر رہے تھے مجھ سے کہا کہ میں ان کو صحافت کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ میں نے مشورہ دیا کہ موہن چراغی صاحب سے ملو۔ اس پر انھوں نے برجستہ کہا کہ وہ کیا بتائیں گے، انھوں نے تو قومی آواز کو برباد کر دیا۔ میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ ان سے ملیے اور فی الحال اس میں نہ پڑیے کہ قومی آواز کو کس نے برباد کیا۔ بہر حال وہ جب مل کر آئے تو ان کی رائے بدل چکی تھی اور دو گھنٹے کی ملاقات میں ان کو اتنا کچھ حاصل ہو گیا کہ ان کا ایک باب مکمل ہو گیا۔ اس لیے جب کوئی کہتا ہے کہ چراغی صاحب نے قومی آواز کو برباد کیا ہے تو مجھ سمیت کئی لوگ ہیں جو اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ ہاں! میں انھیں اس حد تک ضرور قصوروار سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران کسی ایک بھی کارکن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جبکہ وہ کر سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت تھی کہ ان کے دو لائن لکھنے سے کسی کی بھی ملازمت کے لالے پڑ جاتے۔ لیکن انھوں نے بعض کارکنوں کی گالیاں کھائیں، ان کے ہاتھوں رسوا ہوئے لیکن کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی، جس کے نتیجے میں کئی کارکنوں میں ضابطہ شکنی اور دفتری نافرمانی کا مزاج پیدا ہو گیا۔ دراصل وہ اس کے حق میں نہیں تھے کہ ملازموں کو پورے چھ یا آٹھ گھنٹے تک باندھ کر رکھا جائے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اخبار پورا ہونا چاہیے خواہ کوئی پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی کر رہا ہو یا تین گھنٹے کی۔ اس سے دفتری نظم و ضبط بری طرح متاثر ہوا جو آخر تک نہیں سنبھلا۔ البتہ جب دفتر میں آمد و رفت کے دستخط ضروری ہو گئے تب جا کر ضابطے کی تھوڑی بہت پابندی ہوئی۔

موہن چراغی میں صحافیانہ خوبیاں بھی تھیں اور انسانی خوبیاں بھی۔ ان کی سب سے بڑی

خوبی یہ تھی کہ وہ کام سے جی نہیں چراتے تھے۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ آخری عمر میں بھی وہ کسی بھی سب ایڈیٹر یا شفٹ انچارج سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اور یجنل رائٹنگ کے علاوہ ترجمہ بھی بہت کرتے تھے اور ہم لوگوں کو بار بار تلقین کیا کرتے تھے کہ ترجمہ کرنا مت چھوڑو ورنہ عادت بگڑ جائے گی اور پھر کر نہیں پاؤ گے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ڈیسک کے تمام لوگ باہر نکل جاتے تھے چائے پینے یا دل بہلانے اور وہ اپنی میز پر ڈٹے رہتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی آ جاتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی کہ یہ کیسا ایڈیٹر ہے کہ اکیلے ہی بیٹھ کر کام کیے جا رہا ہے۔ ملکی یا بین الاقوامی سطح پر جب بھی غیر معمولی حالات ہوتے تو ان کے اندر بھی غیر معمولی سرگرمیاں شروع ہو جاتیں اور ایسے مواقع پر وہ ایک ایک بات کا خیال رکھتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ خبر میں کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ آخری دنوں میں اگرچہ ان کی دلچسپی کم ہو گئی تھی تاہم وہ سب ایڈیٹروں اور رپورٹروں سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اچھے دنوں میں تو یوں بھی ہوتا کہ وہ سات بجے شام کو گھر گئے ہیں اور کوئی اہم خبر آ گئی تو یا تو خود دفتر آ جاتے اور لیٹ نائٹ تک کام کرتے یا پھر گھر سے میٹر تیار کر کے یا تو فیکس کر دیتے یا چپراسی بلا کر اس کے ہاتھ بھجوا دیتے۔ ڈیسک پر ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور مجھے اس اعتراف میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ البتہ ان کی صحافت بعض اوقات یک رخی ہو جاتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کشمیر کے بارے میں اور پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ چیزیں دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان کی انسانی خوبیوں کا مشاہدہ میں نے قومی آواز میں کیا۔ جس دن تنخواہ ملتی تھی وہ ایک ایک کے بارے میں معلوم کرتے تھے اور اگر یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں شخص نہیں آیا ہے تو اس کی تنخواہ منگوا کر اس کے علاقے کے کسی شخص سے بھجوا دیتے اور یہ کہتے کہ اس کو ضرورت ہوگی۔ میں نے خود دو ایک بار لوگوں کی تنخواہیں، چراغی صاحب کے کہنے پر، ان کے گھر پہنچائی ہیں۔ عموماً تنخواہ کے روز ڈیسک پر ان کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ کام کر رہے ہوتے اور لوگ اپنی تنخواہیں سنبھالنے میں لگے رہتے۔ جوں ہی کوئی کارکن دفتر میں گھستا خواہ وہ تاخیر سے ہی کیوں نہ آ رہا ہو اس سے فوراً کہتے ارے جاؤ پہلے تنخواہ لے لو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کئی لوگ بوقت ضرورت ان سے قرض لیتے جسے وہ تنخواہ کے روز وصول کر لیتے۔ لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھتے کہ کسی کو اس قرض اور اس کی ادائیگی کے بارے میں کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔

قومی آواز بند ہونے کے بعد ہم لوگ ان سے ملنے جب بھی ان کے گھر جاتے وہ باتوں

باتوں میں یہ ضرور پوچھتے کہ دفتر بند ہونے پر معاوضے کے طور پر جو پیسے ملے تھے ان کا تم نے کیا کیا۔ کسی بہتر اور محفوظ جگہ پر ان کا استعمال کیا یا یوں ہی اڑا دیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دہلی سے باہر ہے اور وہاں سے بذریعہ فون ان کی خیریت دریافت کر رہا ہے اور ان کو پتہ چل گیا کہ وہ بیرون دہلی سے فون کر رہا ہے تو ڈانٹ دیتے کہ وہاں سے فون کر کے کیوں اپنا پیسہ برباد کر رہے ہو، جب یہاں آنا تب معلوم کر لینا۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اگر کسی سے لڑائی ہوئی ہے، جو کہ عموماً ہوتی رہتی تھی، تو وہ زیادہ دن بغیر بولے نہیں رہ پاتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے اس سے ضرور بات کرتے تھے۔ بعض اوقات تو کچھ لوگ ان سے بدتمیزی سے بھی پیش آجاتے اس کے باوجود وہ زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہتے۔

بہرحال موہن چراغی ایک ایسے صحافی تھے جن کی زندگی ہجرت میں گزری۔ البتہ انھوں نے قومی آواز کے علاوہ کسی اور اردو اخبار میں ملازمت نہیں کی۔ انھوں نے حالات کے جبر کے آگے جھکتے ہوئے کشمیر کو خیر باد کہا تھا اور دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن وہ یہاں اپنا کوئی گھر نہیں بنا سکے۔ پہلے سرکاری فلیٹ میں رہے۔ پھر کرائے کے فلیٹ میں اور پھر اپنی بیٹیوں کے فلیٹ میں رہتے رہے۔ پیدا کشمیر میں ہوئے، کرم بھومی دہلی کو بنایا اور آخری سانس کلکتہ میں لی۔ جہاں ان کی بھی سسرال ہے اور ان کی بیٹی کی بھی۔ ان کی موت پر جو پہلا جملہ میری زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ آج صحافت کا چراغ گل ہو گیا۔

◆◆◆

محمد سلیمان صابر

محمد سلیمان صابر 15 جنوری 1914 کو دہلی سے متصل ضلع غازی آباد کے مردم خیز قصبہ پلکھوا میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 6 اکتوبر 1999 کو دہلی میں ہوا۔ وہ ملک کے مایہ ناز صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کے خاندان سے تھے۔ دونوں میں خاندانی اعتبار سے بھائی کا رشتہ تھا۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط کی بہت سی خوبیاں سلیمان صابر میں بھی تھیں۔ وہ بھی ایک جرأت مند اور بے باک صحافی تھے۔ جنگ آزادی کی تحریک کے دوران جو نامور صحافی ابھرے ان میں ایک نام سلیمان صابر کا بھی تھا۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط کی مانند ان کے اندر بھی حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مولانا فارقلیط نے تقسیم ہند سے قبل کراچی اور لاہور کے روزناموں میں کام کیا تھا لیکن تقسیم کے بعد وہ ہندوستان آگئے اور 25 سال تک روزنامہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر رہے۔ سلیمان صابر نے ان کے ساتھ کافی عرصہ گزارا تھا اس لیے ان کی شخصیت پر ان کی گہری چھاپ تھی۔

ابتدائے عمر میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور متعدد بار جیل بھی گئے تھے۔ وہ 3 مارچ 1941 کو آگرہ جیل سے رہائی کے بعد دہلی آگئے اور اس کی سرزمین کو اپنے لیے میدان عمل بنالیا۔ یہاں انھوں نے اخبار انصاری میں کام کیا۔ اس کے بعد اخبار الجمعیۃ میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ 1947 کے پرآشوب دور میں انھوں نے دہلی سے شائع ہونے والے اخبار جنگ میں بھی کام کیا تھا۔ تقسیم کے بعد میر خلیل الرحمٰن اس اخبار کو کراچی پاکستان لے کر چلے گئے۔ انھوں نے سلیمان صابر سے درخواست کی کہ وہ کراچی چل کر اخبار میں کام کریں اور مدیر کی ذمہ داری سنبھالیں۔ لیکن چونکہ سلیمان صابر ایک

محبِ وطن تھے اور قوم پرستانہ خیالات رکھتے تھے اس لیے انھوں نے پاکستان جانے سے انکار کردیا۔

دہلی میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں انھوں نے ملٹری انجینئرنگ سروس (ایم ای ایس) میں ایک سینئر انسپکٹر کی حیثیت سے بھی ملازمت کی تھی۔ 1980 میں الجمعیۃ سے سبکدوش ہوگئے اور غالباً 85 یا 86 میں روزنامہ قومی آواز کی ایڈیٹوریل ٹیم میں شامل ہوگئے۔ وہاں انھوں نے بطور چیف سب ایڈیٹر (شفٹ انچارج) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ قومی آواز سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے اخبار ''جریدہ ترجمان'' میں بطور ایڈیٹر ملازمت کی اور تاحیات اس میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جریدہ ترجمان میں انھوں نے اپنی تمام تر صحافتی صلاحیتیں استعمال کیں اور جریدہ کو ایک اچھا اور معیاری اخبار بنادیا۔ یوں تو وہ ایک مذہبی جماعت کا آرگن ہے اور اس میں زیادہ تر مذہبی مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن سلیمان صابر نے ''آئینۂ ایام'' کے عنوان سے ایک کالم شروع کیا جس کے تحت سیاسی مضامین شائع کیے جاتے۔ اس عنوان کے تحت زیادہ تر مضامین وہ خود ہی لکھتے۔ لیکن باہر سے آئے سیاسی مضامین بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کا خیال رکھتے کہ یہ مضامین معیاری ہوں۔ غیر معیاری مضامین کی اشاعت نہیں کرتے تھے۔

سلیمان صابر ایک مجاہد آزادی اور محبِ وطن شہری تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے زبردست مبلغ بھی تھے۔ وہ اپنی تحریروں سے قومی اتحاد کو فروغ دینے کی تاحیات کوشش کرتے رہے۔ ان کی صحافت نگاری ان جذبات سے مملو ہے جو مجاہدین آزادی کے دلوں میں موجزن تھے۔ جب بھی ملک میں کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتا وہ کھل کر اس کی مخالفت کرتے اور فسادیوں کو سخت سے سخت سزا دینے کا حکومت سے مطالبہ کرتے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک امن پسند شہری اور قانون کی پابندی کرنے والے صحافی کی حیثیت سے گزاری۔ انھوں نے تقسیم ملک کے وقت کے پر آشوب حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا جن کا ان کی زندگی پر بھی اثر رہا اور ان کی تحریروں پر بھی۔ انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں ان خوں چکاں واقعات کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے آزادی کے فوراً بعد ملک کے مختلف حصوں میں بھڑکے فسادات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے 1947 میں دہلی میں بھڑکے فسادات کا بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات یہاں پیش کیے جارہے ہیں تاکہ ان کے جذبات کی بھی عکاسی

ہو سکے، ان کی صحافت نگاری کی بھی اور اس وقت کے حالات کی بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"دہلی میں فساد کا سلسلہ 4 ستمبر 1947 سے شروع ہوا اور جب 5 ستمبر 1947 کو فتح پوری مسجد میں بم پھینکا گیا تو حالت اور خراب ہوگئی اور خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ پہاڑ گنج، قرولباغ اور سبزی منڈی وغیرہ کے علاقے مسلمانوں سے خالی ہو گئے اور دوسرے محلوں سے بھی لوگ بڑی تعداد میں اپنے وطن کو خیر باد کہنے لگے، بلیماران، احاطہ کالے صاحب اور پھاٹک پنجابیان جیسے گنجان آباد علاقے بھی خالی ہو گئے اور گھروں کا سامان سڑکوں پر آ گیا اور کوڑیوں کے مول فروخت کیا جانے لگا اس میں فرنیچر، کراکری کا سامان اور برتن تک شامل تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا ہر شخص کو بھاگنے کی فکر تھی، جس شہر میں لوگ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اسی شہر کے درودیوار انھیں اب اجنبی نظر آرہے تھے۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ مسلمانوں میں حوصلہ پیدا کیا جاتا، ان کا ڈر خوف دور کیا جاتا اور انھیں باور کرایا جاتا کہ ان کے اپنے وطن میں ان کا مستقبل تاریک نہیں ہے، نیز یہ کہ کروڑوں کی تعداد میں سب لوگوں کا ترک وطن کرنا ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے انھیں یہیں رہ کر حالات کا مقابلہ کرنا اور اپنا مستقبل بنانا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن جو اس وقت جمعیۃ علما کے ناظم عمومی تھے دوسرے قومی ورکروں کی مدد سے مسلمانوں کو فساد زدہ علاقوں سے بہ حفاظت نکالنے کے لیے کوشاں تھے، وہ تقریباً روزانہ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے ملتے اور انھیں حالات سے باخبر کرتے لیکن صورت حال سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ حالات اس حد تک خراب ہوئے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم جمعیۃ علما اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ان کے متعدد کانگریسی دوستوں نے جو ذمہ داری کے عہدوں پر فائز تھے، مشورہ دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمایوں کے مقبرہ چلے جائیں جہاں ان کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ یہی ہمایوں کا مقبرہ تھا جہاں ترک وطن کرنے والے مسلمانوں کے لیے کیمپ بنا دیا گیا تھا اور وہیں سے انھیں ریل گاڑیوں کے ذریعہ پاکستان پہنچایا جا رہا تھا، جمعیۃ علما کے ان دونوں رہنماؤں نے اپنے ہمدرد کانگریسی دوستوں کا مشورہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ہم سوائے خدا کے کسی طاقت سے ڈرنے

والے نہیں ہیں ہم یہیں شہر میں رہیں گے اور اگر ضروری ہوا تو حق وانصاف کی خاطر اپنی جان قربان کردیں گے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور دیگر مسلم رہنماؤں کے عزم واستقلال اور جرأت وہمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان فرقہ پرست عناصر کے حوصلے پست ہوگئے جو اس ملک کی راجدھانی سے مسلمانوں کا بالکل صفایا کردینا چاہتے تھے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور چوٹی کے دوسرے کانگریسی رہنماؤں کی مستقل تقریروں سے جو گاندھی گراؤنڈ اور رام لیلا گراؤنڈ کے علاوہ کبھی کبھی اندرون شہر بھی ہوتی تھیں حالات کے روبہ اصلاح ہونے میں مدد ملی۔ ان تقریروں میں امن کے دشمنوں کو تنبیہ کی جاتی تھی اور اخلاقی اور مذہبی طور سے بھی انھیں خوف دلایا جاتا تھا۔ حوض قاضی پر ایک دن جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے فرقہ پرستوں کو للکارتے ہوئے توجہ دلائی کہ جمنا میں تباہ کن سیلاب کی بڑی وجہ بدامنی اور ظلم وتشدد ہے جو بند ہونا چاہیے۔ فرقہ پرستی کی آگ کے شعلے بجھتے نظر آنے لگے اور مسلم رہنماؤں کو سوچنے سمجھنے اور اپنے مستقبل کا پروگرام بنانے کا موقع ملا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی تقریر جامع مسجد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ہوئی جس میں انھوں نے مسلمانوں کو مفید مشورے دیے اور انھیں بتایا کہ آزاد ہندوستان میں وہ کس طرح باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔ ادھر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن نے جمعیۃ علما کے ترجمان اخبار ''الجمعیۃ'' کے اجرا کا پروگرام بنایا جو انگریزی حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی بنا پر 9 برس سے بند تھا۔ مولانا مرحوم نئے حالات میں اخبار کو بے حد ضروری سمجھتے تھے کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ مسلم اخبارات جن میں سے بیشتر مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے حامی تھے سب پاکستان ہجرت کر چکے تھے یا بند ہوگئے تھے۔ دلّی میں لے دے کر دو بڑے اخبارات تھے، ''جنگ'' اور ''انجام''۔ دونوں کے مالکان ترک وطن کر کے کراچی پہنچ گئے اور وہیں سے اپنے اخبارات نکالنے شروع کردیے۔ مسلمانوں کا کوئی ایسا اخبار نہ رہ گیا تھا جو ان کی رہنمائی کرسکتا اور ان کی ڈھارس بندھا سکتا۔ اسی بنا پر مولانا حفظ الرحمٰن نے الجمعیۃ کی اشاعت کا انتظام بہت پہلے یعنی جون 1947 ہی میں راقم الحروف کے سپرد

کر دیا تھا۔ لیکن بہت سے مسائل اشاعت کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ایڈیٹر ہی کا تھا مولانا چاہتے تھے کہ اخبار نکلے تو ایڈیٹر بھی کوئی ایسا پختہ کار اور حوصلہ والا ہو جو مسلمانوں میں تقسیم کے اندوہناک نتائج کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی روح پھونک سکے۔ نمونہ کے پرچہ میں جو جون ہی میں چھپ گیا تھا (لیکن بازار میں نہیں آیا) مولانا بدر جلالی مرحوم نے اداریہ قلمبند کیا تھا۔ مولانا جلالی بڑے پرانے تجربہ کار اور منجھے ہوئے ایڈیٹر تھے۔ ''مدینہ'' بجنور اور متعدد دوسرے اخبارات سے وابستہ رہ چکے تھے، لیکن ان کی زبان مشکل اور دقیق ہوتی تھی اور طول نویس بھی تھے۔ ''الجمعیۃ'' میں تقریباً تین کالم کا اداریہ لکھا جسے شاید مولانا حفظ الرحمٰن نے اس وقت کے حالات کے مطابق نہ سمجھا اور اپنے مطلب کے ایڈیٹر کے لیے انتظار کرتے رہے۔ میں نے مولانا کو توجہ دلائی کہ کیوں نہ مولانا محمد عثمان فارقلیط سے رجوع کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ وہ اس موقع پر ''الجمعیۃ'' کی ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مولانا فارقلیط بہت سیدھے سادے اور سادہ مزاج انسان تھے لیکن ان کا قلم بڑا جوشیلا تھا اور وہ اپنی شعلہ بیانی کے لیے ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ لاہور سے آنے تک ''زمزم'' میں اپنے سخت لب ولہجہ میں جو کچھ لکھ رہے تھے اس سے حکومت کی پوری مشینری پریشان تھی۔ کسی اور کو اس جرأت و بے باکی کے ساتھ اظہار خیال کی ہمت نہ ہو سکتی تھی۔ مجاہد ملت نے مجھے ان کے پاس بھیجا اور راقم نے مولانا کی طرف سے انھیں ''الجمعیۃ'' کی ادارتی ذمہ داریاں قبول فرمانے کا پیغام پہنچایا۔ مولانا نے چونکہ ابھی تک ''زمزم'' لاہور سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا تھا اور ادھر سے بلاوا بھی آرہا تھا، اس لیے انھیں ابتدا میں تامل ہوا لیکن پھر انھوں نے محسوس کیا کہ چونکہ لاہور اب اس ملک کا حصہ نہیں رہا ہے اس لیے ترک وطن کرنے کے بجائے ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن میں رہ کر ہی اپنی صحافیانہ ذمہ داریوں کو پورا کریں اور مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے میں اپنا کردار ادا کریں، جو حالات سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں ترک وطن کر رہے تھے یوں بھی ادارہ الجمعیۃ کے ساتھ ان کی وابستگی ان کے لیے کشش کا باعث تھی کیونکہ اس اخبار سے ان کا پرانا تعلق رہا تھا اور ایک مرتبہ پھر اسی اخبار میں انھیں اپنے قلم کی

جولانیاں دکھانے کا موقع مل رہا تھا۔ انھوں نے ادارتی ذمہ داریاں سنبھالنے کی منظوری دے دی اور وہ ''الجمعیۃ'' کے ساتھ وابستہ ہو گئے''۔

قومی آواز سے سبکدوشی کے بعد جب سلیمان صابر نے مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے آرگن ''ترجمان'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تو انھوں نے اس رسالے میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کی خودنوشت یادداشتیں قسط وار شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ اخبار الجمعیۃ میں شائع ان کے اداریوں کو بھی کبھی کبھار شائع کرتے۔ مولانا فارقلیط الجمعیۃ سے سبکدوشی کے بعد کئی سال تک حیات رہے اور اس دوران وہ دیگر اخباروں کے ساتھ ساتھ جریدہ ترجمان کے لیے بھی مضامین لکھتے جنھیں بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا اور لوگ دلچسپی سے پڑھتے۔

سلیمان صابر کے اندر صحافیانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ جن کا بھرپور مظاہرہ اخبار قومی آواز میں ہوا۔ انھوں نے بطور شفٹ انچارج وہاں قابل ذکر خدمات انجام دی تھیں۔ خبروں کے انتخاب کا انھیں بڑا سلیقہ تھا اور حالات کی نبض پر ان کی انگلی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کون سی خبر اہم ہے کون سی نہیں اور یہ کہ کس خبر میں قارئین کی دلچسپی ہوگی اور کسے وہ رد کردیں گے۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی تھے۔ بطور شفٹ انچارج بھی وہ خوب کام کرتے کام سے جی نہیں چراتے۔ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھے اور زبان و بیان پر بھی انھیں بھرپور قدرت حاصل تھی۔

سلیمان صابر نے کئی ملکوں کا دورہ کیا تھا۔ 1962 میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ امریکہ اور یوروپ کے دورے پر جانے والی ٹیم میں بھی وہ شامل تھے۔ واپسی پر انھوں نے اپنے مشاہدات قسط وار لکھے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں وہ پاکستان گئے تھے۔ انھیں مولانا ابوالکلام آزاد سے والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ ان کی خدمات کے زبردست معترف تھے۔

◆◆◆

محمد کاظم

محمد کاظم 1930 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور 5 جولائی 2013 کو دہلی میں انتقال ہوا۔ وہ ایک بااصول صحافی تھے۔ زندگی بھر انھوں نے صحافتی اصولوں کا تحفظ کیا۔ انھوں نے ان اصولوں سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا خواہ اس سے ان کو نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑا۔ وہ ایک خوددار طبیعت کے مالک تھے اور محنت پسند صحافی تھے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر بھی وہ جسمانی اور دماغی مشقت سے کام لیتے رہے۔

محمد کاظم نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے سینٹ جوزف اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ بعد میں وہیں سے انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم میں ڈپلوما کیا۔ اس کے بعد ہی وہ صحافت میں آ گئے۔ ان کی صحافت کا آغاز انگریزی زبان میں ہوا۔ بعد میں وہ اردو صحافت میں آ گئے۔ سب سے پہلے انھوں نے 1972 میں انگریزی کے ایک ماہنامہ ''اپیل انڈیا'' میں کام کیا۔ صرف کام ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس رسالہ کے مدیر کی ذمہ داری بھی انجام دی۔ وہ دو سال تک اس جریدے کے ایڈیٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد 1974 میں ایک اور انگریزی اخبار انھوں نے جوائن کیا۔ یہ بھی ہفت روزہ تھا اور اس کا نام ''ماؤنٹ ریویو'' تھا۔ وہ اس کے بھی مدیر ہوئے اور 1978 سے 1979 تک اس ذمہ داری پر فائز رہے۔ اس کے بعد ''رُجحان نیوز سرویز'' سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد وہ دہلی آ گئے اور (POT) نیوز سرویز، دہلی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ جب دہلی میں اردو روزنامہ ''قومی آواز'' 1980 میں جاری ہوا تو انھوں نے اپنی خدمات اردو صحافت میں منتقل کر دیں۔ انھیں بھی اس کی ادارتی ٹیم میں شامل کیا گیا۔ وہاں وہ

مختلف عہدوں پر فائز رہے اور 1991 میں چیف رپورٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

اس کے بعد بھی ان کی سرگرمیاں ٹھپ نہیں ہوئیں۔ وہ اپنی عمر کے طویل ترین تجربے سے صحافت کو چار چاند لگاتے رہے۔ ان کا نڈر اور بے باک قلم بغیر کسی مصلحت کے رواں دواں رہا۔ وہ 1978 سے ''آل انڈیا اردو سروسز'' اردو نیوز اور نیشنل چینل پر تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی پارٹ ٹائم کام کرتے رہے۔ جب دہلی میں خبر رساں ایجنسی یو این آئی کی اردو سروس کا آغاز ہوا تو اس میں بھی انھوں نے پارٹ ٹائمر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جب تک ان کے جسم و جان اور دل و دماغ نے ان کا ساتھ دیا انھوں نے یو این آئی اردو سروس کو نہیں چھوڑا اس میں کام کرتے رہے۔ اردو اکادمی، دہلی نے محمد کاظم کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں 2011 میں ''ایوارڈ برائے اردو صحافت'' پیش کیا تھا۔

◆◆◆

مستحسن فاروقی

ماہنامہ آستانہ اور ہفت روزہ پیام مشرق کے ایڈیٹر صاحبزادہ مستحسن فاروقی اتر پردیش کے علمی مرکز دیوبند میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں وہ دہلی چلے آئے۔ انھوں نے 1964 میں ماہنامہ رسالہ ''آستانہ'' شروع کیا۔ جس میں دینی، تبلیغی و اصلاحی مضامین نئے انداز میں شائع ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ پرچہ مقبولیت کی بلندی پر پہنچ گیا اور اس کی سرکولیشن معتبر ذرائع کے مطابق 90 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 1954 میں ہفت روزہ ''پیام مشرق'' جاری کیا۔ اس میں ادبی، اصلاحی، سیاسی اور تنقیدی مضامین ہوتے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے عبدالحمید سے ماہنامہ ''مولوی'' خرید لیا اور اسے بھی اپنی ادارت میں شائع کرنے لگے۔

مستحسن فاروقی کے یہ رسالے خوب مقبول ہوئے۔ اس وقت ان کے دفتر میں ملازموں کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی تھی جس میں ٹائپسٹ، کلرک اور چپراسی وغیرہ شامل تھے۔ ان جرائد کے ادارتی شعبے میں ملک کے ممتاز ادیب اور قلم کار شامل تھے جیسے کہ عبدالباقی خاں سابق انفارمیشن آفیسر حکومت مشترکہ پنجاب، مولانا مفتی زاہد القادری، سید مہدی نظمی، ناز انصاری، حیرت رامپوری، مولانا ضیاء القادری بدایونی، مولانا شبیر عثمانی، علامہ رضی بدایونی اور اشرف بھوپالی وغیرہ۔

فاروقی صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ ہر شادی پہلی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد کی۔ چاروں سے اولاد ہوئیں اور سب کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم سے مزین کیا۔ 14 مارچ 1980 کی شب میں دہلی کے پنت اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے ساتھ ایک طویل مدت تک کام کرنے والے علامہ رضی بدایونی کے مطابق سعی بسیار کے باوجود مستحسن فاروقی کی تاریخ پیدائش کا

علم نہیں ہوسکا۔ ایک اندازے کے مطابق انتقال کے وقت ان کی عمر 65 اور 75 کے درمیان تھی۔
ان کے انتقال کے بعد ان کی آخری شریک حیات بیگم ریحانہ فاروقی ماہنامہ آستانہ چلا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ پیام مشرق بھی نکال رہی ہیں۔ وہ 33 سال سے اس کی ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ابتدا میں چھوٹے چھوٹے افسانے لکھ کر وہ پیام مشرق میں ناز انصاری کے پاس بھیج دیتی تھیں۔ جو ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے کتابت میں دے دیتے تھے۔ انھوں نے ناز انصاری کے مشورے سے مضامین لکھنے شروع کیے اور اس بارے میں ان کی قیمتی مشورے ان کے بہت کام آئے۔

مستحسن فاروقی بے سروسامانی کے عالم میں دہلی آئے تھے۔ لیکن اپنی جدوجہد، مستقل مزاجی اور بے انتہا محنت کے نتیجے میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے اخبار الامان اور وحدت میں دس روپے ماہانہ پر خریداروں کے پتے لکھنے کا کام کیا۔ بعد میں انھوں نے ہفت روزہ اسلامی دنیا، دین دنیا اور عادل میں بھی پتے لکھے۔ یہ رسالے مفتی شوکت علی فہمی نکالتے تھے، دین دنیا اب بھی نکلتا ہے اور مفتی صاحب کے بیٹے آصف فہمی نکالتے ہیں۔ ان دنوں میں ان کا یہ وتیرہ تھا کہ روزانہ صبح اٹھ کر حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر جاتے پھر حضرت خواجہ شیخ کلیم اللہ کی درگاہ پر حاضری دیتے۔ یہ درگاہ لال قلعہ پریڈ گراؤنڈ میں واقع ہے۔

اسی دوران انھوں نے ایک حکیم کے ساتھ مل کر دواخانہ کھولا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا۔ پہلے وہ دری پر بیٹھ کر ایک چھوٹے کمرے سے کام کرتے تھے بعد میں میز کرسی آئی اور ایک بڑے ہال میں کام ہونے لگا۔ اوائل 1946 میں درگاہ کلیم اللہ کے سجادہ نشین عبدالغنی مع اہل وعیال پاکستان ہجرت کر گئے۔ انھوں نے درگاہ کے انتظام وانصرام کا کام فاروقی صاحب کے سپرد کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ ان کی بند تقدیر کا دروازہ کھل گیا۔ پہلے تو انھوں نے درگاہ اور اس سے متصل مسجد کی مرمت اور تزئین کاری کروائی اور پھر وہیں سے آستانہ کلیمی کی نسبت سے ماہنامہ ''آستانہ'' جاری کیا۔ ان کی محنت لگن اور ریکھ دیکھ کے نتیجہ میں درگاہ پر زائرین کی تعداد بڑھنے لگی۔ وہاں ہونے والے اعراس میں شرکت کرنے والوں میں صدر جمہوریہ وی وی گری، ڈاکٹر ذاکر حسین، فخرالدین علی احمد، نیلم سنجیوا ریڈی، جسٹس ہدایت اللہ اور گیانی ذیل سنگھ جیسی شخصیات قابل ذکر ہیں۔

فاروقی صاحب رسالوں کے ساتھ ساتھ دواخانے کا بھی کام کرتے رہے۔ پہلے انھوں نے

اس کا نام انڈو جرمن کیمیکل ورکس رکھا تھا۔ مگر جب دوسری عالمی جنگ کے موقع پر لفظ جرمن پر اعتراضات ہونے لگے اور اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو انھوں نے کمال ہوشیاری کے ساتھ اس کا نام ''انڈو جینوئین کیمکل ورکس'' کر دیا۔ ان کے رسالوں میں دواخانے کے اشتہارات بھی شائع ہوتے تھے۔ گویا دواخانہ اور رسالے دونوں ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہو گئے۔

1946 میں جب ملک میں عارضی حکومت قائم ہوئی تھی اس وقت احمد آباد سے ایک ماہنامہ ''دین'' شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر اور مالک کے۔ چندر یگر تھے جن سے فاروقی صاحب کے قریبی مراسم تھے۔ انھوں نے چندر یگر کے توسط سے آستانہ کے لیے نیوز پرنٹ کا کوٹہ حاصل کر لیا جو ان دنوں بہت مشکل کام تھا۔ پھر تو آستانہ کے سامنے پورا آسمان پرواز کے لیے موجود تھا۔ وہ بتدریج ترقی کرنے لگا اور 90 ہزار کی سرکولیشن تک پہنچ گیا۔ جلد ہی انھوں نے ان جرائد کے ذریعے دیگر کاموں میں بھی ہاتھ ڈالا۔ جیسے کہ غزالہ جیولری میوزیم، ناولٹی امپوریم، قمر کشیدہ کاری، رعنا دوپٹہ اسٹور، دار الفرقان، قرآنی نقش اعظم اور آستانہ بک ڈپو وغیرہ۔

◆◆◆

ناز انصاری

اغفار احمد ناز انصاری سہارنپور، اتر پردیش میں علما کے ایک معزز گھرانے میں 25 اگست 1924 کو پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال 8 جون 1992 کو فریضۂ حج کی ادائیگی کے دوران میدان عرفات میں ہوا اور ان کی تدفین مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلی میں ہوئی۔ ان کا خاندان 1857 میں پنجاب کے جھجھر سے ترک وطن کر کے سہارنپور میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ پردادا حافظ قمرالدین صاحب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا اور بانیان مظاہر علوم سہارنپور میں سے تھے۔ ان کے دادا نے تحریک خلافت، کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند کی تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور جیل گئے۔ ناز انصاری کی ابتدائی تعلیم اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور میں ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے اور اردو آنرس کیا۔

ناز انصاری نے ایک مختصر سی خودنوشت تحریر کی تھی جس میں انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں اخبار نویسی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہفت روزہ ''شفق''، جو قلمی تھا اور کاربن کے ذریعے تیار ہوتا تھا شروع کر دیا تھا۔ 1930 میں ہائی اسکول پاس کرتے ہی ایک ادبی ماہنامہ ''چاند'' شروع کیا۔ اسی زمانے میں ایڈورڈ ہشتم اور مسز سمپسن کے معاشقہ پر پہلی کتاب ''پریم پجاری'' شائع کی۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کے فیصلہ کے باعث یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ 1941 میں ایک دوست کے تعاون سے ماہنامہ ''چاند'' پھر زمانۂ طالب علمی ہی میں دوبارہ شروع کیا جس کا سلسلہ 1942 میں پھر منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف اخبارات و رسائل جن میں روزنامہ ''تریاق'' لاہور، ''تیج''، دہلی، ''زمزم'' لاہور، ''انصاری'' دہلی، ہفت روزہ ''صداقت، محافظ، چترا، نیرنگ خیال اور خضر راہ

وغیرہ میں کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی مضامین اور افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ 10 مارچ 1947 کو باضابطہ روزنامہ ''انصاری'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یکم نومبر 1948 کو روزنامہ ''الجمعیۃ'' 15 جولائی 1951 کو روزنامہ ''نئی دنیا'' 14 مئی 1954 کو ہفت روزہ ''پیام مشرق'' اگست 1962 میں ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لکھنؤ اور 20 جنوری 1963 کو ہفت روزہ ''پرچم ہند'' دہلی سے وابستہ رہا۔ 22 ستمبر 1964 کو شیخ محمد عبداللہ کے اخبار ''محاذ'' ویکلی سری نگر میں شامل ہوا۔ پھر دہلی آ کر یکم ستمبر 1965 کو روزنامہ ''تیج'' سے وابستہ ہوگیا۔ یکم اگست 1947 کو روزنامہ ''الجمعیۃ'' میں آ گیا۔ یکم ستمبر 1978 کو اس کا ایڈیٹر بنا اور 28 جنوری 1985 تک اس کے بند ہونے تک اس عہدے پر فائز رہا۔ 22 مارچ 1985 سے 11 ستمبر 1987 تک روزنامہ ''مشرقی آواز'' دہلی و گورکھپور کا چیف ایڈیٹر رہا۔ 1990 میں روزنامہ ''انتباہ جدید'' شروع کیا۔

انھوں نے اپنی کتاب ''اردو صحافت'' میں جو کہ غالباً دسمبر 1985 میں شائع ہوئی تھی لکھا ہے کہ ''میں اس دشت (صحافت) کی سیاحی میں یا اس کی گلگشت میں اپنی عمر عزیز کے پچاس برس گزار چکا ہوں۔ میری جوانی کی حسین راتیں اس دشت نوردی میں اس طرح گزری ہیں کہ آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ہندوستانی سیاست وصحافت کے صدہا واقعات پر مشتمل ایک فلم دماغ کے پردۂ سیمیں پر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن پروردگار عالم کا شکر ہے کہ کسی سعدی کو میرے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی:

چہل سال عمر عزیزت گزشت
مزاج تو آں حال طفلی نہ گشت

جب اس میدان میں آیا تھا تو سبزہ آغاز تھا۔ اب یہ سطریں سپرد قرطاس کر رہا ہوں تو فخر وامتنان کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بال صحافت کے میدان میں یوں ہی سفید نہیں ہو گئے۔ میں نے اپنی صلاحیت واستعداد سے زیادہ نام پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ:

مر جاؤں تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر کو سنوارا ہے اور اپنے ملک کی آزادی اور تعمیر نو میں پورا پورا حصہ لیا ہے، تعاون کیا ہے اور صحافت کے میدان میں بھی اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ میرا دامن صحافت وسیاست کے ایسے صدہا واقعات سے مالا مال ہے کہ اگر کبھی وقت ملا اور وہ نوک قلم

پر آئے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے مطالعہ میں کوئی بے لطفی محسوس نہیں کرے گا بلکہ اسے کچھ نئے حقائق اور انکشافات ملیں گے۔ مگر اس سے شاید اردو زبان وادب میں ایک کتاب کا تو اضافہ ہو جائے گا لیکن وہ اردو ادب وصحافت کی کوئی ٹھوس خدمت نہیں ہوگی۔ میری تجویز ہے کہ سرکاری یا غیر سرکاری کسی بھی سطح پر سرکردہ اردو صحافیوں کا ایک بورڈ قائم کیا جائے اور اردو صحافت کی ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا تیار کی جائے جو اس کی تاریخ، خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہو اور آئندہ نسلیں اس پر فخر کریں اور دوسری زبانوں کے صحافی اس کی تقلید کریں"۔

ناز انصاری باضابطہ طور پر صحافت میں آنے سے قبل بقول سلیمان صابر" کوئٹہ بلوچستان سے ایران کی سرحد تک جانے والی ریل گاڑی میں گارڈ تھے اور اخبار" انصاری" میں مضامین بھیجا کرتے تھے"۔ ایک بار ایک انگریز افسر نے ان سے شراب کے لیے رشوت مانگی اور انھوں نے اسی وقت ریلوے کی ملازمت کو لات ماردی اور پھر محکمے پر اپنے بقایاجات کا کبھی مطالبہ بھی نہیں کیا۔

ناز انصاری ایک صاحب طرز صحافی تھے۔ وہ صحافت کی جس ڈگر پر زندگی بھر چلتے رہے اسے انھوں نے خود ہی منتخب بھی کیا تھا اور اپنی سعی وجد وجہد سے اسے غیر معمولی طور پر ابھارا، نکھارا اور سنوارا تھا۔ انھوں نے خبروں کو اردو کا لباس بھی پہنایا اور خبروں کی صورت گری میں کبھی کھل کر اور کبھی پس پردہ خاصا اہم رول ادا کیا۔ دہلی اور کشمیر میں وہ ایک صحافی کی حیثیت سے، مترجم، مضمون نگار، مبصر اور اداریہ نویس کی حیثیت سے اردو صحافت پر انھوں نے جو اپنے نقش مرتسم کیے ہیں انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ناز صاحب نے مختلف اخباروں کے لیے اپنے نام سے اور گمنام رہ کر بھی مسلسل اداریے، تبصرے اور طنزیہ مضامین لکھے اور ان کا کمال فن یہ تھا کہ ان کی تحریر ہر اخبار کے مزاج کے عین مطابق رہی۔ مختلف ذہن ومزاج کے قارئین کے لیے بیک وقت لکھنا اور اس طرح لکھنا کہ قارئین کا ہر طبقہ اسے پوری طرح اپنی سوچ اور اپنے مزاج سے ہم آہنگ پائے یہ کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ایسا وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھیں اپنی سوچ کی لہروں پر، اپنے قلم پر اور اظہار پر پوری قدرت حاصل ہو۔

ناز انصاری ایک محنت کش صحافی تھے۔ آرام کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ بارہ بارہ گھنٹے تک ان کا قلم چلتا رہتا تھا۔ انھوں نے لکھنے پڑھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ وہ صرف ڈیسک پر ہی کام نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف اجتماعات، جلسوں اور پریس کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وقت بھی

نکال لیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک ایڈیٹر کو محض اپنے کمرے میں ہی بند نہیں ہونا چاہیے بلکہ بیرونی دنیا سے بھی رابطہ قائم رکھنا چاہیے۔ اس سے اس کو ملکی اور غیر ملکی حالات و معاملات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم رکھنے کا ان کا یہی شوق کئی بار انھیں عراق لے گیا اور انھوں نے سعودی عرب کا بھی دورہ کیا۔

ناز انصاری ہر سال ایک ڈائری بھی چھاپا کرتے تھے جس کے لیے انھیں بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ ایسی متنوع ڈائریاں بڑی مشکل سے ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ دنیا بھر کی معلومات ان ڈائریوں میں جمع کر دیتے تھے اور اس کے لیے وہ جس محنت و کاوش سے ریکارڈ جمع کرتے تھے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ریکارڈ رکھنے کا انھیں بڑا شوق تھا۔ ان کی رہائش گاہ پر مختلف ریکارڈوں کے پلندے نظر آتے تھے۔ وہ ایک طرح سے اپنے گھر میں ریکارڈوں اور اخباروں کے پلندوں کے درمیان رہتے تھے۔ اپنے آخری دور میں انھوں نے مشرقی آواز کی ذمہ داری سنبھالی اور اس اخبار میں خود کو اس حد تک غرق کر لیا تھا کہ اپنے گھر ہی کو اس کا دفتر بنا ڈالا تھا۔

ناز انصاری ایک حق گو صحافی تھے۔ وہ مصلحت اندیشیوں سے واقف نہیں تھے جس کا انھیں خمیازہ بھی بھگتنا پڑا اور حق گوئی کی پاداش میں الجمعیۃ کی ادارت سے انھیں معطل بھی کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل اس وقت کے الجمعیۃ کے منیجر محمد افضال الحق قاسمی نے یوں بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ عراق کی دعوت پر حکومت ہند کی طرف سے مولانا اسعد مدنی بحیثیت صدر جمعیۃ علما بغداد گئے بلکہ بھیجے گئے۔ وہاں دیگر مسلم ملکوں کے بھی بہت سے نمائندے موجود تھے۔ اس وقت آسام کے نیلی میں مسلمانوں کے خلاف زبردست فساد ہوا تھا جسے مسلمانوں کی نسل کشی سے تعبیر کیا گیا تھا اور اس پر پوری دنیا میں تنقید ہو رہی تھی۔ بغداد کانفرنس میں بھی اس فساد کی گونج پہنچی جس کا جواب ہندوستانی نمائندوں کو دینا تھا۔ جب پاکستان کے نمائندے نے مسلم نسل کشی کا مسئلہ اٹھایا تو مولانا اسعد مدنی نے اندرا حکومت کی آبرو رکھنے کے لیے کہا کہ وہ تو ایک سیاسی جھگڑا اور مقامی مسئلہ تھا اسے عالمی سیاست میں کیوں لاتے ہیں۔ چونکہ یہ بات صدر جمعیۃ علما اور ایک مقتدر خاندان کے فرد نے کہی تھی اس لیے ہندوستانی حکومت کے خلاف تجویز مسترد کر دی گئی جس سے حکومت ہند بہت خوش ہوئی اور ہندوستانی پریس نے بھی اسے خوب اچھالا۔ پی ٹی آئی کے حوالے سے یہ خبر پورے ملک میں چھپی۔ ناز صاحب نے بھی اس خبر کا ترجمہ کر کے الجمعیۃ میں شائع کر دیا۔ جب میں مرکزی دفتر پہنچا تو مولانا اسعد مدنی واپس آ چکے تھے۔ وہ اس رپورٹ پر بہت برہم تھے۔ میں

نے پوچھا کہ رپورٹنگ غلط ہے یا خبر غلط ہے؟ کہنے لگے کہ اس سے تو ملک بھر میں ہماری رسوائی ہوگی۔ اس کو ہمارے اخبار میں اس طرح نہیں شائع کرنا چاہیے تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا چاہتے تھے کہ اس کی شکل بدل کر اسے شائع کیا جاتا۔ کیونکہ بغداد کا ماحول اور دہلی کا ماحول الگ الگ ہے۔ یہ خبر جب دہلی پہنچی تھی تو مختلف شہروں کے مسلمان حیران تھے کہ مولانا مدنی نے بغداد میں کیسی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ پھر مولانا اسعد مدنی نے من وعن خبر کی اشاعت پر ناز صاحب کو طلب کیا اور ورکنگ کمیٹی بلا کر انھیں معطل کر دیا گیا۔ میرے نزدیک یہ معطلی ایمانداری کے خلاف تھی اور طاقت کا غلط استعمال تھا۔ اس لیے میں نے اختلاف کیا اور ورکنگ کمیٹی سے واک آؤٹ کر دیا۔ پھر وہ معاملہ یونین کے توسط سے پریس کونسل گیا اور اس میں مولانا کے خلاف فیصلہ ہونے ہی والا تھا کہ مولانا نرم پڑ گئے اور میں نے بیچ میں پڑ کر دونوں طرف سے تحریریں لکھوائیں اور معاملہ ختم کرا دیا۔ ناز صاحب پھر ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ لیکن معطلی کے چھ ماہ بعد بھی اس پر آمادہ نہیں ہوئے کہ مولانا اسعد صاحب سے بلاوجہ معافی مانگیں یا خوشامد کریں یا ناکردہ گناہ کا خواہ مخواہ اعتراف کرلیں۔ یہ تھی ناز صاحب کی عظمت۔

بقول نثار احمد زکی تقسیم ملک کے نتیجے میں پورے برصغیر میں ہندو مسلم فسادات نے ناز انصاری کے قلم کو طاقت بخشی تھی۔ ایسے پر آشوب دور میں انھوں نے بڑے ہوش کی باتیں کی ہیں۔ وہ ایک مذہبی اور مجاہد آزادی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے قلم میں مذہب کے دفاع کے لیے بھی بڑی قوت ہے۔ ان کا قلم دہریت اور فرقہ پرستی کے خلاف تلوار کی طرح ضرب لگاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کو کبھی فروخت نہیں کیا اور ہمیشہ حق کی آواز بلند کی۔ صحافی کی حیثیت سے انھوں نے مختلف ملکوں کے دورے کیے تھے۔ انھوں نے عراق، سعودی عرب، سوویت یونین اور پاکستان کا بھی دورہ کیا تھا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ہمراہ 1976 میں سوویت یونین اور 1982 میں سعودی عرب گئے تھے۔ ناز انصاری محض تصورات کی دنیا کے ہی صحافی نہیں تھے۔ بلکہ وہ اس دنیا کے دوسرے تمام مشغلوں اور سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ وہ دہلی کی کئی سماجی اور امداد باہمی تنظیموں کے سرگرم کارکن اور سرپرست تھے۔ وہ دہلی کی اردو صلاح کار کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ ان کی صحافتی خدمات کے عوض دہلی اردو اکادمی نے 1983 میں صحافت کا ایوارڈ دیا تھا۔

ناز انصاری مولانا آزاد کے بہت بڑے مداح اور عقیدت مند تھے۔ وہ مولانا آزاد اسٹڈی

فورم کے سکریٹری تھے۔ میر مشتاق اس کے صدر تھے۔ اس فورم کے تحت ہر سال مولانا آزاد کے مزار پر مولانا کی برسی ہوتی تھی اور ناز صاحب اس سلسلے میں بہت محنت کرتے تھے۔ ان کے پاس مولانا آزاد کی کتابوں اور ان پر لکھی گئی کتابوں اور مقالات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جس میں ان کی موت تک اضافہ ہی ہوتا رہا۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ وہ اگر نہ ہوتے تو شاید ہندوستانی مسلمانوں کا وہی حال ہوتا جو اسپین کے مسلمانوں کا ہوا۔ دہلی اردو اکادمی کے رسالہ ''ایوان اردو'' کے مولانا آزاد صدی نمبر میں ایک مضمون نگار نے بہتان تراشی کی کہ مولانا آزاد شراب نوش تھے۔ ناز صاحب اس مضمون کو پڑھتے ہی بے قرار ہو گئے اور اسی وقت ایک مراسلہ قومی آواز میں شائع کرنے کے لیے بھیجا اور ایڈیٹر اور مضمون نگار سے معافی کا مطالبہ کیا۔ وہ اس بات سے اتفاق کرتے تھے کہ حکومت ہند نے مولانا مرحوم کی خدمات جلیلہ کا صحیح معنوں میں اعتراف نہیں کیا۔

مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ناز انصاری دنیا کے فن میں بالکل کورے تھے۔ حالانکہ مولانا اسعد مدنی کو ان کی طرف سے یہی بدگمانی تھی کہ وہ الجمعیۃ کے رشتے سے مالی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو مرحوم کی زندگی بالکل درویشانہ نہ ہوتی۔ ان کا آخری وقت عبادت و ریاضت کا دور تھا۔ وہ صبح کو میرے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے۔ بغداد کانفرنس (1990) میں شرکت کے لیے جانے والے ہندوستانی وفد میں ناز صاحب اور یہ خاکسار شریک تھے۔ ایک روز میں نے منصور ہوٹل کی کھڑکی سے دیکھا کہ وہ نماز فجر سے پہلے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ان سے پوچھا تو بولے کہ میں فجر کی نماز حضرت شیخ جیلانی کی مسجد میں ادا کرتا ہوں۔ حالانکہ شیخ کی درگاہ ہوٹل سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ کوفہ کی زیارت گاہوں کی زیارت کے موقع پر حضرت امام حسینؓ کے مزار پر بھی ہماری حاضری ہوئی۔ حضرت امام کے مزار پر زائرین کے رونے دھونے کی وجہ سے ایک خاص کیفیت رہتی ہے۔ ناز صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں کہ میں کیا کرتا ہوں کیونکہ ہم دونوں ہی خانقاہوں کے مروجہ رسم و رواج کے خلاف تھے۔ چنانچہ میں عام زائرین (جو شیعہ صاحبان تھے) کے ساتھ مزار پر کھڑے ہو کر تلاوت کرنے لگا۔ ناز صاحب میرے پیچھے سے آئے اور چپکے سے کہنے لگے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور آگے بڑھ گئے۔ ناز صاحب نے اس سفر کے حالات نوٹ کیے تھے لیکن وہ کہیں شائع نہ ہو سکے۔ وہ اپنے مذہبی نظریات میں نہایت پختہ تھے۔

ان کے بڑے داماد بچوں کا گھر دریا گنج کے ایک یتیم تھے۔ لیکن جب وہ پڑھ لکھ کر ہوشیار ہونے لگے تو انھیں اپنی سرپرستی میں لینے والا کوئی نہ تھا۔ ناز صاحب نے مسلم معاشرہ میں جاہلانہ تصورات کے خلاف انھیں اپنی بیٹی دے کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ یہ ناز صاحب کی اس نسبت کا اثر تھا جو ان کے والد کے واسطے سے جماعت ولی اللّٰہی کے مجاہد مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے ساتھ انھیں حاصل تھی۔ یہی نسبت انھیں آخر میں خدا کے گھر (کعبۃ اللہ) لے گئی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا یہ سفر دواعی ہے۔ چنانچہ ناز صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہو گئے جو حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے پہلو میں ان کی اولاد کی طرح آسودۂ رحمت ہیں۔ یہ مکہ معظمہ کا قبرستان جنت المعلیٰ ہے۔

مولانا سید احمد ہاشمی کے بقول ناز انصاری میں زبردست مذہبی و دینی غیرت تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی دین کے خلاف کسی طرح کی کوئی چھوٹ دینے یا مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگر ان کے لیے غصے کا کوئی موقع ہوتا تو یہی ہوتا تھا کہ دین پر یورش ہو رہی ہو یا اسلام کے خلاف کوئی جارحیت ہو رہی ہو تو یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی اور یہی وہ جذبہ تھا کہ اپنی نجی اور ذاتی زندگی میں بھی وہ دین کی اہمیت اور دینی اخلاق پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ قومی مسائل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید سے متاثر تھے اور اسی وجہ سے چاہے وہ قومی مسائل ہوں یا وطنی مذکورہ اکابر کی نگاہوں سے ان مسائل کو دیکھتے تھے اور مستقبل کے ہندوستان کے لیے جن راہوں کی ان اکابر نے نشاندہی کی تھی وہ ہمیشہ ان کی نظر کے سامنے رہتیں۔ ان کے مزاج میں استقلال، مروت، وضعداری اور تعلقات کو نبھانے کی روش کے ساتھ ہی وہ اسلاف کی روایات کو اپنی زندگی کا اثاثہ بنانے کے قائل تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اور قومی، وطنی اور مسلم سیاست کی تاریخ کے مشاہد ہونے کی حیثیت سے ان کی نگاہ میں پچھلی نصف صدی کی تاریخ تھی۔

ناز انصاری کا قلم مختلف الجہات تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر لکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت ایک سے زائد اخباروں میں کام کرتے تھے اور الگ الگ ناموں سے الگ الگ مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن وہ ایسا پیسہ کمانے کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے مجبوراً کرتے تھے۔ شخصی خاکہ لکھنے میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ وہ بہت دنوں تک ماہنامہ بیسویں صدی میں شخصی خاکے اور مشہور کالم تیر ونشتر لکھتے رہے جو کہ رسالے کے

ایڈیٹر خوشتر گرامی کے نام سے چھپتا تھا۔

اردو صحافت میں ان کا نام ایک بلند مقام پر ہے اور یہ مقام شبانہ روز کی محنت شاقہ اور برسوں کی جدوجہد سے حاصل کیا گیا ہے۔ ناز صاحب جس روزنامہ اور جس ہفتہ وار میں رہے اس پر لوگوں نے اعتماد کیا۔

ناز انصاری بچوں کے ادیب بھی تھے۔ عبد القادر بندھولوی کے مطابق ناز انصاری نے بچوں کے لیے کم وبیش پانچ ہزار کہانیاں، متعدد مہماتی ناول اور بے شمار چٹپٹے اور ذائقے دار کامکس بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی سے ہی بچوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں اور 1935 سے 1940 کے درمیان وہ باضابطہ بچوں کا ماہنامہ ''چاند'' سہارنپور سے نکالتے رہے جس میں ہندوستان کے نامور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ قیام دہلی کے دوران بھی انھوں نے بچوں کے کئی ماہنامے نکالے جن میں ماہنامہ ''پھلواری'' کو وہ شہرت حاصل ہوئی جو ''کھلونا'' اور ''پیام تعلیم'' جیسے بچوں کے معیاری پرچوں کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر کہانیاں لکھیں اور ایسی کہانیاں لکھیں جن میں نوے فیصد واقعات ان کے ذاتی مشاہدے اور مطالعے کے تھے۔ انھوں نے سچی اور سبق آموز کہانیاں لکھیں جنھیں پڑھ کر بچوں کی ذہنی نشوونما ہو اور ان کی کردار سازی بھی ہو۔

ناز انصاری نے تقسیم ملک کے وقت کے خوں چکاں واقعات وحادثات کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان پر ان کے اچھے برے اثرات مرتسم بھی ہوئے تھے۔ ان کے اندر ملک وملت کی خدمت کا جذبہ ابتدا سے ہی موجیں مار رہا تھا اور وہ اپنے جذبات کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے کے لیے بے چین تھے۔ صحافت میں قدم رکھنے کے اسباب میں یہ بھی ایک سبب تھا۔ جب وہ الجمعیۃ میں آئے تو وہاں ان کا کام خبروں کا ترجمہ کرنا، سرخیاں لگانا اور مراسلات کی نوک پلک درست کرنا تھا اداریہ نویسی کی خدمت مولانا عثمان فارقلیط ادا کر رہے تھے۔ اس لیے ناز انصاری کسی ایسے بڑے میدان کے متلاشی تھے جہاں وہ اپنے قلم کے ذریعے اپنے خیالات کو عوام تک پہنچا سکیں۔ اتفاق سے 1952 میں مولانا عبد الوحید صدیقی نے الجمعیۃ سے علاحدگی اختیار کر کے بلی ماران دہلی سے ''نئی دنیا'' نام سے اپنا اخبار شروع کیا اور ناز انصاری کو اس اخبار کے وسیلے سے وہ وسیع میدان مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مولانا عبد الباقی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر ناز انصاری تھے۔ مولانا عبد الباقی نے اسی درمیان نئی دنیا سے اپنا تعلق چند ہفتوں

کے لیے منقطع کرلیا تھا۔جس کے بعد ناز صاحب کوایک وسیع میدان مل گیا۔اب ناز انصاری اس کے ایڈیٹر تھے۔ناز انصاری فطری طور پر ایک معصوم انسان تھے اور وضعداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب مولانا عبد الوحید صدیقی کا انتقال ہوا تو انھوں نے ایک مضمون ''مجاہد صحافت مولانا عبدالوحید صدیقی''میں لکھا کہ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں ہے کہ مولانا عبدالوحید صدیقی نے میری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور مجھے ایک عملی صحافی بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔

ایک اور معروف صحافی پروانہ ردولوی اپنے ایک مضمون میں ناز انصاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مجھے ڈیڑھ یا دو سال تک ناز صاحب کی ماتحتی میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ ناز صاحب وقت کے پابند تھے۔ بات سے بات پیدا کرنے اور انگریزی اخبار کی خبروں کو اپنے قارئین کے مزاج کے مطابق بنانے میں وہ مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔مقامی خبروں کو وہ قومی اور بین الاقوامی خبروں سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ سنبھل یا امروہہ کے قاری کو اپنے قصبہ کی نالیوں اور سڑکوں کی بدحالی یا اپنے علاقے کے کسی جیب کترے کی گرفتاری سے جتنی زیادہ دلچسپی ہوسکتی ہے اتنی دلچسپی اقوام متحدہ میں کی گئی کسی تقریر یا جواہر لعل نہرو کے کسی وعدے سے نہیں ہوسکتی۔

ناز انصاری نے دو بڑی تحریکیں بھی چلائیں۔ایک تحفظ ناموس رسول کی تحریک جس نے ''نئی دنیا'' کو ایک بے باک مسلم اخبار کی حیثیت دی اور دوسری تحریک جمعیۃ علما کے انگریزی اخبار ''دی میسیج'' کے خلاف ''اہانت اصحاب رسولؐ'' کی تحریک۔ جب دی میسیج میں شراب کے بارے میں ایک ایسا مضمون شائع ہوا جس کے چھینٹے اصحاب رسولؐ پر بھی پڑتے تھے تو نئی دنیا نے دی میسیج کے اس شمارے کو واپس لینے اور جمعیۃ علما کے زعما کے ذریعے مسلمانوں سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا۔ناز صاحب کی شعلہ فشاں تحریروں کا اتنا اثر ہوا کہ جامع مسجد پر دی میسیج کی ہولی جلائی گئی۔نئی دنیا میں ناز صاحب صرف اداریے اور شذرات ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ افسانے، انشائیے اور علامہ روحانی کے نام سے ایک مزاحیہ کالم'' جام بکف'' بھی لکھتے تھے۔

پروانہ ردولوی مزید لکھتے ہیں کہ 1992 میں ناز صاحب سے ایک دعوت افطار میں ملاقات ہوئی۔ بہت بجھے بجھے نظر آئے۔اب ان کے چہرے پر داڑھی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ماتھے پر سجدے کا نشان زیادہ گہرا ہو گیا تھا اور ان کے شفاف چہرے پر ہمیشہ بکھری رہنے والی مسکراہٹ

ماند پڑ چکی تھی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ میرے مسلک کے حوالے سے وہ ہمیشہ کچھ ہلکے پھلکے فقرے چست کرتے تھے۔ اس ملاقات کے دوران بھی انھوں نے فقرے چست کیے۔ پھر نہ جانے کیوں بہت سنجیدہ اور رنجیدہ ہو گئے اور اچانک کہنے لگے کہ اب بس ایک تمنا یہ رہ گئی ہے کہ موت آئے تو ارض مقدس میں آئے۔ میں نے ہنس کر کہا آمین۔ انھوں نے گھور کر مجھے دیکھا تو میں نے ان سے کہا کہ مگر میری بھی یہی تمنا ہے کہ میں آپ کے جنازہ کی نماز میں شرکت کروں۔ ناز صاحب نے یہ سن کر میری پیٹھ پر ایک گھونسہ جڑا اور کہا ''تم نے یہاں بھی اپنے فائدے کی بات سوچ ہی لی۔ مگر میں آمین کہتا ہوں''۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ میں اپنی تمنا اور ناز صاحب کی تائیدی آمین کو بھول گیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ بھی 1992 میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور میں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ پہلے حج کے لیے گیا۔ مگر ہم دونوں کو ایک دوسرے کے روحانی سفر کا علم نہیں تھا۔ جب 21 مئی 1992 کو مسجد الحرام میں ظہر کی نماز کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کر کے میں باب المدینہ سے باہر نکلا تو مسلم لیگ کے لیڈر سلیمان سیٹھ سے ملاقات ہوگئی جو سرکاری وفد میں آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ناز انصاری بھی شاہ فہد کی دعوت پر تشریف لائے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد قدرتی طور پر ناز صاحب کی تمنا بھی یاد آئی اور اپنی تمنا بھی۔ جی چاہا کہ ان سے ملاقات کروں۔ مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ بعد میں 20 جون کو مسجد نبویؐ میں ایک حاجی سے معلوم ہوا کہ 10 جون کو عرفات کے میدان میں دہلی کے ایک ایڈیٹر کا انتقال ہوگیا۔ قیام عرفات کے دوران ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھی، دل کا دورہ پڑا، کلمہ پڑھا اور احرام باندھے ہوئے چل بسے۔ اس پر نہ جانے کیوں دل نے کہا کہ کہیں ناز صاحب کی آخری تمنا پوری تو نہیں ہوگئی اور قیام گاہ پر واپس آنے کے بعد معلوم ہوا کہ عرفات میں جس ہندوستانی حاجی کے انتقال کی خبر گشت کر رہی تھی وہ ناز انصاری ہی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میں بھی نماز جنازہ میں شریک تھا کیونکہ مکہ میں قیام کے دوران میں نے مسجد الحرام میں جماعتوں کی ہر نماز پڑھی تھی اور چونکہ وہاں ہر فرض نماز کے بعد ایام حج میں فوت ہونے والے حاجیوں کی نماز جنازہ بھی ہوتی تھی جس میں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ اس لیے ناز صاحب کی نماز جنازہ میں میری شرکت ضرور ہوئی ہوگی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی نماز جنازہ عرفات میں ہوئی تھی اور تدفین مکہ مکرمہ میں۔ ارض مقدس کی خاک میں سہارنپور کی یہ خاک کچھ اس انداز سے ملی کہ ان کی موت پر نہ پورے غم کا اظہار کیا جاسکتا ہے نہ پوری خوشی کا۔

ناز انصاری کی تصنیفات میں سیاہ پوش خاتون، ابن آدم کا سفرنامہ، مرحوم محبوبہ، خونی

نیکلس، قصہ پانچویں درویش کا، ایک رات کا مہمان، اسرائیل ایک سامراجی خنجر، مسجد اقصیٰ، جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، اردو صحافت، مسلمان خاوند اور مسلمان بیوی، جادو کی بندوق، پری زاد پرندہ، میاں جی کی بکری اور اس کے علاوہ بچوں کی کئی کتابیں قابل ذکر ہیں۔

◆◆◆

نور جہاں ثروت

دہلی میں اردو صحافت کی خاتون اوّل کہی جانے والی نور جہاں ثروت کی پیدائش 28 نومبر 1949 کو دہلی میں ہوئی اور ان کا انتقال 17 اپریل 2010 کو دہلی میں ہوا۔ ان کی خالہ اولاد سے محروم تھیں لہٰذا ان کی ماں نے اپنی بہن کی جھولی میں انھیں ڈال دیا۔ 1951 میں خالہ پاکستان چلی گئیں اور نور جہاں اپنی نانی کے سایے میں پلنے لگیں۔ چونکہ عسرت و تنگ دستی کا دور تھا اس لیے بلبلی خانہ کے سرکاری اسکول سے تعلیم شروع کی۔ ذہین تھیں، اچھے نمبر لاتی تھیں اور ہر کلاس میں اوّل آتی تھیں۔ دسویں میں فرسٹ ڈویژن سے پاس کرنے کے بعد ان کا رجحان فارسی ادبیات کی جانب ہوا لیکن جلد ہی اس سے رشتہ منقطع ہوگیا۔ رفتہ رفتہ وہ شاعری کرنے لگیں۔ بی اے کرنے کے بعد ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور وہ کانگریس پارٹی کے دفتر 24 اکبر روڈ میں اردو شعبے سے وابستہ ہوگئیں۔ ذہن شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت کی طرف بھی مائل تھا۔

نور جہاں ثروت نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1970 میں سبھدرا جوشی کے مشہور اردو رسالے سیکولر ڈیموکریسی سے کیا۔ جہاں ڈاکٹر خلیق انجم ادارت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ اس سے تین سال تک وابستہ رہیں۔ پھر حیات اللہ انصاری کے ہفت روزہ اخبار "سب ساتھ" میں ملازم ہوگئیں، اسی دوران انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کرلیا۔ 1980 میں جب دہلی سے روزنامہ قومی آواز نکلا تو وہ اس سے وابستہ ہوگئیں۔ وہ ہفت روزہ قومی آواز کی ایڈیٹر اور روزنامہ قومی آواز کے دہلی ایڈیشن کی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہیں۔ 1987 میں جب دہلی میں انقلاب بمبئی جاری ہوا تو وہ اس میں چلی گئیں اور تا دم آخر ریزیڈنٹ ایڈیٹر کے عہدے پر فائز رہیں۔

صحافتی اور ادبی سفر میں انھوں نے اردو ادب، ثقافت اور شاعری کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ بطور شاعرہ انھوں نے دنیائے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان، سعودی عرب، عراق، متحدہ عرب امارات وغیرہ کے مشاعروں میں لاکھوں سامعین ان کا خوبصورت کلام سن چکے ہیں۔ اردو دنیا کے اخبارات وجرائد میں ان کی منظوم اور نثری تخلیقات مسلسل شائع ہو کر ادبی دستاویز بن چکی ہیں۔ ان کی شاعری اور ادبی صحافتی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقتدر ناقد پروفیسر شارب ردولوی کہتے ہیں:

"مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں، جب نور جہاں ثروت دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کر رہی تھیں۔ ایک سنجیدہ پڑھنے میں تیز، مؤدب لیکن شوخ آنکھوں والی لڑکی۔ اور آج وہی لڑکی زندگی کی تمازتوں میں تپی ہوئی اردو کی بے باک صحافی، قومی آواز دہلی اور انقلاب ممبئی کی ریزیڈنٹ ایڈیٹر، ریڈیو اور ٹی وی کی براڈ کاسٹر اور اردو کی ایک منفرد شاعرہ کی شکل میں ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ طبیعت میں سنجیدگی، شخصیت میں وقار کچھ اور بڑھ گیا ہے اور نگاہوں میں گہرائی اور دروں بینی پیدا ہو گئی ہے۔ نور جہاں ثروت اردو کی ایک اچھی اور مقبول شاعرہ ہیں۔ اردو میں اور خاص طور پر ہندوستان میں شاعرہ کا تصور بڑا عجیب ہے۔ روایتی قسم کے اشعار، مترنم آواز، نجی کیفیتوں سے عاری شاعری۔ لیکن نور جہاں ثروت اس سے بالکل مختلف ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے زندگی کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی پرتو میں جمی میل اور ظاہری سفید پوشی سے وہ جتنا واقف ہیں، کم لوگ واقف ہوں گے۔ زندگی کے ان مشاہدات نے ان کی شاعری میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور کرب پیدا کر دیا ہے:

خوشی کی محفل نہ راس آئی، ہزار چاہا کہ مسکرائیں
تپش سے غم کی جھلس گئے ہیں شگفتگی کے گلاب سارے
ہم نے وفا نبھائی، بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی بل پہ زندہ رہے، عمر کٹ گئی

'اپنے ہی بل' پر زندہ رہنے والی نور جہاں ثروت نے زندگی کے نشیب وفراز کو دور کھڑے ہو کر نہیں دیکھا ہے بلکہ اس کے تھپیڑوں میں اتر کر جو محسوس کیا، اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ان کا اپنا لب ولہجہ ہے۔ جذبات اور کیفیتوں کے بیان میں ایسی تاثیر ہے جس کا اثر تادیر قائم رہتا ہے۔ نظموں میں 'شہر ادراک' 'بے چہرہ خیال' 'نیا تجربہ'

'تنہائیوں کی انا' اور دوسری نظمیں ان کی فکر، گہری سوچ، انسانیت کے درد اور ان کے تجربے کی بڑی اچھی تصویریں ہیں۔''

نور جہاں ثروت کا شعری مجموعہ 'بے نام شجر' 1995 میں شائع ہوا تھا۔ وہ ایک معتبر اردو صحافی، قادرالکلام شاعرہ اور صاحب طرز قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ دہلوی تہذیب کی علمبردار ایک شگفتہ مزاج، ملنسار اور دلنواز شخصیت تھیں۔ مردوں میں خواجہ حسن ثانی نظامی اور گلزار دہلوی اور خواتین میں مرحومہ بیگم حمیدہ سلطان کے بعد دہلوی تہذیب، روایات، معاشرت اور زبان ومحاورات کی وہ سب سے بڑی جانکار تھیں۔ دہلی کے ادبی اور سماجی حلقوں میں انھیں بے حد احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ 93-1991 اور 03-2001 میں دو بار اردو اکادمی، دہلی کی رکن رہ چکی تھیں جہاں ثروت نے اپنی زندگی میں جو بھی حاصل کیا اپنی ہمت اور صلاحیت کے بل پر۔ ان کے مزاج میں، گفتگو میں، رکھ رکھاؤ سے خود اعتمادی اور اولوالعزمی مترشح تھی۔ انھیں قریب سے جاننے والوں کو انھیں دیکھ کر زندگی سے نبرد آزمائی کا حوصلہ ملتا تھا۔ زندگی کے سفر میں انھیں جو تجربات ہوئے اور ان کے نازک شاعرانہ احساس کو جن عوامل نے متاثر کیا اس کی کھنک ان کی شاعری میں واضح ہو کر سنائی دیتی ہے۔

انھیں متعدد ایوارڈ بھی حاصل ہوئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

لالہ جگت نارائن ایوارڈ برائے صحافت 1985، راجدھانی سوتنتر پتر ایوارڈ 1986 نشان اردو (برائے ادبی خدمات) 1989، نئی آواز ایوارڈ (برائے صحافت) 1994، میر تقی میر ایوارڈ (برائے شاعری) 1995، اردو اکادمی، دہلی کا انعام (برائے بے نام شجر) 1995، انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف ایجوکیشن فار ورلڈ پیس ایوارڈ (برائے صحافت) 1999، قومی تحفظ و بیداری ایوارڈ (ایشین اکیڈمی آف فلم اینڈ ٹیلی ویژن) 2000 اور میڈیا انٹرنیشنل ایوارڈ 2002۔

روز نامہ انقلاب نئی دہلی کے بند ہو جانے کے بعد نور جہاں ثروت کا ساتھ دینے والوں میں عالم نقوی اور رضوان احمد صدیقی تھے۔ عالم نقوی کو تو بمبئی انقلاب کا نیوز ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا اور رضوان احمد صدیقی اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے بمبئی نہیں جا سکے۔ اور وہ اپنے باقی دن گھر ہی پر بتانے پر مجبور رہے لیکن نور جہاں ثروت ان کی مزاج پرسی اور ان کی مالی معاونت ذاتی طور پر آخری دم تک کرتی رہیں۔

نور جہاں ثروت چونکہ انتہائی ذہین وفطین خاتون تھیں اس لیے انھوں نے جس میدان میں

بھی قدم رکھا تیزی سے کامیابیوں کی منازل طے کیں۔ وہ اخباری اداروں کے علاوہ ریڈیو، ٹی وی پر براڈ کاسٹنگ کے فرائض بھی انجام دیتی رہیں اور انھوں نے شعروادب وصحافت کے وسیع میدانوں میں تادیر قائم رہنے والی بہترین کارکردگی کی چھاپ بھی چھوڑی۔ ملک وبیرون ملک میں پھیلی متعدد ادبی وصحافتی تنظیموں کی طرف سے درجنوں ایوارڈ انھیں حاصل ہوئے اور ملک وبیرون ملک اپنے دوروں کے دوران ملک کی بھرپور نمائندگی بھی کی۔

نورجہاں ثروت کے بہت سارے اوصاف میں ایک وصف ایسا بھی تھا اور جس کا ہر شخص معترف بھی ہے کہ وہ نہ صرف معیاری زبان وبیان پر عبور رکھتی تھیں بلکہ زبردست جمالیاتی ذوق اور تخلیقی ذہن بھی رکھتی تھیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی صحافیانہ تحریروں، نظموں اور غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی واضح دلیل ان کا شعری مجموعۂ کلام 'بے نام شجر' ہے۔ ان کے احساسات میں زندگی ان کی فہم وفراست میں تیزی وسرگرمی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے ہم عصروں میں حسد وجلن امربیل کی طرح چڑھتی اور اترتی رہتی تھی۔ لیکن وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنی تہذیبی روایات پر ہی قائم رہیں۔ وہ جب بھی کسی سے ملیں بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ بڑوں کا احترام، بچوں سے شفقت ان کی خاص پہچان اور وتیرہ تھا۔ انھوں نے تنہائی کی زندگی گزاری لیکن اشیائے ضروریہ اور رہنے سہنے کے سامان سے اپنے گھر کو بھر رکھا تھا تاکہ وقت ضرورت کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ گھر کا انتظام ہو یا دفتر کا وہ بہترین انتظام کار تھیں، کہیں بھی اور کسی بھی طرح کی بدنظمی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں 'قومی آواز' کو مقبول اور معیاری بنانے میں انھوں نے انتہائی اہم رول ادا کیا تھا۔ عشرت علی صدیقی کی سبکدوشی کے بعد سینیارٹی اور صلاحیت کے اعتبار سے ان کا حق تھا کہ انھیں اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس کے لیے جس مصلحت اور جی حضوری والی ذہنیت کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی۔

نورجہاں ثروت اسم بامسمّٰی بھی تھیں۔ اس لیے اگر وہ شعروادب میں کوہ نور تھیں تو آج کی بھاگتی دوڑتی مشینی زندگی سے جڑی صحافت کی ثروت مند مردآہن بھی تھیں۔ وہ بڑی جری اور دلیر خاتون تھیں۔ انھوں نے صحافت کی خاردار وادی میں مردانہ وار زندگی گزار کر یہ ثابت کردیا کہ صنف نازک کہی جانے والی عورت بھی جرأت وہمت سے کام لے تو بہت کچھ بن سکتی ہے اور کرسکتی ہے۔ وہ روشن خیال بھی تھیں اور مذہب کی بنیادی نصوص کی قائل وقدردان بھی تھیں۔ البتہ

مذہب پر چڑھے ہوئے روایتوں کے خول کا وہ مذاق اڑاتی تھیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ انھیں مذہب بیزار سمجھتے تھے۔ جس دور میں انھوں نے آنکھیں کھولیں وہ بہت ہی پر آشوب دور تھا اس دور میں کسی مسلم خاتون کا اتنا بے باک ہونا معاشرے میں ہلچل پیدا کر دینے کے ہی مترادف تھا۔ اس لیے انھیں مکتب سے لے کر اعلیٰ درس گاہوں تک اور گھر سے لے کر کارگاہوں تک مشکلات اور سخت پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی وہ بڑی بے جگری اور ہمت و استقلال سے اپنے موقف پر جمی رہیں اور اپنے طے کردہ راستے پر چل کر اپنوں اور غیروں سبھی کے لیے مینارۂ نور بنی رہیں۔

◆◆◆

نازش انصاری

نازش انصاری 1943 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور 12 جون 2003 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے اجداد دہلی کے تھے۔ فراش خانہ میں ان کا گھر تھا۔ ان کے والد کی سسرال علی گڑھ میں تھی۔ تقسیم ہند سے قبل وہ وہیں چلے گئے اور وہاں تالا سازی کا کارخانہ لگالیا۔ وہیں نازش انصاری کی پیدائش ہوئی۔ ان کا خاندانی نام فتح محمد تھا۔ انھوں نے اپنا قلمی نام نازش انصاری رکھا اور وہی ان کی شناخت بن گیا۔

نازش انصاری نے پوری زندگی جدوجہد کی۔ فراغت کے دن انھیں نصیب نہیں ہوئے۔ ہاں ان کی زندگی ہنگامہ خیز رہی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی لڑائی جب شروع ہوئی تو وہ کم عمر تھے۔ انھوں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ اکثر یہ واقعہ بتایا کرتے تھے کہ اس وقت وہ بہت چھوٹے اور دبلے پتلے تھے۔ پولیس نے بہت سے طلبا کو گرفتار کرلیا۔ ان کے مطابق انھیں بھی ہتھکڑی لگائی گئی لیکن چونکہ ان کی کلائی بہت پتلی تھی اس لیے انھوں نے ہتھکڑی نکال کر پولیس والے کو دے دی۔

انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے صحافت شروع کردی تھی۔ انھوں نے وہاں سے کئی اخبار نکالے۔ جن میں نئے زاویے، انحراف اور دشمن قابل ذکر ہیں۔ وہ یہ اخبار نکالتے، خود ہی چھپواتے اور پھر سائیکل پر لے کر بیچنے بھی نکل جاتے۔ ایمرجنسی کے دوران وہ دہلی آگئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے بیسویں صدی، محل، روبی، تیز گام، فلمی ستارے، گلفام اور جرائم میں کام کیا۔ انھوں نے اپنے دو ڈائجسٹ ''آتش گل'' اور ''خواب محل'' نکالے تھے لیکن وہ زیادہ دن نہیں چل سکے۔ جرائم ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کا رسالہ تھا جو اس وقت خلیج میں رہ رہے تھے۔ یہ

رسالہ بے حد کامیاب رہا۔ جرائم کے موضوع پر یوں تو ان دنوں بہت رسالے نکل رہے تھے لیکن ماہنامہ ''جرائم'' کا کسی سے مقابلہ نہیں تھا۔ اس وقت نازش انصاری ایک کامیاب صحافی کے طور پر ابھرے اور ان کی بے انتہا محنت اور جدوجہد نے جرائم کو کامیابی کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ لیکن اسی دوران جرائم کے مالک سے ان کے کچھ اختلافات ہو گئے اور انھوں نے جرائم چھوڑ دیا۔ اسی دوران وہ ایک ڈائجسٹ کی پلاننگ کر رہے تھے جو ''آتش گل'' کے نام سے نکلا۔ وہ ایک مقبول اور معیاری ڈائجسٹ تھا جو چھ سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے آٹھ دس شمارے نکلے ہوں گے پھر سرمایے کی کمی کی وجہ سے وہ بند ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ دنیا کا سب سے ضخیم ڈائجسٹ ہے۔ پھر انھوں نے ''زندہ کہانیاں'' نامی رسالہ نکالا۔ وہ بھی چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔

اس سے قبل سلطان اختر اور فاروق ارگلی نے مشترکہ طور پر ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام ''قانونی دنیا'' تھا نازش انصاری نے اس میں بھی کام کیا تھا۔ نازش انصاری ماہنامہ رسالوں اور ڈائجسٹ کی تزئین کاری میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تزئین کاری کا بھی ان پرچوں کی مقبولیت میں بڑا ہاتھ تھا۔ آخری دنوں میں قاری محمد میاں مظہری کے اخبار ''سیکولر قیادت'' میں کام کر رہے تھے لیکن اپنے رسالے کے بارے میں مسلسل سوچتے بھی رہتے تھے۔ اس وقت راقم الحروف اخبار نو میں پارٹ ٹائم کام کر رہا تھا۔ اس کا دفتر پٹودی ہاؤس میں ہے اور تھوڑا سا آگے چل کر خواص پورا میں سیکولر قیادت کا دفتر تھا۔ وہ آتے جاتے اخبار نو میں آجاتے اور اپنے مخصوص انداز میں کہتے کہ بھائی ہم تو چائے پینے آئے ہیں۔

نازش انصاری سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب اردو کے کرائم میگزینوں کی دنیا میں 'جرائم' کا سکہ چلتا تھا۔ نازش انصاری اس کے ایڈیٹر تھے۔ دہلی آنے کے پہلے سے ہی ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ اس وقت 'جرائم' اور نازش انصاری لازم وملزوم تھے۔ 'جرائم' کا مطلب نازش انصاری اور نازش انصاری کا مطلب 'جرائم' ہوا کرتا تھا۔ رنجیت نگر میں واقع جرائم کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ میگزین کے ٹائٹل کے لیے ٹی پی کا انتخاب کر رہے تھے۔ کیا جلوے تھے اس وقت نازش انصاری کے۔ 'جرائم' کے دفتر میں کافی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ قریب ہی ان کی رہائش تھی۔ میں 'جرائم' کے دفتر آنے جانے لگا اور نو سکھیوں کی مانند ہندی کہانیاں لا کر ان کے ترجمے کرنے لگا۔ صرف ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں نمک مرچ لگا کر اردو کے قالب میں ڈھالنا ہوتا تھا۔ نازش انصاری اس وقت ایک کہانی کے پچاس روپے دیتے تھے جو ان دنوں ہم جیسے

ناآموز لوگوں کے لیے ایک خطیر رقم تھی، لیکن اس سے بھی قیمتی وہ مشورے ہوتے تھے جو ترجمہ نگاری کے تعلق سے وہ دیا کرتے تھے۔

وہ ہمیشہ اس ادھیڑ بن میں رہتے کہ کس طرح اپنا پرچہ شروع کریں۔ اس کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے کئی لاٹریاں اس مقصد سے ڈال رکھی تھیں کہ ان کے پیسوں سے وہ رسالہ جاری کریں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کئی اداروں میں کام بھی اسی مقصد سے کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ پیسے بچا کر اپنا رسالہ جاری کریں۔ انھوں نے کیا بھی۔ 'خواب محل' کی شکل میں اپنے خواب کو ڈھالا۔ ایک خوبصورت پرچہ شروع کیا۔ ہفت روزہ اخبارات کے سائز میں نیم ادبی، نیم سیاسی اور نیم فلمی۔ مگر شاید دو یا تین شمارے ہی نکل سکے۔ سرمایے کی قلت یہاں بھی آڑے آئی۔ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کر کے بڑا رسالہ نکالنا آسان کام نہیں۔ وہ زندگی بھر یہ خواب دیکھتے رہے کہ اردو میں ایک ایسا رسالہ نکالیں گے جو پوری دنیا میں دھوم مچادے گا۔ لیکن یہ خواب ان کے دل ہی میں رہ گیا۔

وہ دل کے مریض ہو گئے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی اور غالباً اس مرض کی وجہ ان کی کسمپرسی اور بے چارگی تھی۔ وہ متعدد لوگوں کے مقروض ہو گئے تھے۔ قرض خواہوں کو کسی طرح مناتے تھے۔ مجھ سے کئی بار انھوں نے کہا کہ ''میں انشاء اللہ جلد ہی اپنا ایک ایسا رسالہ شروع کروں گا جو اردو دنیا میں دھوم مچادے گا۔ سیکولر قیادت یا دیگر دفاتر میں ملازمت میری منزل نہیں ہے۔ میں یہ ملازمتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ رک کر تھوڑا دم لے سکوں اور آگے بڑھنے کے اسباب مہیا کر سکوں''۔ گھر چلانے کی فکر اور قرض خواہوں سے دامن چھڑانے کی چنتا نے بھی ان کے مرض میں اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عالمی سطح کے رسالے کے اِجرا کا خواب۔ ممکن ہے کہ یہ خواب باقی تمام تفکرات پر بھاری پڑا ہو۔ خواب اور تفکرات نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا اور انھیں ہومیو پیتھ کے ڈاکٹر محمد قاسم (نظام الدین) کا مستقل مریض بنا دیا تھا۔ بتاتے ہیں کہ جس روز ان کا انتقال ہوا اس سے ایک روز قبل بھی وہ سیکولر قیادت کے دفتر نہیں گئے تھے۔ اگلے روز ان کے دل میں درد اٹھا جو شدید ہوتا چلا گیا۔ ان کے برادر نسبتی ان کو ایک اسکوٹر میں بٹھا کر ڈاکٹر محمد قاسم کے مطب بستی حضرت نظام الدین لے جا رہے تھے، لیکن ملک الموت نے اتنی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ وہ مطب تک پہنچ پاتے۔ اس نے راستے ہی میں اپنا کام کر دیا اور پھر وہی اسکوٹر والا ان کو واپس رنجیت نگر لے گیا۔ اسکوٹر والے کو بھی کیا پتہ تھا کہ وہ واقعی ایک 'زندہ لاش'

لے جارہا ہے۔ وہ جیتا جاگتا انسان تو لے جارہا ہے، مگر تھوڑی دیر میں اسے اس جیتے جاگتے انسان کو لاش کی شکل میں واپس لانا ہے۔

نازش انصاری نے اپنا آخری وقت انتہائی کسمپرسی اور تنگ دستی میں گزارا لیکن خود داری ایسی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ صرف ان کے ساتھ کام کرنے والے چند لوگ ہی اس سے واقف تھے کہ وہ کن مراحل سے گزر رہے ہیں۔ لیکن مجال کیا کہ کوئی ان کے چہرے پر اندرونی کرب کی تحریریں پڑھ پاتا۔ وہ شخص تو اپنے قلم سے نکلی ہوئی شگفتہ تحریریں لوگوں کو پڑھوانے کا عادی تھا۔ وہ اپنا اندرونی کرب کسی کو کیسے پڑھنے دیتا۔ وہ جب بھی ملتے قہقہہ زار گفتگو کرتے اور اپنے مخصوص انداز میں واقعات سنا کر کبھی خوش کرتے تو کبھی بور۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم لوگ جو کہ ہر دوسرے تیسرے دن ان سے ملتے تھے، ان کی کیفیت کا اندازہ لگا پاتے۔ اب کچھ باتیں رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہیں تو دل کہہ رہا ہے کہ کاش یہ باتیں پہلے معلوم ہوتیں تو ممکن ہے کہ ہم لوگ کچھ کر پاتے۔

وہ اردو کے بہت بڑے شیدائی تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر بچوں میں اردو کے تعلق سے دلچسپی پیدا کر دی جائے تو اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بچوں کو اردو کی طرف کامکس کے ذریعے مائل کیا جا سکتا ہے۔ اگر انگریزی اور ہندی سے اچھے کامکس اردو میں پیش کیے جائیں تو ان کے قاری یعنی بچے بڑے ہو کر دوسرے سیاسی، ادبی، نیم ادبی اور اردو کے اخبار و رسائل کے قاری بن سکتے ہیں۔ وہ زندگی بھر ایک اچھے رسالے کی اشاعت اور اردو کے فروغ کا خواب دیکھتے رہے اور اسی خواب کے ساتھ وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔

◆◆◆

سردار ہر بھجن سنگھ تھاپر

سردار ہر بھجن سنگھ تھاپر 13 مارچ 1920 کو لاہور میں پیدا ہوئے اور 7 جون 2006 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد سردار جگت سنگھ نے 1905 میں پاکستان کے پنڈی کھیپ سے ایک ماہنامہ رسالہ ''رہنمائے تعلیم آف لاہور'' جاری کیا تھا۔ 1962 میں ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سردار ہر بھجن سنگھ تھاپر اسے نکالتے رہے۔ انھوں نے اس رسالہ کی عمر ایک صدی تک پہنچادی۔ وہ آخر وقت تک اس کے مدیر رہے۔ یہ رسالہ 1947 تک لاہور سے نکلتا رہا۔ تقسیم وطن کے بعد سردار جگت سنگھ اپنے بیٹے سردار ہر بھجن سنگھ تھاپر کے ساتھ دہلی آگئے اور یہاں سے انھوں نے اسے یعنی 1947 سے نکالنا شروع کیا تھا۔

رسالہ رہنمائے تعلیم نے متعدد نمبر نکالے جن میں حضرت نوح ناروی نمبر، سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ نمبر، پنڈت جواہر لعل نہرو نمبر، مبشر علی صدیقی نمبر، حضرت بیدل بیکانیری نمبر، کالی داس گپتا رضا نمبر، جوبلی نمبر، گاندھی نمبر اور انسانیت نمبر قابل ذکر ہیں۔ رسالے کی اشاعت کو سو سال پورے ہونے پر ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ سردار ہر بھجن سنگھ تھاپر کو ان کی علمی، ادبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں متعدد ایوارڈ تفویض ہوئے تھے۔ تھاپر نے اس کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ'' رہنمائے تعلیم نہ صرف پورے برصغیر بلکہ پوری دنیا میں کسی بھی زبان کا وہ واحد رسالہ ہے جو اپنی اشاعت کے سو سال پورے کرتے ہوئے صدی نمبر شائع کر رہا ہے''۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اپنی اشاعت کے سو سال مکمل کرنے والے رسالہ کا نہ کوئی باضابطہ دفتر تھا نہ اسٹاف۔ تھاپر صاحب اپنی رہائش گاہ سے اسے شائع کرتے رہے ہیں اور تسخیر فہمی دہلی سے دور دوسرے شہر سے اس کی ادارت فرماتے رہے اور قمر سنبھلی وقت نکال کر مضامین کے انتخاب پر نظر

ڈالتے اوران کی نوک پلک سنوارتے رہے ہیں۔

عبدالمجید کھوکھر لائبریری گوجراں والا پاکستان کے ڈائرکٹر ضیاء اللہ کھوکھر اپنی کتاب ''بچوں کی صحافت کے سو سال'' میں لکھتے ہیں کہ رہنمائے تعلیم کا آغاز 1905 میں پنڈی کھیپ سے ہوا۔ سینٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور میں مدرس کی حیثیت سے ملازم ماسٹر جگت سنگھ نے اس کا پہلا شمارہ انتہائی افلاس و بے سروسامانی اور کسمپرسی کی حالت میں شائع کیا۔ وسائل کی بے حد کمی تھی اور تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار تھی۔ ماسٹر صاحب تمام مضامین خود لکھتے اور اسکول سے فراغت کے بعد ان کا تمام وقت رسالے کی اشاعت اور فروخت کی نذر ہو جاتا۔

رسالہ رہنمائے تعلیم کی ایک شاندار روایت رہی ہے جس کا اعتراف اردو کے انتہائی جید قلمکاروں، شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے۔ جن میں ڈاکٹر محمد اقبال، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ناخدائے سخن نوح ناروی، جوش ملسیانی، ملا رموزی، عبدالرؤف عشرت اور بیشتر وزرا اور سیاستداں نیز انگریزی روزنامہ مسلم آؤٹ لک لاہور، زمانہ کانپور، زمیندار لاہور، معارف، خواجہ حسن نظامی اور دیگر بے شمار ادبا شعرا علما و فضلا شامل ہیں۔ اس خصوصی شمارے میں ماسٹر جگت سنگھ کی تصویر کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، جوش ملسیانی، ابر احسنی گنوری، کالی داس گپتا رضا، لالہ رتن پنڈوری، مہیندر سنگھ بیدی سحر، احتشام اختر، ایس ڈی شوق جالندھری، نرمل سنگھ نرمل اور محمد نعمان سمیت متعدد ایسے لوگوں کی بھی تصویریں شامل اشاعت ہیں جو رسالہ کے خادم رہے ہیں۔ جنوری، فروری 1931 میں رسالہ کا جوبلی نمبر شائع ہوا تھا جس پر انتہائی مؤقر قلمکاروں کی آرا بھی اس میں شائع کی گئی ہیں۔

مضامین کا انتخاب اس انداز سے کیا گیا ہے کہ قارئین کو اس کی پوری تاریخ کا علم ہو جائے مگر اس کے لیے اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے گریز کیا گیا ہے۔ البتہ رہنمائے تعلیم آف لاہور دہلی کی پرانی فائلیں کھنگالی گئی ہیں اور ان میں سے مضامین کا انتخاب کر کے صدی نمبر کو مؤقر اور محترم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن لوگوں کی نگارشات اور مضامین شامل اشاعت ہیں ان میں ماسٹر جگت سنگھ، پنڈت دتا تریا کیفی، نوح ناروی، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، عرش ملسیانی، گوپی ناتھ امن، شباب للت، طالب دہلوی، جگن ناتھ آزاد، نذیر فتح پوری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، رام پرکاش کپور، دل شاہجہاں پوری، طالب کاشمیری، ابر احسنی گنوری، کالی داس گپتا رضا، قاضی مشتاق احمد، کوثر چاند پوری اور بیکل اتساہی قابل ذکر ہیں۔ رام پرکاش کپور کا مضمون '' کیا اردو ہندوستان میں

صرف مسلمانوں کی زبان ہے'' ماسٹر جگت سنگھ کا مضمون '' اردو کی اہمیت، ضرورت اور اس کا مستقبل''، نظیر اکبر آبادی ایک بازیافت (محمد اختر) مدرسہ (تبسم)، ہمارے بچوں کی تعلیم کیسی ہو (صوفی غلام پروفیسر بی شیخ علی)، علامہ اقبال حصار نقد سے باہر (ظہیر غازی پوری)، اقبال اور پیکر تراشی (ڈاکٹر شریف احمد قریشی، رامپور)، پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے تحریری مکالمہ (نذیر فتحپوری) وغیرہ قابل مطالعہ مضامین ہیں۔ ادبی و تنقیدی مضامین، اصلاحی مضامین اور مسائل کو اٹھانے والے مضامین کی تعداد خاصی ہے، اس کے علاوہ اس کا شعری حصہ بھی بہت مؤقر ہے اور نامی گرامی شعرا اس مجلس میں نظر آتے ہیں۔ آخر میں افسانے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ البتہ موجودہ دور کے قلمکاروں کی تعداد کم ہے۔ ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس میں مئی 1971 سے لے کر ستمبر 1981 تک کے بعض طرحی مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

(تھاپر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں نے رسالہ بند کر دیا ہے۔ محمد نعمان نے جو کہ اس رسالہ میں کتابت کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں بھی انجام دیتے رہے ہیں، اسے اپنے خرچ اور اپنی ذمہ داری پر نکالنے کی خواہش ظاہر کی جسے تھاپر صاحب کے بیٹوں نے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد نعمان صاحب نے اس سے ملتا جلتا نام '' رہنمائے تعلیم جدید'' لے لیا اور اب کئی برسوں سے اسے نکال رہے ہیں۔)

◆◆◆

اردو صحافت

اردو اکادمی، دہلی کے ''اردو صحافت'' سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو صحافت پر یہ ایک جامع اور کارآمد کتاب ہے، جس کی مدد سے ملک کی کئی یونیورسٹیاں صحافت اور ماس کمیونکیشن کی تعلیم دے رہی ہیں۔ اردو کا مستقبل اور صحافت اخبارات و جرائد سے جڑا ہوا ہے۔ اس کتاب میں صحافت کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کا مکمل جائزہ پڑھنے کو مل سکتا ہے۔

مرتب: انور علی دہلوی

صفحات: ۳۳۲، (پانچواں ایڈیشن)

قیمت: ۱۳۰ روپے

اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ

عوامی ذرائع ابلاغ پر انسان کی روزمرہ زندگی کا انحصار ہو گیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین سے آپ کو پتہ چلے گا کہ ذرائع ابلاغ سے اردو کا فروغ کیسے اور کس طرح ہوا اور اردو سے ذرائع ابلاغ کو کیا فائدے ہوئے، ان کا رشتہ آپس میں کتنا مستحکم ہے۔ کتاب میں شامل مضامین میں اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے ساتھ اردو کے رشتوں کا تذکرہ تکنیکی اور علمی طور پر کیا گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ابتدا اور ارتقاء سے لے کر ٹیلی ویژن تک سب کچھ اس کتاب میں شامل ہے۔

مرتبین: محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی

صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۷۵ روپے

اردو صحافت کا منظر نامہ

حالیہ برسوں میں اردو صحافت میں جو نمایاں تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں ان پر غور و خوض کرنے اور اس تبدیلی کو صحیح سمت و رفتار دینے کی جانب بحث و مباحثہ کرنے کے لیے اردو اکادمی، دہلی نے ایک سہ روزہ سمینار بہ عنوان ''اردو صحافت کا عصری منظر نامہ'' کا انعقاد کیا تھا۔ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کو فاضل مرتب نے کچھ ایسے مضامین بھی اس میں شامل کیے ہیں جو مذکورہ سمینار میں پیش نہیں کیے گئے تھے لیکن موضوع سے مطابقت رکھتے تھے تاکہ اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو۔ یہ کتاب اردو صحافت کی ترویج و ترقی میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگی اور صحافت کے میدان میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی معاون و مددگار ہوگی۔

مرتب: معصوم مرادآبادی

صفحات: ۲۶۰، قیمت: ۱۵۰ روپے

اردو صحافت کا ارتقاء

اردو صحافت نے ارتقاء کا عمل کن مراحل سے گزر کر پورا کیا ہے اور اس کے صحافیوں نے اپنی جفاکشی، محنت اور جدوجہد سے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش ثبت کیے ہیں یہ کتاب دراصل اسی کا ایک مبسوط خاکہ ہے جس میں دو صدیوں پر محیط اردو صحافت کے تاریخی، فنی اور تکنیکی ارتقاء کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف: معصوم مرادآبادی

صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰ روپے

اردو اکادمی، دہلی کے شائع کردہ کلاسیکی ادباء شعراء کے مونوگراف

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	صفحات	قیمت
1	میر ناصر علی دہلوی	پروفیسر ارتضیٰ کریم	120	30/-
2	مرزا محمد رفیع سودا	ڈاکٹر مظہر احمد	184	50/-
3	خواجہ میر اثر	ڈاکٹر مولا بخش	112	30/-
4	میر امّن	پروفیسر ابن کنول	152	40/-
5	قائم چاند پوری	ڈاکٹر خالد علوی	264	100/-
6	فائز دہلوی	ڈاکٹر کوثر مظہری	128	30/-
7	خواجہ الطاف حسین حالی	ڈاکٹر شہزاد انجم	156	45/-
8	شیخ ظہور الدین حاتم	پروفیسر عبد الحق	120	30/-
9	بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر نگار عظیم	120	30/-
10	مرزا غالب (مکتوب نگاری)	ڈاکٹر خالد اشرف	128	30/-
11	مرزا غالب (شخصیت اور شاعری)	پروفیسر ابو الکلام قاسمی	128	30/-
12	مومن خاں مومن	ڈاکٹر توقیر احمد خاں	120	30/-
13	شاہ نجم الدین مبارک آبرو	پروفیسر خالد محمود	128	30/-
14	محمد حسین آزاد	پروفیسر عتیق اللہ	180	50/-
15	خواجہ میر درد	قاضی عبد الرحمٰن ہاشمی	112	30/-
16	سر سید احمد خاں	پروفیسر افتخار عالم خاں	120	30/-
17	شیخ محمد ابراہیم ذوق	مخمور سعیدی	132	30/-
18	نذیر احمد	ڈاکٹر جمیل اختر	192	50/-
19	میر تقی میر	پروفیسر مظفر حنفی	168	50/-
20	علامہ راشد الخیری	ڈاکٹر نجیب اختر	168	50/-
21	مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی	ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی	168	50/-
22	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی	ڈاکٹر دیوان حنان	139	45/-
23	ڈاکٹر سید عابد حسین	ڈاکٹر خاور ہاشمی	230	120/-
24	حضرت وارث شاہ	رتن سنگھ	135	45/-
25	یگانہ چنگیزی	وسیم فرحت کارنجوی	112	30/-
26	مرزا جانجاناں مظہر	شمیم طارق	136	45/-
27	ظہیر دہلوی	مختار شمیم	136	45/-
28	کرشن چندر	نند کشور وکرم	160	50/-